

WWW.PAKSOCIETY.COM



طاہر جاوید مغل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

پیش لفظ

پس زنداں اس لڑکی کی کہانی ہے جو معاشرے اور حالات کے بے پناہ جبر کو جھیلی رہی اور پسپا ہوتی رہی۔ معاشرہ اور حالات اُسے پسپا کرتے رہے لیکن ایک جگہ جا کر وہ رک گئی۔ وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک عورت تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ایک مرد اُس سے اُس کی آدمی زندگی مانگ رہا تھا۔ اُدھا گھر آدمی دن، آدمی راتیں، آدمی راز و نیاز اور آدمی مسکراہٹیں۔ وہ دوسری عورت لانا چاہتا تھا۔ اور اپنی زندگی میں ہر لمحہ اُس کے سینے کے بعد یہی وہ مقام ہے جہاں عورت حراست کرتی ہے۔ اُسے گمراہ پڑتی ہے۔ خود رنج و غم نے بھی کی۔ وہ تڑپ مچلی لیکن بے بس کر دی گئی۔ اُس کے اندر بغاوت کی چنگاڑیاں چلنی لگیں۔ وہ چنگاڑیاں بھی جبر کے پاؤں کے مسل دی گئیں۔ لیکن کیا واقعی بغاوت کی چنگاڑیاں سلی اور بھائی جاسکتی ہیں؟ شاید نہیں۔ چنگاڑیاں بھیجی نہیں۔ بس اپنی جگہ اور شکل بدل لیتی ہیں۔ حجاب کی چنگاڑیوں نے بھی اپنی جگہ بدل لی اور اُس کے ”نظم خوار پاؤں“ کے سینے میں ٹھکانا کر لیا۔

ہادی اُس کی محبت میں گرفتار ہوا اور پھر ایک دن حجاب کے ظالم و کاہر شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھڑا ہو گیا۔ ہادی کی آنکھوں میں اپنی موت دیکھ کر حجاب کے شوہر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور حجاب اپنے زنداں سے آزاد ہو گئی، مگر وہ کتنی آزاد ہوئی اور کتنی اُس زنداں کے اندر رہی رہ گئی، اس کا اندازہ آپ کو کہانی پڑھ کر ہی ہوگا۔ اس کہانی میں چند بار ایک معروف انگریزی نظم کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس نظم میں ایک فرانسیسی جہاز ران جنگ کے دوران میں اپنے بارہ تیرہ سالہ بیٹے کو جہاز میں ایک مقام پر کھڑا ہونے کا حکم دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دوسرے حکم تک وہ اُسی جگہ کھڑا رہے گا۔ لڑکا اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں جان قربان کر دیتا ہے۔

پس زنداں کا مرکزی کردار حجاب بھی ایسی ہی بے مثال اطاعت مندی اور دلیری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اپنے باپ کے حکم پر وہ مصائب کے ہولناک مجنوروں میں مستحکم قدموں سے کھڑی رہتی ہے۔ یہی عورت کی شان ہے۔ اُس کی سبکی وہ غیر معمولی ہمت اور ایثار کی خوبی ہے جو اُسے کارخانہ حیات میں ایک بلند تر مرتبہ عطا کرتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے، دنیا کے بڑے بڑے ہوش کار۔ معاشرے کے فرعون اور مذہب کے بہرہ وچہ تمسکدار، عورت کے جذبہ ایثار اور روح کی توانائی کے آگے بالآخر بے بس ہوئے ہیں۔

طاہر جاوید مغل

ہادی فرین میں تھا۔ فرین ایک ایسی پڑی سے گزر رہی تھی جس کے دونوں جانب پانی تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک سہانی شام تھی اور ویش کا شہر تھا۔ وہ شہر جو پانی میں رہتا ہے اور تاریخ جس کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ یہ وہ بے مثال بہتی ہے جس کی خوبصورتی اور عورت دنیا بھر کے سیاحوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کشش کرتی ہے۔ ہادی بھی آج شام اس شہر ہفت رنگ میں اتر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک حسین رات تھی۔ پروگرام کے مطابق اسے تھوڑی دیر اپنے کیمپ میں آرام کرنا تھا۔ پھر چائے پینا تھی اور تازہ دم ہو کر ویش کے خوبصورت گلی کوچوں میں گم ہو جانا تھا۔ لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ اس رات میں اس کے لیے کیا چھپا ہے۔ یہ بظاہر ایک عام سی تفریحی شب اس کے لیے کتنی اہم ثابت ہونے والی ہے۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا۔

فرین ویش کے شاہکار اسٹیشن پر رکی۔ وہ اپنے سامان سمیت اُتر اور پیدل ہی بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ ایک مقامی شخص کے مطابق فرین اسٹینڈ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ویش شہر میں پانی کی سڑکیں تھیں، پانی کی گلیاں تھیں اور ان سارے آبی راستوں پر پانی کے کالی گاڑیاں یعنی چھوٹی بڑی کشتیاں اور بجرے وغیرہ رواں تھے۔ موسم میں تھوڑا سا جس محسوس ہوتا تھا لیکن یہ محسوس ہونا خوشگوار نہیں تھا۔ شام کی سست ہوا کے جھوکے اس جس کو قابل قبول بنا رہے تھے۔ اس جس کی وجہ یقیناً وہ پانی ہی تھا جو اس شہر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ روشنیاں جل اٹھی تھیں ویش کی عمارتوں میں چمکنے والی یہ روشنیاں ہر طرف سندری پانی میں اپنا عکس دے رہی تھیں۔

ہادی نے تھوڑا سا دور کرنا چاہی۔ وہ سر راہ واقع ایک جدید ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ یہاں اطالوی میوزک کی گونج تھی۔ تھمبا کو اور گھٹیل کی ٹو پچھلی ہوئی تھی اور کئی نوجوان اونچے اونچے اسٹولوں پر بیٹھے پاؤں تھکا رہے تھے ان میں چند نیم عریاں سیاح لڑکیاں بھی تھیں۔ ہادی نے اپنا سامان ایک طرف کونے میں ڈھیر کیا اور سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنے قدموں کے نیچے بالوں کو اس نے کانوں کے عقب میں اڑسا اور سگریٹ سلا کر کولڈ کافی کا آرڈر دیا۔

آرڈر لینے والی ایک خوش پوش ویٹرس تھی۔ پہلے ویٹرس نے اپنا ہولی پھر شہرہ انگلش میں بات کی۔ پتا نہیں آرڈر دینے میں کیا مڑ بڑ ہوئی کہ کچھ دیر بعد کولڈ کافی کے بجائے ٹیمپل کے گھبراہٹا گاس اس کے سامنے تھا۔ ایک

کے پیچھے لپکے لیکن ایک دوسرے بعد ہی ہانپتے ہوئے واپس آ گئے۔ وہ خبیث کلیوں کے جال میں کہیں گم ہو گیا تھا۔
بادی کی بائیں کلائی سے خون ٹپک رہا تھا۔ اٹھائی گہرے کو دیو پنے کے دوران میں یہ چوٹ اس کی کلائی پر لگی تھی۔ خاتون نے جو بانس اٹھائی گہرے کے راستے میں گرایا تھا وہ دراصل ایک طویل چھتری تھی جو سر راہ ایک ریسٹورنٹ سے باہر ایک میز پر تانی گئی تھی۔ بادی کو اسی چھتری کا کوئی راڈ وغیرہ لگا تھا۔

حاضر دماغی کا مظاہرہ کر کے اٹھائی گہرے کی راہ میں چھتری گرانے والی خاتون دراصل ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے جین اور شرٹ پہنی رکھی تھی۔ پاؤں میں جو کرتے ہال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بادی کو اندازہ ہو گیا وہ انڈین یا پاکستانی ہے۔

”بہت بہت شکریہ۔“ بادی نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ مدد نہ کرتیں تو میرا بیگ ملنا مشکل تھا۔“
حسب توقع اردو میں ہی جواب ملا۔ ”شکریہ تو آپ اس ریسٹورنٹ والوں کا ادا کریں جنہوں نے فٹ پاتھ پر یہ چھتری لگا رکھی تھی۔“ اس کا چہرہ تھمایا ہوا تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اچھی لگتی تھی۔ تب اس کی نگاہ بادی کی کلائی پر پڑی۔ بادی نے اپنے دوسرے ہاتھ سے کلائی کو تھام رکھا تھا۔

چوٹ اچھی خاصی لگی تھی لیکن صورت حال کے تناؤ کی وجہ سے بادی کو کچھ زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ”آپ دوسرے ہاتھ کی کھڑوت ہے۔ وہ سامنے کھلی کے سرے پر ایک میڈیکل سنور ہے۔ وہاں سے سینڈیج کا سامان مل جائے گا۔“

لڑکی بادی کے قریب آ کر مدد آواز میں بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اکثر اوقات ان رابرٹوں کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ وہ بدلے لینے پر تل جاتے ہیں۔ آپ یہاں سے نکل جائیں۔ کہیں کہیں جا کر اپنی وغیرہ کرا لیجیے گا۔“

”آپ کا مشورہ ٹھیک لگتا ہے۔ آپ پاکستانی ہیں؟“

”جی ہاں۔۔۔ اس لیے ٹیک مشورہ دے رہی ہوں۔ آپ کو۔۔۔ سامان اٹھانے میں دقت تو نہیں ہو رہی؟“
بادی نے ہاتھ سے اپنی زخمی کلائی تھام رکھی تھی۔ ظاہر ہے دقت تو ہونا تھی۔ وہ چند سینکڑ سو جتنی رتی بھر

اس نے جھک کر ہادی کا ایک بیگ اٹھایا اور بولی۔ ”چلیں آئیں۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“

شکریہ کے الفاظ بادی کے منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ ڈرگاکا ہوا سائیکل کے ساتھ چل دیا۔ لوگ یہاں وہاں گھڑے قماشانی کی حیثیت سے آٹھن دکھ رہے تھے لڑکی کے انداز میں اعتماد اور وقار تھا۔ بادی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس کی طرح یہاں نووارد نہیں ہے۔ شاید وہیں کی رہنے والی تھی۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایک تنگ سڑک پر مڑے اور پھر مین روڈ پر آ گئے۔ مین روڈ کے ساتھ کھاتا ہوا کئی بڑا بڑا بھی تھی اور دونوں سڑکیں روشنیوں میں جھگڑا رہی تھیں۔ بادی کی نگاہیں نیکی کی تلاش میں ادھر ادھر ہونے لگیں مگر کبھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک بس دکھائی دی۔ ”اس میں بیٹھ جائیں؟“ بادی نے کہا۔

لڑکی نے نگاہیں سیکڑ کر بس کا نمبر پڑھا اور بولی۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔“

پلیٹ میں آلو اور پھل کے تیلے ہوئے گول تھلے تھے۔ وہ شیشیا لیکن پھر مسکرا کر رہ گیا۔ وہ اٹکل نہیں لیتا تھا لیکن آج کل جس موڈ سے گزر رہا تھا اس نے اسے درہم برہم کر رکھا تھا۔ اس نے سوچا چلو اب آئی گئی ہے تو پھر آ جائے۔ شاید گناہ کے کھاتے میں بھی کچھ نری لکھی جائے کیونکہ یہ خود بخود آئی تھی۔

اس نے نیا مسگریٹ سلگایا اور گاڑی سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ سیال آگ دھیرے دھیرے معدے میں آنا شروع ہوئی تو سڑک کے مناظر کچھ اور بھی رنگین نظر آنے لگے۔ دور پانی میں ڈوبتی ہوئی تفریحی کشتیاں، ان کی روشنیاں اور روشنیوں میں تھرکتے ہوئے جسم مزید دلچسپ محسوس ہونے لگے۔

اس نے ایک کے بعد دوسرا گلاس منگوا لیا۔ ہاتھ پاؤں بھاری ہوتے چلے گئے۔ قریب آتے ہی بعد جب وہ وہاں سے اٹھا تو اس کے قدم ڈمک رہے تھے اور اس کے سامنے 30 یورو یعنی تقریباً 3200 پاکستانی روپے کا بل تھا۔

ایسے موٹے بل بادی کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ کسی نے مل چکنا کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا مگر جسم میں حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ اٹکل کے ساتھ ساتھ آلو اور پھل کے لذیذ قتلوں نے بھی کام دکھایا تھا۔ اس کے بال ہوا میں لہرانے لگے۔ ونس کی روشنیاں ہزار ہا جگہوں کی طرح اس کے اوپر ڈمک رہی تھیں۔ یہ جتنو جیسے موسیقی کی لہروں پر رقصاں تھیں۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک تنگ سڑک سے گزرتے ہوئے اسے اپنے پہلو میں خوبصورت منظر دکھائی دیا۔ شہر کی ایک آبی سڑک کے پورے کنارے لہنے والا بحری جہاز

چلے۔ اس پر روشنیاں جھگڑا رہی تھیں۔ نیچے سے کشتیاں گزر رہی تھیں اس نے اپنے گلے سے Nikon کا بیجیل کا کیمرہ اتارا اور تصویر اتارنے لگا۔ ”ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنا شولڈر بیگ نیچے فٹ پاتھ پر رکھ دیا تھا۔ ایک سیک

اور دیگر اشیاء اس کی کمر پر تھیں۔ وہ دوسری یا تیسری تصویر اتارنے کے لیے ذرا سا آگے چلا گیا۔ یہی وقت تھا جب اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس کا شولڈر بیگ ابھی تک فٹ پاتھ پر ہی پڑا تھا۔ اسے لگا کہ کوئی اس بیگ پر جھپٹا

ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں چمکا کہ اب وہ سوئٹزر لینڈ میں نہیں اٹلی میں ہے۔ اور اٹلی میں امن و امان کی صورت حال زیادہ اچھی نہیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سایہ سا اس کا بیگ اٹھا کر واپس دوڑ رہا تھا۔

”پکڑو۔ پکڑو۔“ بادی پہلے اردو میں چلایا پھر انگلش میں پکارا۔ ”تحقیق۔ تحقیق۔“ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی اٹھائی گہرے کے پیچھے دوڑا۔ اس کی کمر پر رک سیک اور دیگر سامان کا بوجھ تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے نہیں دوڑ سکا۔ اور گرو اکاؤنٹ لوگ تھے اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ فوری طور پر کسی کی کچھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ وہ شخص

بادی سے جیس جیس قدم آگے تھا اور کسی بھی وقت اس تنگ سڑک کی کسی بنگلی گلی میں گم ہو سکتا تھا۔ اچانک بادی نے دیکھا کہ ایک خاتون نے اٹھائی گہرے کے راستے میں ایک بانس نم شے پھینک دی۔ اٹھائی گہرے اس بانس نم شے سے اٹھ کر اوڑھ مٹ پلٹ سڑک پر گرا۔ بیک اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دو تین افراد اس کی طرف جیسے، ان میں

بادی بھی شامل تھا۔ اس جواں سال اٹھائی گہرے کو پکڑ لیا گیا۔ اس پر گھونٹوں اور غصہ کروں کی پوچھاڑی مچی۔ اسی دوران میں پھر تیلے شخص نے خود کو چھڑا دیا اور تیزی سے جھٹکائی دے کر ایک نیم تاریک گلی میں دوڑ لگا دی۔ دو افراد اس

چہرے پر اشتیاق تھا۔

"میں نے ابھی تک آپ کا نام نہیں پوچھا۔" ہادی نے کہا۔

وہ ذرا انک کر بولی۔ "لطیف!..... لطیف!....."

"آپ یہیں رہتی ہیں؟"

"نہیں..... ہادی رہائش روم میں ہے۔ میں یہاں اپنی ایک فرینڈ کے پاس آئی ہوئی ہوں۔" اس نے مختصر

جواب دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہ آگے بتانا نہ چاہتی ہو۔

اس سے پہلے کہ ہادی کچھ کہتا وہ پھر بول اٹھی۔ "اور آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"مجھے ہادی کہتے ہیں۔ کراچی کا رہائشی ہوں۔ شاعری میں منہ مارتا ہوں۔ فلموں کے لیے بھی شاعری کی ہے۔

آج کل ٹی وی ڈراموں کے قلم ساگ وغیرہ بھی کہہ رہا ہوں۔"

اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اشتیاق سے بولی۔ "اچھا تو آپ شاعر ہیں لیکن شکل سے تو نہیں لگتے۔ ویسے..... ویسے

مجھے بڑا شوق ہے فنکارانہ لکھنے سے ملنے کا۔ میرے ایک ماموں بھی نعتیہ شاعری کرتے تھے اور مشاعروں وغیرہ

میں بھی پڑھتے تھے۔ ترنم کے ساتھ۔ اب وہ کافی عرصے سے بیمار ہیں اکثر فنکاروں کی طرح وہ بھی بالکل مختلف اور

انگ قسم کے تھے۔ کیا آپ بھی ایسے ہی ہیں؟"

"آپ خود بتائیے۔ میں آپ کو کیا لگ رہا ہوں؟"

"اس کے لیے تو بھر توڑا سادقت آپ کے ساتھ گزارنا پڑے گا۔ اچھا کیا بتایا تھا ابھی آپ نے؟ آپ کو کون

ی۔ کپ پلیس پر جانا ہے؟"

"وہیز یا..... میرا خیال ہے کہ کسی سینٹر سے ذرا بہت کر ہے۔"

"پلیس ٹھیک ہے۔ میں کپ پلیس تک آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔

وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔" ہادی نے کہا۔

اس نے نعلی ہونٹ کو ہولے سے دانٹوں تلے دبایا۔ پھر آہستہ سے بولی۔ "ویسے تو آج میں بھی شہر میں گھومنا

چاہ رہی ہوں۔ پرسنل صبح مجھے والپس چلے جانا ہے۔ آپ بھلے آدمی لگ رہے ہیں۔ ہم اکٹھے گھوم سکتے ہیں۔ مگر اس

کے لیے پہلے مجھے مار یہ گوفن کرنا ہوگا۔ مار یہ میری فرینڈ کا نام ہے۔"

"کیا وہ بھی آئے گی؟"

"نہیں اس کے ساتھ تو بہت گوی ہوں ہیں۔ آج اکیلے ٹھکانا چاہتی ہوں۔" وہ من موچی انداز میں بولی۔

"پھر اس کو فون کیوں کر رہی ہیں؟"

"بھئی..... میزبان کو انکارم تو کرنا ہوتا ہے نا۔ اس کے کہنا۔"

ہادی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ وہ جیسے اپنی ہی کسی لہر

دونوں سوار ہو گئے۔ انہیں نشستیں بھی مل گئیں۔ بس روانہ ہوئی تو دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہادی نے پہلی بار لڑکی کو ذرا دھیان سے دیکھا۔ عمر بھی کوئی تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ خوش شکل تھی۔ ہادی کے انداز سے کے مطابق اس کے چہرے کی سب سے جاذب نظر شے اس کی پیشانی تھی جو مسکراتے ہوئے کچھ اور بھی خوبصورت ہو جاتی تھی۔ بے شک وہ جدید لباس میں تھی تاہم اس کے انداز میں ایک طرح کی مشرقیت اور معصومیت تھی۔

"یہ بس کہاں جائے گی؟" ہادی نے پوچھا۔

"ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا نہیں، لیکن فی الحال یہ میں بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی ہے۔ وہاں جا کر اتر جائیں

گے۔ پھر آپ جا رہے جس مرضی میں میں جہ جائیں۔ ویسے آپ نے جانا کہاں ہے؟"

"جانا تو کہیں بھی نہیں۔ بس کئی گھنٹے پر سامان رکھنا ہے اور پھر ساری رات ادھر ادھر گھومنا ہے۔ یہ ویک

اینڈ کی رات ہے۔ میں اسے کہیں سو کر گزارنا نہیں چاہتا۔"

"کتنے دن کے لیے یہاں ہیں آپ؟"

"زیادہ سے زیادہ پانچ دن۔"

"پھر کہاں جائیں گے؟"

"فلورنس یا روم۔ لیکن زیادہ چانس ہے کہ روم..... روم مجھے ہمیشہ سے بہت زیادہ پسند ہے۔"

"آپ اکیلے ہی نکلے ہوئے ہیں پاکستان سے؟"

"ہاں..... جناب ابن انشاء صاحب نے کہا تھا کہ سیاحت کا اصل حزا اکیلے میں ہی ہے۔ میرا اپنا بھی خیال

ہے کہ انسان کسی کی کمپنی میں جو کچھ دیکھتا ہے۔ اکیلا رہ کر اس سے دس گنا زیادہ دیکھ سکتا ہے۔"

"اوہو..... پھر تو میں نے بہت غلط کیا آپ کے ساتھ آکر۔" وہ ادا سے بولی۔ اس کی مسکراہٹ اس کی پیشانی

کو روشن تر کر رہی تھی۔

"نہیں..... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ نے تو بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔" وہ تہہ دل سے بولا۔

وہ اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔ "ویسے آپ نے رہنا

کہاں ہے؟"

"آپ نے میرے سامان میں خیر تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔ کیمپ سائٹ پر خیمہ لگاؤں گا۔"

"وہ زرفل۔ بڑا رومانی آئیڈیا ہے۔ مجھے بھی کیمپنگ بہت پسند ہے لیکن انفس کہ ایک دفعہ کے سوا کبھی کسی

"کیمپ پلیس" میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"تو اب چلیے۔ کیمپ پلیس کی سیر ہو جائے گی۔ بڑی شاندار جگہ ہے۔ میرے پاس اس کی تصویریں بھی ہیں۔"

ہادی نے کہا اور شولڈر بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے چند پتھر کا رڈز نکال لیے۔ ان میں وٹس کی ایک معروف

کیسپس پلیس "وینزیا" کی تصویریں موجود تھیں۔ دو تین معلوماتی پمفلٹ بھی تھے۔ درختوں کے درمیان عدد کا دھک

رنگ برنگے ٹینٹ لگے تھے اور چلتے پھرتے گھریلو کیروینز (Caravans) موجود تھے۔ لڑکی عجوبت سے دیکھنے لگی۔

میں ہے چلی جا رہی تھی۔

ایک اسٹاپ پر وہ بس سے اترے۔ ونیزیا کی کیپ ٹیس تک پہنچنے کے لیے انہیں ایک اور بس پکڑنا پڑی۔ لیکن اس سے پہلے ایک میڈیکل سنٹر سے بادی نے اپنی کلائی کی بینڈج کروائی۔ بادی نے دیکھا تھا کہ سوسائٹری لینڈ میں بغیر ڈاکٹری نسخے کے اسپرین بچک لینا مشکل تھا لیکن یہاں انکی میں ایسا نہیں تھا۔ کم از کم وہیں میں تو میڈیکل سنٹر میں رہی تھی بلکہ سنٹر میں موجود ایک ملازم کا گھربل کے لیے اس کی بینڈج بھی کر دی تھی۔

بینڈج کے بعد وہ جس بس پر سوار ہوئے اس کا نمبر پانچ تھا۔ اس بس نے دس پندرہ منٹ کے خوشگوار سفر کے بعد انہیں کیپٹنگ سائٹ پر پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر علیزبا کی طرح خوش ہوئی۔ واقعی جگہ بھی خوبصورت تھی۔ بندو بالا درختوں کے نیچے دور تک خمیوں اور "چلتے پھرتے گھروں" کا شہر آباد تھا۔ سامنے ہی ایک شاندار ریستورانٹ نظر آیا۔ اس میں بار بھی تھا۔ درجنوں جوڑے بانسوں میں بائیں کواٹل گھوم رہے تھے اور کھانا پک رہے تھے۔ وہ دونوں استقبال پر پہنچے۔ یہاں خیر لگانے کی فیس 40 یورو روزانہ یعنی تقریباً 4200 پاکستانی روپے تھی۔ بادی کو یہ ہر زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ سوسائٹری لینڈ میں دو مہینے ہوٹلوں میں قیام کر چکا تھا۔ زیورک ہسپتال کے کنارے ایک ہوٹل کا کرایہ تو اس نے تقریباً پندرہ ہزار روپے یومیہ ادا کیا تھا۔ شہر استقبال پر بادی کا پاسپورٹ رکھ لیا گیا اور اسے ایک سلب جاری کر دی گئی جو دراصل خیر لگانے کا اجازت نامہ تھی۔

بادی نے ریستورانٹ کے عقب میں ایک جگہ خیر کے لیے منتخب کی۔ خیر کو جوز نے اور پھر کھڑا کرنے میں علیزبا نے بھی بادی کا ساتھ دیا اور اس کام میں بڑی دلچسپی لی۔ وہ واقعی بچوں کی طرح خوش نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بڑی جلدی بے تکلف ہو جانے والی لڑکی ہے یا پھر وہ اس سلسلے میں بادی کو خاص رعایت دے رہی تھی۔ بہر حال اس کی روپے میں کسی طرح کا رو مانوی بچہ برگز محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ بادی کے ساتھ ایک دوست کی طرح ہی برتاؤ کر رہی تھی۔

خیر کھڑا کرنے کے دوران میں بادی کا دل بار بار چاہا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرے، مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ علیزبا نے خاموشی کی زبان میں اسے باور کرا دیا ہے کہ وہ اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش نہ کرے ورنہ یہ خوبصورت ساتھ کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے اور وہ اسے "بائی" کہہ کر دینس کی روشنیوں میں گم ہو سکتی ہے اور بادی اسے کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم آج رات تو نہیں۔ سوسائٹری لینڈ میں وہ اکیلا ہی گھومتا رہا تھا اور اب اس "تھا گروئی" سے قدرے اکتایا ہوا تھا۔

خیر ایستادہ کرنے کے بعد اور اس میں سامان رکھنے کے بعد وہ نکل کھڑے ہوئے دونوں اجنبی تھے لیکن ہم زبانی اور ہم وطنی نے انہیں ایک دوسرے کے قریب لا کھڑا کیا تھا۔ دینس شہر کی اس برفوں شب میں گم ہونے کے لیے وہ یوں روانہ ہوئے جیسے مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ "کہاں جانا ہے؟" علیزبا نے بس اسٹاپ پر پہنچ کر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ سوال تو مجھے پوچھنا چاہیے۔ کیونکہ آپ تین چار دن سے یہاں موجود ہیں۔ دینس کو مجھ سے زیادہ جانتی

تھا۔"

"تو پھر کسی "ایمیزینٹ پارک" میں چلتے ہیں۔ جموں وغیرہ لیں گے۔ کشتی چلائیں گے۔" اس کی آواز میں بھاری پن تھا، جو بادی کو شروع سے ہی محسوس ہو رہا تھا۔

بادی نے کہا۔ "یہ آپ کی آواز بھرائی ہوئی کیوں ہے۔ کیا گلاب ہے؟"

"اور آپ کیا سمجھتے ہیں۔ مجھے جیسے سارٹ لڑکی کی آواز اتنی بھدی ہوئی۔" وہ مسکرائی اور اس کی قدرے ابھری دونوں پیشانی دکھائی۔ یہ پیشانی اس کی مسکراہٹ کو ایک دم ویرانہ بنا دیتی تھی۔

وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "دراصل میں کل بھی ایک تفریحی پارک میں تھی۔ وہاں پاکستانی انڈین کھانے بھی تھے۔ مزے کی بات یہ کہ گول مچے بھی تھے۔ اور گول مچوں کو کچھ کریمیری دی حالت ہوتی ہے جو سحر میں لپ لپ کو کچھ کریموں کی ہوتی تھی۔ میں نے ضرورت سے زیادہ کھا لیے۔"

"کوئی دوا لی؟"

"نہیں۔" اگر کہیں نظر آ گئے تو آج پھر گول مچے کھاؤں گی۔ کہتے ہیں کہ لوہے کو لوہا کا کرتا ہے۔"

"یہی مسئلہ مزاج ہیں آپ۔"

"جی ہاں، لیکن آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔ ورنہ جس طرح کی باتیں کرتے ہیں آپ اب تک ہم دو مختلف ہوں میں بیٹھتے ہوتے۔"

"میری باتیں پسند نہیں آتیں آپ کو؟"

"بچی بات ہے کہ ابھی تک تو نہیں۔ آگے دیکھتے کیا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ پہلے ہوئے سے اپنا نیچلا ہونٹ دائیں میں دبایا پھر ٹھٹھکا کر دینس کی باتیں کرتے ہوئے اس کا سر جھٹک گیا اور پونی ٹیل لہرائے لگی۔ پھر ایک دم عجیبہ ہوتے ہوئے بولی۔ "نہیں مذاق کر رہی ہوں۔ آپ کی کہنی بہت اچھی ہے۔"

اسی دوران میں سنی سینٹر جانے کے لیے ان کی مطلوبہ بس پہنچ گئی۔ یہ وہی پانچ نمبر تھی۔ دونوں سوار ہوئے۔ اس قدر نشیمن نہیں لیکن اور وہ دونوں کھڑے رہے۔ بالکل آسنے سائے۔ علیزبا کی خوشگوار سانس بادی اپنے بالکل پاس محسوس کر رہا تھا۔ ان کے دل میں جانب سمندر تھا۔ یہاں بڑے بڑے ٹکڑی جہاز کھڑے تھے۔ جیسے شاندار کشتیوں کی مارتیں جن کے اندر زندگی کی ہر سہولت موجود ہو۔

میں بس اسٹینڈ پر پہنچ کر انہوں نے سنی کی اور تفریحی پارک "اوساوا" کی طرف چل دیے۔ یہ ایک آرام دہ شاندار پارک تھی۔ نیکی ڈرائیور..... ڈرائیور ہم اور جہاز کا کپتان زیادہ نظر آتا تھا۔ وہی دہرہ..... وہی اکڑفوں۔ کرایہ بھی کافی زیادہ تھا۔ بادی نے کرایہ ادا کیا۔ علیزبا نے اس میں شہر کرنے کی کوشش کی مگر بادی بولا۔ "اس وقت آپ کی حیثیت مسافر سے زیادہ میرے محترم کا بیٹا کی ہے۔ اس لیے کوئی ٹکٹ میں زیادہ تیزی نہ دکھائیں۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر چپ رہ گئی۔ بادی نے سمجھا کہ وہ مان گئی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس کا تپا اتنے آگے جا کر چلا۔

نے غیر یقینی نظروں سے ہادی کو دیکھا۔ "یہ گیت تو میں نے سنا ہوا ہے۔ کیا یہ واقعی آپ نے گایا... میرا مطلب ہے کہ تمنا ہے؟"

”اب آپ ثبوت یا گواہی مانگ رہی ہیں۔ آپ تو مجھے پولیس والی لگ رہی ہیں۔“

”نہیں... نہیں ہادی صاحب! میں تو بس حیران ہو رہی ہوں۔ اگر یہ واقعی آپ نے لکھا ہے تو پھر تو آپ مشہور آدمی ہوئے۔ مجھے سبب تک وغیرہ سے بہت زیادہ دلچسپی تو نہیں لیکن پھر بھی ٹی وی اور ایف ایم پر کبھی کبھی سن لیتی ہوں۔ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج وہیں کی ان خوبصورت روشنیوں میں ایک مشہور پاکستانی فنکار میرے ساتھ ہے۔“ وہ ایک دم خوشی سے نہال اٹھ آئی۔

”خیر ایسا مشہور فنکار بھی نہیں۔“ ہادی نے متانت سے کہا۔ ”اصل مشہوری تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو سکرین پر نظر آتے ہیں۔ یا پھر جن کی آواز عوام کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ ہم تو بیک اسٹیج کے لوگ ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں مچانتا۔ نہ کوئی آنوگراف لینے کے لیے ہماری طرف پلکتا ہے۔“

”لیکن بھی اصل بنیاد اور سوچ تو آپ لوگ ہی دیتے ہیں تا۔ اسی پر کسی شہرہ پارے کی عمارت بنتی ہے۔“

”سب لوگ تو آپ کی طرح نہیں سوچتے۔ کسی مشہور ہو جانے والے گیت کے گلوکار کو سرائیکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ اگر وہ گیت کسی ذرا سے یا قلم میں ہو تو گیت گانے والے اداکار کی واہ واہ ہوتی ہے۔ ایوارڈ ملتے ہیں۔ سندس عطا ہوتی ہیں۔ اس گیت کو سینکڑوں ہزاروں بار چلا کر اور اس کے ری میکس بنا کر روپیہ کمایا جاتا ہے۔ وہ کمرشلز میں استعمال ہوتا ہے۔ یہیں تک کہ چڑوسی ٹکوں کی فلموں اور ڈراموں میں داخل ہو جاتا ہے مگر اسے لکھنے والا بے چارہ منام اور انگ تھک رہتا ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے بادی صاحب! اس بارے میں میں نے بھی کئی بار سوچا ہے اور افسوس کے ساتھ سوچا ہے۔ کسی شاندار ظلم یا ڈرامے کے نکلنے والے کا عالم جھوٹے سونے جھٹیک کاروں کے ناموں کے ساتھ سکریں پر آتا ہے اور تیزی سے گزر جاتا ہے۔ جبکہ ہدایت کار اور پروڈیوسر وغیرہ کے ناموں کو خوب ہائی لائٹ کیا جاتا ہے۔ دراصل ہر کسی بھی شے میں حق و دار کو اس کا حق نہیں دیتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ شے زوال کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن ”وہ کہہ سکتے کہتے رک گئی۔

”لیکن کیا؟“ ہادی نے پوچھا۔
 ”معاف سمجھو گا۔ آپ کو کتنے نیکو لگے چارے دکھائی نہیں دیتے۔ لگتا ہے کہ آپ کمار ہے ہیں اور خرچ بھی
 کر رہے ہیں۔“

”ہاں علیہ! اکانے کے حوالے سے تو مجھ کی حریفہ مطمئن ہوں۔ لیکن ہم گیت نگاروں کی آمدن میں تسلسل نہیں ہوتا۔ کوئی اچھی چیز لکھ لی اور وہ ”ہٹ“ بھی ہو مگر تو کافی پہلے آئے لیکن اس کے بعد دو تین ماہ مندرے کے گزرے اور حساب برابر ہو گیا۔“

”تو آپ کو شش کہا کریں کہ بس ہٹ چیزیں ہی نکلیں۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

وہ دونوں پارک میں داخل ہوئے۔ یہاں تفریح کے لیے بہت کچھ تھا۔ جموں کے کشتیاں، رولر کوسٹر ٹاپ گاڑیاں، بھیڑ..... سرکس..... اور نہ جانے کیا کیا۔

”چلیں پہلے یہ جمولا لیتے ہیں۔“ اس نے کہا اور سبے تکلفی سے ہادی کا ہاتھ تمام کر ایک چکر دار جمولے کی طرف لے آئی۔ یہاں قطار کی کوئی تھی۔ دونوں قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے بھی اس جمولے میں بیٹھ چکی ہے اور ”ایکسا چند“ ہے۔ ان کے آگے قطار میں کھڑا ایک جوڑا لگا ہے بگا ہے بغلیں ہوتا تھا اور دیگر حرکات میں مصروف ہو جاتا تھا۔ یہ وطیرہ تو پوبے کے یورپ میں عام ہے اور اب لوگ ایسے مناظر کی طرف زیادہ توجہ بھی نہیں دیتے۔ شاید انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ ہر طرح کے ماحول سے جلد مانوس ہو جاتا ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ دوسروں کو چونکا نا چاہتا ہے۔ اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے روانی جذبے عوام الناس کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے نئی حرکات اور نئے ”وطیرے“ ڈھونڈ لیتے ہیں۔

قطار آگے کو سرک رہی۔ چکر دار جمہول کافی بڑا تھا اور اس کی لہریلی ہوئی "موومنٹ" بھی کافی سنسنی خیز لگتی تھی۔ اس پر بیٹھے ہوئے مرد و زن جوش اور خوف کے عالم میں چلا رہے تھے ان میں حسبِ رواج بچے کم ہی نظر آتے تھے۔ اچانک علیوانے ہادی سے پوچھا۔ "آپ یہ گیت وغیرہ کس طرح لکھتے ہیں؟" "جس طرح یہ جمہول چل رہا ہے۔" ہادی نے رواں لہجہ میں کہا۔ "اس جمولے کو چلانے کے لیے بجلی درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی تخلیقی کام کے لیے اندر کی تحریک اور توانائی درکار ہوتی ہے۔ جب یہ توانائی ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو تخلیق کا جمہول خود بخود چل پڑتا ہے۔"

”اور یہ تو انائی آئی کہاں سے ہے جناب؟“

”اپنے ارد گرد سے، کوئی پھول کھلا ہے، کوئی آنسو گر رہا ہے، کوئی صبح ہوتی ہے، کوئی آپ جیسی لڑکی مسکراتی ہے۔“

تو یہ تو انائی خود بخود تخلیق کے سوتوں میں داخل ہوتی ہے اور انہیں رواں کر دیتی ہے۔“

”اب مجھے یقین آ گیا۔ آپ یقیناً شاعر ہوں گے۔ آپ بہت کاظمی گفتگو کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائی اور اس کی پیشانی پر پھر چوہو کیس کا چاند روشن ہو گیا۔

”یعنی اس سے پہلے آپ کو میرے شاعر ہونے پر شک تھا؟“
 ”زیادہ نہیں..... تھوڑا تھوڑا تھا۔“ وہ ادا سے بولی۔ پھر موضوع بدل کر کہنے لگی۔ ”اچھا آپ اپنا کوئی مشہور گیت سنائیں۔ گیت یا کوئی غزل وغیرہ۔“

”آپ شناخت پر یلہ کر رہی ہیں۔“
 ”اوہو..... آپ ناراض ہو گئے۔“
 ”ناراض ہونے کا حق تو مجھے نہیں ہے۔ ابھی ہماری جان پہچان ہی کتنی ہے۔“
 ”تو پھر سناؤں گے۔“

ہادی نے ٹی وی چوتھوں سے نشر ہونے والے ایک گیت کا کلر اسٹایا تو علیہ کی آنکھیں بے سادہ پھیل گئیں۔ اس

اسی طرح بتدریج ختم ہو گئے تھے۔ مگر اس لڑکی میں بادی کو کوئی جدائے نظر آ رہی تھی۔ اس کی قربت اور اس کے لمس میں جو ایسی بات تھی جو بادی نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ جیسے کوئی آن دیکھی چیز اسے اس سیلابی لڑکی کی طرف کشش کر رہی تھی۔ پتا نہیں کہ یہ آبی گزرگاہوں کے شہر و نس کا کمال تھا۔ اس دلچسپ رات کا فصول تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔

دوسرا جمولا بھی بڑا سنسنی خیز قسم کا تھا۔ اس نے جمولا سواروں کو اٹھایا، گھمایا، اٹھایا اور دہلایا۔ چلا چلا کر لوگوں کے گلے بیٹھ گئے۔ غلیڑا کی آواز تو پہلے ہی بھرائی ہوئی تھی کچھ اور بھرائی گئی۔

اس نے بیشکل کہا۔ ”بہت مزہ آیا۔“

”آپ لی آواز تو مزید بیٹھ گئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اب گول گپے کھا لینے چاہئیں۔“

”کیا بالکل خاموش ہونے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں آپ دیکھیں گا، گول گپے کھانے سے میری آواز بہتر ہو جائے گی۔“

”یہ تو مذاق کی بات کی ہے آپ نے۔۔۔۔۔ اور اگر مذاق نہیں بھی تو۔۔۔۔۔ گول گپے ملیں گے کہاں سے؟ یہاں تو دلی ایسے گا کہ نظر نہیں آ رہے۔“

”خیر ہیں۔ بلکہ باقاعدہ گول گپے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ آلو پنچے، سموسے، جلیبیاں اور شاید وہی بڑے بھی مل جائیں۔ یہاں باقاعدہ ایک فوڈ اسٹریٹ ہے جناب! ہر ملک کے کھانے ہوتے ہیں۔“

”لیکن گول گپوں کے لیے تو ”کھانے“ کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایسی چیزوں کو تو سیانے لوگ ”پانی پیزی“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔“

”اس نے سنی ان کی کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے ڈھیلے بال کس کر باندھے اور بادی کو لے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے ایک ایک سے تو اتائی اور خوشی کے سوجھتے چوٹ رہے تھے۔ جلد ہی وہ دونوں فوڈ ہاؤس کے اندر تھے۔

ایک جمبولی پر سیاہیوں کا رش ہوتا ہے اور ہر ملک و نسل کے لوگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ غالباً اپنی فرینڈ کے ساتھ پہلے بھی یہاں آچکی تھی۔ چیر کی طرح سیدھی انڈین پاکستانی سال تک جا پہنچی۔ گول گپے اسے دوری سے نظر آ گئے تھے۔

وہ باقاعدہ ان پر چبھی۔ باہمی نے آخری بار اسے منع کیا۔ ”دیکھیں آپ اپنے گلے کے ساتھ ظلم کریں گی۔“

وہ ترست ہوئی۔ ”یہ بھی تو مجھ پر ظلم کر رہا ہے۔ کبھی کبھی ظلم کا جواب ظلم سے دینے کو بھی دل چاہتا ہے۔“

اس نے آخری الفاظ عجیب سے لکھے مٹا دیے تھے۔ بان نے ہونک کر اسے دیکھا وہ اب بڑے خشوع خضوع سے گول گپوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اٹھارہ برس کا گول گپے میں چھو کر اس نے گول گپے میں سوراخ کیا۔ پھر اس میں تھوڑے سے کالے پنے ڈالے۔ اسے اگلی دکان کے پالے میں ڈبویا اور بڑی مہارت سے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی سر کے اشارے سے اس نے بادی کو بھی چاہیت کی کہ وہ بھی اس ٹیک کام میں دیر نہ

گزرے۔

بادی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”یہ تو ایسے ہی ہے جیسے آپ کرکڑ محمد یوسف سے کہیں کہ وہ ہر بال پر چھو کیوں نہیں مارتا یا پھر میرا ڈونا سے پوچھا جائے کہ وہ ہر پندرہ منٹ بعد گول کیوں نہیں کر دیتا تھا۔“

”مثالیں تو آپ اچھی دیتے ہیں۔ گفتا ہے کہ گیت بھی اچھے ہی لکھتے ہوں گے۔“

”بس گزارد کر لیتا تھا بادی نے پھر لمبی سانس لی۔

”کیا مطلب؟ اب نہیں لکھتے آپ؟“ اس نے دید سے تھمائے۔

”نہیں۔۔۔ لکھتے ہوں۔ مگر کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ جس طرح کھلاڑی آؤٹ آف فارم ہوتے ہیں۔ اس طرح

میں بھی خود کو محسوس کر رہا ہوں۔“

”آؤٹ آف فارم۔“ دوہرنے لگی۔ ”یہ اچھی اصطلاح استعمال کی ہے آپ نے۔“ اس کی پیشانی جیسے معمول و کف انھی۔ بادی پیشانی کی اس وکٹ میں کھوسا گیا اس کی ”شاہکار“ مسکراہٹ کی بنیادی وجہ تو اس کے لیے غیر معمولی

طور پر سفید اور ہموار دانت تھے، لیکن پیشانی بھی اس میں بھر پور کردار ادا کرتی تھی۔ اسی دوران میں جمولے پر ان کی بادی آ گئی۔

وہ جمولے پر سوار ہو گئے۔ بڑا جدید اور شاندار جمولا تھا۔ اس کی موومنٹ جیسے باد پھیلنے کو چلانے اور بادی کا بازو پکڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ بڑے بے ساختہ انداز میں ہوا۔ بادی نے کچھ دیکھا۔ اس نے غلیڑا کی طرف

دیکھا۔ پتا نہیں کیا لڑکی تھی یہ۔ کسی اچھے گھرانے کی لکھی تھی۔ چہرے سے شرافت چمکتی محسوس ہوتی تھی مگر خیر نہیں کہ وہ کس موڈ میں تھی کہ اس وقت بادی کے ساتھ ایک تفریحی پارک میں تھی اور بچوں کی طرح چبکاریں مار رہی تھی۔

اس کے بقول وہ یہاں اپنی کسی سہیلی کے پاس آئی ہوئی تھی لیکن رات کی اس سیر و تفریح میں وہ سبکی بھی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس نے اسے بس ایک فون کیا تھا اور بالکل بے فکر ہو گئی تھی اس جمولے سے اترتے ہی غلیڑا نے بادی کی

دائیں کلائی پکڑی اور ایک دوسرے جمولے کی طرف لپکی۔ ”دوڑو بھئی“ وہ پکاری۔

دراصل ایک گروپ اس دوسرے جمولے کی قطار میں گھٹنے کے لیے آ رہا تھا۔ وہ اس گروپ سے پہلے ہی قطار میں لگ جانا چاہتی تھی۔ وہ خود دوڑی اور اس نے بادی کو بھی دوڑا دیا۔ دونوں کسی کا جھیت جوڑے کی طرح بھاگتے

ہوئے لائن میں لگ گئے۔

بھاگنے سے اس کے گال شہابی ہو گئے اور وہ ذرا ہانپ گئی۔ بھاگنے سے اس کے بال بھی ذرا ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اس نے پونی ٹیل کا بینڈ اتار دیا اور بازو اوپر اٹھا کر بال کھنسنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ بڑے مناسب جسم کی مالک

تھی۔ پتا نہیں کیوں، بادی اس میں عجیب سی کشش محسوس کر رہا تھا۔ وہ کوئی دل پھینک نوجوان نہیں تھا۔ اس کی شاعری نے پڑستاروں میں بہت سی خواتین اور لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ کئی لڑکیوں نے اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش

بھی کی تھی۔ ان میں سے دو تین ایسی تھیں جن کے ساتھ اس کی دوستی پر وہ ان چیز میں تھی۔ نوجوان جوڑوں کی طرح اس کے ساتھ کھو ماہرا کیا تھا۔ رشتہ سواروں میں آٹا کھا گیا تھا۔ شاعری اور شاعری کی ”جو بات“ پہنچی چوڑی باتیں ہوتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی لڑکی بھی دیر بادی کی سوچوں پر قابض نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ تعلق جس طرح شروع ہوئے

انہائے لیکن پھر باندھنے کا ارادہ بدل دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد یہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، کسی ایسے آبشار کی طرح جس کا پانی بولے بولے ہوا میں لہراتا ہے۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“ اس نے روانی سے پوچھا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ آپ پونی نیل میں زیادہ اچھی لگتی تھیں یا اس طرح۔“ بادی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے ذرا ٹھٹک کر بادی کو دیکھا پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔ ”ہاں..... آپ نے بتایا نہیں کہ آپ پاکستان سے کسی گھوڑے کی طرح وگڑ وگڑتے ہوئے یہاں کیوں تشریف لائے؟ کیا اسے گھاس نہیں ملتی تھی۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”ہاں نہیں“ گھاس“ سے آپ کا کیا مطلب ہے لیکن میرا مسئلہ اور تھا آپ یوں سمجھ لیں کہ میں ایک فنکار کی حیثیت سے خود کو اندر سے بالکل خالی محسوس کر رہا تھا۔ خالی اور بخر۔ مجھے دو مشہور میوزک کمپنیوں کی طرف سے الم نیسے کا حوالہ مل رہا تھا۔ خاصی موٹی رقمیں بھی آخر کی جارہی تھیں لیکن میرا دل کام کو نہیں چاہ رہا تھا۔ بالکل بھی نہیں۔ نہ بنے ایک جگہ سے تو ایڈوائس بھی پکڑ رکھا تھا۔ وہ بھی واپس کر دیا۔ قریباً تین چار ماہ تک کوشش کرتا رہا کہ گیت لکھائی کی طرف مائل ہو سکوں۔ لیکن نہیں ہو سکا۔ پھر بہتر سمجھا کہ نہ اجماع لکھنے کی بجائے نہ لکھوں۔ ویزو لکھوایا کچھ سامان اٹھایا اور نکال پڑا۔ یہ تین ماہ کا (Schengen) ویزہ ہے۔ یورپ کے ذخیرہ سارے ملکوں میں جاسکتا ہوں۔ چند دن سوئٹزرلینڈ میں گزارے ہیں۔ پہلے زیورک گیا پھر انٹر لاکن۔ اب بذریعہ یوریل (ٹرین) اٹلی آ گیا ہوں۔ چند نشتے یہاں رہنے کا ارادہ ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آسٹریا یا جرمنی کا راؤنڈنگا لوں۔“

وہ مسکرائی۔ ”اس سے کہہ دوں گا کہ گھوڑے کی اداسی ختم ہو جائے گی اور وہ پھر سے گیت لکھنے شروع کر دے گا۔“

”ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔“

”بس آپ فنکاروں کی یہی غیر فنی باتیں ہوتی ہیں جو عام لوگوں کو کشش کرتی ہیں۔ جب آپ سگریٹ کا کش لے کر لڑ پالوں میں اٹھکیاں چلا کر کھوئے کھوئے تھے لہذا میں بولتے ہیں تو دوسروں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا یہ“ مختلف پن“ کبھی کبھی لوگوں کو بیزار بھی کرتا ہے اور الجھاتا بھی ہے۔“

”آپ بتائیں آپ کبھی محسوس کر رہی ہیں یا بیزار ہو رہی ہیں۔“

”بیزار ہو رہی ہوں تو اس وقت آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔ خاموشی سے شہر کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی ہوتی۔ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے مرد و زنانہ بھیہم بھٹکتے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میرے ایک ماموں بھی بڑے اچھے نعت گو شاعر ہیں۔ کچھ ملی گئی تھی تھے تھے تھے انہوں نے نیا دلچسپی کے دور میں۔“

بادی نے لمبی سانس لی۔ ”مجھے پتا ہے خاموشی سے شہر کی بھیڑ میں گم ہو جانے کا آپشن آپ نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مجھے پتا چلتا ہی نہیں اپنے بارے میں۔“

بادی کو کبھی میٹھی چیزوں کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ پھر بھی اپنی ساتھی کی دلجوئی کے لیے اس نے گول گپوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ کھاتی جارہی تھی اور سی سی بھی کرتی جارہی تھی۔ اس کی خوبصورت ہانک قدرے سرخ دکھائی دینے لگی۔

بادی کے کانوں میں ابھی تک اس کا لہجہ اور اس کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”کبھی کبھی غلم کا جواب غلم سے دینے کو بھی دل چاہتا ہے۔“

کہیں اس پر بھی تو کوئی غلم نہیں ہو رہا تھا۔ جس کے رد عمل کے طور پر وہ یوں رات گئے اس آبی شہر میں بے مہار محسوس رہی تھی۔ اگر یہ رد عمل تھا تو کہیں کے خلاف تھا؟ اس کے اپنے والدین کے خلاف؟ کبھی دوسرے کے خلاف یا پھر شہر کے خلاف؟ کیا وہ شادی شدہ تھی؟ بادی ابھی تک اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا اس سے پوچھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

گول گپوں کے بعد وہ آلوچنے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بادی کو شش کے باوجود اس مرتبہ اس کا ساتھ نہیں دیا۔ بس ایک اونچی کرسی پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وہ جویت سے کھارہتی تھی۔ اس کی ایک لٹ بار بار اس کے ہونٹوں کی طرف آتی تھی جسے وہ اپنے اٹنے ہاتھ سے یا اپنی کہنی کے ساتھ پیچھے ہٹاتی تھی۔ جب جلون مزاج لڑکی تھی۔ بادی کو چند لمحوں کے لیے ڈر محسوس ہوا۔ کہیں اس دیار فیر میں وہ اسے کہیں پھنسا لیتی تھی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ ”غلام لوگوں“ کی ساتھی بھی ہو سکتی تھی۔ یا پھر گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی جس کے پیچھے اس کے اہل خانہ یا پولیس والے لگے ہوں۔ یا ایسا ہی کوئی اور معاملہ۔ بہر حال بادی کے اس ڈر کی عمر زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے اس نوجوان لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہاں شرافت اور خاندانی نجابت جھلک دکھائی تھی۔ بے شک وہ فی الوقت ایک شوخ اور ترمک بھرے موڈ میں تھی اس کے باوجود ایک طرزِ رویہ وقار بھی اس کے اندر سے پھونکتا تھا اور دیکھنے والوں کو اس سے فاصلے پر رکھتا تھا۔

آلوچنے کھانے کے بعد وہ مصنوعی جمیل میں تیرتی کشتیوں کی طرف بڑھ گئے۔ اب رات کے بارہ بجتے والے تھے۔ ونس رنگ اور مستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ تفریحی پارک بھی اسی مستی کا حصہ تھا۔ ان ملکوں کی تفریحی جگہوں کو دیکھ کر یہی لگتا ہے جیسے یہاں صرف جوڑے ہی بیٹے ہیں۔ نوجوان جوڑے۔ جوان جوڑے، ادھیڑ عمر اور بوڑھے جوڑے اور یہ جوڑے ہر جگہ اور ہر وقت اپنی محبت کا برملا اظہار کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ ہر نسوانی کمر کے گرد ایک بازو نظر آتا ہے اور ہر مردانہ کندھے پر کچھ خاتون کا سر رکھا ہوا ہے۔ بہت سے زریا اور ناز بیامناظر بھی بادی دیکھتا رہتا تھا۔

لنگھوں کے حصول کے بعد دونوں ایک پیڈل بوٹ پر سوار ہوئے اور نیم تاریک جمیل میں بوٹ چلائے ہوئے آگے نکل گئے کنارے کی روشنیاں جمیل میں جھللا رہی تھیں اور ایک خوشگوار ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ بادی جانتا تھا کہ اگر اس ہوا سے جنوری فردی میں واسطہ پڑا ہوتا تو وہ دونوں چھ منٹ میں برفاب ہو جاتے۔

غلیظ اکے ریشمی بال ایک بار پھر دھیلے ہو چکے تھے۔ اس نے انہیں باندھنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اوپر

دیا۔ اس نے بمشکل اپنے تاثرات پر قابو پایا اور علیز کو کنارے پر لے آیا۔

دونوں جھیل کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ جی پارک سے باہر آ گئے۔ باہر کی گھبراہٹ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ایک اوپن ایر ریسٹورنٹ نے آبی راستے کے کنارے کنارے دور تک میزیں سجا رکھی تھیں۔ یہاں جام حرکت میں تھے اور کھانے کھائے جا رہے تھے۔ آرکسٹرازور وڈ شور سے دھنیں بکھیر رہا تھا۔ سامنے والے پل پر اتنا جھوم تھا کہ گز رہا مشکل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ویک اینڈ کی رات نہیں بلکہ کوئی اہم تہوار ہے۔ بدست جوڑے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ فضاؤں میں نشیے قبضوں کی گونج تھی۔ وہ پل کے پار جانا چاہتے تھے۔ رش کی وجہ سے وہ دوسرے پل کی طرف بڑھے۔ اچانک گاڑیوں کی ایک باڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے دونوں ٹھٹھک گئے انہیں سسکیوں کی مدھم آواز سنائی دئی تھی۔ یہ ایک لڑکی تھی جو کسی باغیچے کی سیر جوں پر گھڑی بنی بیٹھی تھی۔ اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ بال جوڑے کی مسرت میں بندھے تھے۔ وہ کراہ رہی تھی اور اپنا ایک لمحہ بار بار دہاتی تھی۔

”کیا ہوا سسٹر؟“ علیز نے اس پر جھنجھٹے ہوئے کہا۔

اس نے چہرہ اٹھایا جو آنسوؤں سے تر تھا۔ لٹی میں سر ہلا کر وہ پھر اپنے اوپر اٹھے ہوئے ٹھنوں پر جھک گئی۔ یہ ہم اس کے رونے میں تھوڑی سی تیزی آ گئی۔ بادی اور علیز نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر علیز لڑکی کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ علیز نے لڑکی کو اس کے رونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک ہنگ دشتی لڑکی ہے۔ اس کا نام ایسہ ہے۔ اس کی سخت عزت ساس نے اسے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔

ایسہ نامی یہ لڑکی چھپن چھپن سال کی رہی ہوگی۔ وہ بنگالی لہجے میں اردو بول رہی تھی۔ سچ میں کہیں کہیں انگلش کا اثر بھی بول جاتی تھی۔ علیز نے لڑکی کو ہاتھ دیکھا۔ ”شوہر کہاں ہے تمہارا؟“

”وہ فلورنس گئے ہوئے ہیں۔ کوئی دفعہ کسی کام تھا انہیں۔“ وہ بنگالی لہجے میں بولی۔ فلورنس ایک قریبی شہر تھا۔ علیز نے کہا۔ ”یہ تو اور بھی نئی بات ہے۔ تمہارا شوہر کہاں نہیں اور اس عورت نے مار پیٹ کر تمہیں نکال دیا۔“

”وہ نکال دات کے وقت۔ اس کی تو پولیس رپورٹ ہوئی چاہیے۔“

لڑکی کی سیلا ٹھٹھوں کے کنارے پھر آنسوؤں سے بھر گئے۔ اس کا منہ ذرا سوچ گیا تھا اور ننگوں ہو رہا تھا۔ کراہتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی باغیچے میں آ جاتی ہیں وہ۔ میں نے ہاتھ جوڑے۔ منت کی لیکن ایک نہیں سنی۔ مجھے باہر نکال دیا۔ کر دواڑہ اندر سے بند کر لیا۔“

”بات کیا ہوئی تھی؟“ بادی نے پوچھا۔

”کسی بات کا ہونا ضروری نہیں۔ بس میں اچھی سی نہیں گئی ان کو۔ شادی کو سات ماہ ہوئے ہیں۔ بس پہلے ایک دو ماہ ہی ٹھیک گزرے پھر میری بدھیمی شروع ہوئی۔ پھر وہی چھوٹی باتوں پر میری مصیبت آ جاتی ہے۔“

”شوہر ساتھ نہیں دیتا تمہارا؟“ علیز نے پوچھا۔

”کبھی تھوڑا بہت دیتے ہیں کبھی نہیں۔ انہیں بھی اپنی والدہ کی باتوں کا ذور بتا ہے۔“

”اب کیا بات ہوئی تھی؟“

”کیا یہ ضروری ہے کہ چند گھنٹے ایک ساتھ گزارنے کے لیے ہم اپنا اپنا شجرہ نسب ایک دوسرے سے بیان کریں۔ کیا اس طرح مزہ نہیں آتا کہ ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں جھانکے بغیر بس دو انسانوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ کچھ وقت بتائیں۔“

”چلیں جیسے آپ کی مرضی۔“

”اچھا۔۔۔ آپ مجھے اپنی شاعری کے بارے میں بتا رہے تھے مجھے سمجھائیں کہ آپ کس طرح لکھ لیتے ہیں؟ کیا واقعی یہ کوئی آمد وغیرہ کا چکر ہوتا ہے۔ یا کوشش کر کے آمد والا موڈ بنایا جاتا ہے۔“

”دونوں کام ہی ہوتے ہیں۔“ بادی نے کہا۔ ”اپنی مرضی سے لکھا جائے اور اپنی خواہش کے ساتھ تو پھر آمد ہوتی ہے۔ ورنہ دیہاڑی دار مزدور کی طرح زور لگانا پڑتا ہے۔“

”تو پھر آپ کبھی کبھی لکھا کریں؟“

”بڑی بھولی ہیں آپ۔ کبھی کبھی لکھیں گے تو پھر معاہدہ بھی کبھی کبھی ہی ملے گا اور زندگی تو ہر روزی سے تقاضوں کے ساتھ آن گھڑی ہوتی ہے۔ پردیش لکھاریوں کو آمد جسے حساب سے نہیں خرچے کے حساب سے لکھنا پڑتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ اپنی کوئی ایسی چیز سنائیں جو آمد والی ہو۔“ اس نے پھر موضوع بدلا۔

”نہیں۔۔۔ اس وقت موڈ نہیں۔“

”موڈ بنالیں؟“ آپ کی ایک پڑستار آپ سے فرمائش کر رہی ہے بنگالہ انتہا۔“

بادی کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے تحت اللفظ میں اپنی ایک آزاد نظم سنائی اس نظم میں ایک پہاڑی لڑکی کا ذکر تھا۔ وہ شبنم کی طرف شفاف اور جھرنوں کی طرح الہ تھی۔ وہ چیز کے بلند و بالا درختوں کے نیچے کھڑی ہو کر روزانہ کی راہ دیکھتی تھی۔ اسے ایک خط کا انتظار تھا۔ یہ خط کس نے لکھا تھا؟ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ کہاں سے آتا تھا یہ بھی پتا نہیں تھا۔ یہ کہیں سے بھی آ سکتا تھا۔ جنوب کے سرسبز میدانوں سے شمال کے بلند ترین بریلے پہاڑوں سے یا مشرق کی نیلی جھیل سے مغرب کی کسی بے نام ہستی سے، مگر اسے یقین تھا کہ وہ خط ضرور آئے گا۔ کہنے والا اس کے نام ضرور لکھے گا اور دو روز ذرا کیے کی راہ دیکھتی تھی۔

”زبردست۔۔۔ زبردست۔“ نظم ختم ہوئی تو علیز نے دل کھول کر داد دی اور ہاتھ دتانی بجاتی۔

کشتی کے پینڈل چلا چلا کر وہ ذرا بانپ گئی تھی۔ بادی نے اسے پینڈل چلانے سے روک دیا اور خود ہی کشتی کھینے لگا۔ اس نے مسنونیت سے بادی کی طرف دیکھا۔ اس کے بالوں کی چند ٹیس آڑ کر بادی کے چہرے سے نگرانی اور اس کی حس شام کے ساتھ ساتھ پورے جسم نے خوشبو کی لہر محسوس کی۔ علیز نے جلدی سے شریر لٹوں کو پیچھے بنایا اور کانوں کے پیچھے اڑسا، جیسے وہ لٹیں نہ ہوں۔ شریر بچے ہوں جو اس کی مرضی کے خلاف اٹھیلیاں کر رہے ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد ان کی پینڈل بوٹ کنارے لگ گئی۔ بادی پہلے اترا پھر علیز کو اتارنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔ وہ ذرا جمبکی پھر بادی کی آفر قبول کر لی۔ پھول جیسے نرم ہاتھ کے لمس نے بادی کا دل بے طرح دھڑکا

"انہیں میری ہر بات ہی نرمی لگتی ہے۔ میرے والدین ڈھاکا میں رہتے ہیں۔ اگلے مہینے مجھے ان کے پاس جانا ہے اپنے بچپن کے لیے کچھ چیزیں بازار سے لے کر آئی تھی۔ بس اسی بات پر ان کو فضا آگیا کہ میں نے اپنے مینے والوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ مجھ سے بہت سخت بولنے لگیں۔ میرے ماں باپ کو گالیاں دیں۔ میں نے بس اتنا کہا کہ وہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں انہیں کیوں نہ اگتے ہیں۔ میں آپ کے سامنے ہوں، میرے ساتھ جو چاہے کر لیں بس اس بات پر اور ہلکا نہیں۔ کہنے لگیں میں آنے نہیں گھر سے نکال کر ہی چھوڑوں گی۔ دھکے دیئے۔ میرا پاؤں سڑ گیا۔ مجھے بالوں کے پھینکنے کی ہمت نہ آئی۔ میں نے بہت مدت کی لیکن مجھے باہر نکال دیا۔"

علیہ کا چہرہ لال جھسکا ہوا تھا۔ ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم چاہو تو ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ جنہیں گھر واپس لے جاتے ہیں۔ تمہاری "مدد" لانا سے بات کرتے ہیں۔ انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ بے نیکی غیر موجودگی میں تمہیں رات کے وقت اس طرح نکالیں۔"

"نہیں..... وہ نہیں مانیں گی اور زیادہ غصے میں آئیں گی۔ میرے ساتھ مار پیٹ شروع کر دیں گی۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟" علیہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میری ایک فریڈ ہے یہاں پاس ہی "ڈورز برگ" میں۔ میں وہاں چلی جاؤں گی ایک دو دن وہاں رہوں گی۔ پھر توفیق آجائیں گے۔ توفیق میرے شوہر کا نام ہے میری ساس کو چاہے اور توفیق کو بھی کہ جس گھر سے نکل کر کہاں جاؤں گی۔"

"تو پھر تم فریڈ کی طرف کیوں نہیں جاتی یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" ہادی نے سوال کیا۔

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "بس اپنی بے بسی پر رونا آ رہا ہے۔ میرے پاس نیکی کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ میں ان کے اپنے ساتھ نہیں لاسکی۔"

علیہ، ایسے کی بھرپور مدد پر آمادہ تھی۔ اس نے اسے اٹھایا اور کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلے۔ وہ اسے اس کی فریڈ کے گھر تک چھوڑ کر آئیں گے۔

ایسے نے پہلے تو انکار کیا پھر علیہ کا اسرار دیکھ کر مدد لینے پر آمادہ ہو گئی۔ پاؤں کی چوٹ کے سبب اس سے چلنا محال ہو رہا تھا۔ علیہ نے اسے ایک طرف سے سہارا دے کر چلنے میں مدد دی۔ وہ قیوں اس تنگ سڑک پر چلتے ہوئے مین روڈ پر آ گئے۔ کچھ دیر بعد ایسے کا پاؤں گرم ہو کر رواں ہو گیا اور وہ سہارے کے بغیر خود ہی قدم اٹھانے لگی اس مرتبہ وہ ایک وائر نیکی یعنی چھوٹی کشتی پر بیٹھے۔ اس نیکی پر بیٹھنے کا یہ بادی کا پہلا اتفاق تھا۔ آبی راستے یعنی ونس کی نہریں، سڑکوں کی طرح تھیں۔ بڑی سڑکوں سے بظنی سڑکیں نکلتی تھیں اور پھر تنگ آبی نکلیاں تھیں۔ ٹریفک ویسے ہی رواں تھی جیسے پختہ سڑکوں پر ہوتی ہے۔ تفریحی بجز، بڑی بڑی آبی بسیں، آبی نیکیاں چھوٹی بڑی لائنیں اور بالکل چھوٹے ڈونٹے جن پر دو یا تین افراد سوار ہوتے تھے۔

ایسے بیکسر خاموش تھی۔ وہ بار بار اپنی ساڑھی کے پلو کو درست کرتی اور ہال سینتی تھی۔ علیہ کا دل جیسے اس کے لیے درد سے بھرا ہوا تھا۔ بادی کو لگا کہ اگر اس وقت ایسے کو کسی دوسرے شہر بھی لے جانا پڑتا تو شاید علیہ آمادہ ہو

جاتی۔ وہ بار بار ایسے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی جیسے اسے سمجھانے اور حوصلہ دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ جلد ہی وہ ایک سٹاپ پر پہنچ گئے۔ نیکی کا کرایہ علیہ نے ادا کیا پھر وہ پختہ سڑک پر چلتے ہوئے ایک رہائشی نگلی میں داخل ہوئے اور ایک سڑ منزل عمارت کے سامنے جا کر رُک گئے۔ ونس شہر کی بیشتر عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی قدیم طرز تعمیر کی تھی۔ تاہم دیگر عمارتوں کی طرح اس کی بالکونیاں بھی پھولوں سے سجی ہوئی تھیں۔ ایسے نے دو تین بار ڈور بیل بجائی آخر پہلی منزل کی ایک کھڑکی میں روشنی نمودار ہوئی۔ کسی نے سر نکال کر باہر دیکھا پھر تیزی سے بند کر دیا۔ علیہ نے گھبراہٹ سے بند دھکا کر دیا تھا۔ اپنے طبقے سے بھی وہ انڈین نظر آتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ایسے اس سے پلٹ گئی اور رونے لگی۔

"کیا ہوا ایسے! کیا پھر لڑائی ہوئی؟" ایسے کی سہیلی نے انگریزی میں پوچھا۔

ایسے نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا۔

"بے رحم عورت!" ایسے کی سہیلی نے ڈھکی آواز میں کہا۔ پھر ایسے کی کمر سہلاتے ہوئے بولی "اور وہ توفیق کہاں ہے؟"

"وہ باہر ہیں۔" ایسے نے مختصر جواب دیا۔

نور ادرار کی اب ہوائی نظروں سے بادی اور علیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایسے نے مختصر لفظوں میں اسے بتایا کہ ان دونوں نے اس کی مدد کی ہے اور نیکی کا کرایہ دے کر اسے یہاں لائے ہیں۔ نور ادرار نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اس نے علیہ کو کرایہ دینے کی بھرپور کوشش کی جو اس نے ناکام بنا دی۔

وہ دونوں ان دونوں سہیلیوں سے رخصت ہو کر ایک بار پھر روشنیوں سے بھنگاتے ونس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن اب علیہ کے موڈ میں وہ پہلے غصے کی شوقی اور پھر تنگ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ابھی بھی ہی وائر نیکی میں بیٹھی اور دلوں کی سڑک کی طرف چل دیئے۔

بادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "علیہ! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ عورت ہی عورت کا نڈا سوچتی ہے۔ وہ جب بڑی یا بہو ہوتی ہے تو خود پر ہونے والی سختیوں کا رونا روتی ہے لیکن جب بڑی عمر میں اختیار حاصل کر لیتی ہے اور ماس وغیرہ بن جاتی ہے تو وہی گنتی ہے جسے وہ ظلم قرار دیتی تھی۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔" علیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ ابھی تک ایسے کے ڈکھ میں الجھی ہوئی تھی۔

"شاید یہ چکر ہمارے معاشرہ میں زیادہ ہے۔ یعنی بے سحر میں۔" بادی نے کہا۔

"وہی کچھ کا معاملہ ہے۔ ہمارے ملکوں میں عموماً بے سحر کے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوتی۔ اسے پاؤں کی جوتی ہی سمجھا جائے گا۔ کبھی نہ بے سحر کے نام پر کسی رسم و رواج کے نام پر اور کبھی رشتوں کے جکڑ بند سے اسے لاجا کر لیا جاتا ہے گا۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

وہ واپس نئی سیئر پہنچے اب رات کا تیسرا پہر چل رہا تھا مگر گردش کی رونق میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آیا تھا۔
فضا میں موسیقی کی لہریں تھیں اور روحانی مناظر پانی میں اور کناروں پر بکھرے ہوئے تھے تاہم اس لڑکی ایسے والے
وانتے کے بعد ہادی کو طیلو اس میں وہ خوشی اور تریک نظر نہیں آئی۔ ان دونوں نے ایک دو تقریبات میں حصہ لیا۔ ایک
جگہ سے چیزا لے کر کھایا۔ پھر ہادی نے محسوس کیا کہ طیلو اب واپس جانا چاہتی ہے۔ وہ ایک دم خالی خالی سا ہو گیا۔
یہ لڑکی چند گھنٹوں میں ہی اس کے لیے خاصی اہم ہو گئی تھی اور اب وہ جانا چاہ رہی تھی۔

"کیا دوبارہ ملاقات ہوگی؟" ہادی نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

وہ ہچکے پن سے مسکرائی۔ "اگر آپ چاہیں گے تو ہو جائے گی۔"

ہادی نے جرأت کر کے کہا۔ "میں تو اس ملاقات کو اتنا لمبا کرنا چاہتا ہوں کہ تین چار ہفتے ہنسی خوشی گزر
جائیں۔"

"خیر ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ برسوں تو مجھے ویسے ہی واپس ملے جانا ہے۔"

"تو پھر جانے سے پہلے کب آئیں گی آپ؟"

"کل دو پہر کو چکر لگا لوں گی آپ کی طرف۔ میں نے کیپ دیکھ لیا ہے اور آپ کا خیمہ بھی؟"

"یہ میرا اسلیم نمبر بھی لے لیجیے۔ اگر کوئی کنفیوژن ہو تو۔۔۔"

"تو سنیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے سب یاد ہے۔ میں گیارہ سو گیارہ بجے تک پہنچ جاؤں گی۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ معلومات کی طرح وہ سیل نمبرز کا تبادلہ بھی نہیں چاہتی ہادی نے فی الحال اصرار مناسب
نہیں سمجھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ شیشہ صفت لڑکی ہے ذرا سے دباؤ سے جھٹکا کے سے ٹوٹ جائے گی۔ وہ اسے کسی بھی
طرح دوبارہ ملنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کنت آتا تھا تو خود ہی آتا تھا۔

بڑے بس اسٹینڈ کے قریب وہ اس سے زکھت ہو گئی۔ جاتے جاتے وہ مڑی اور بولی۔ "صبح اپنی پٹی بدل
لیجیے گا۔" طیلو نے نہ ہو جائے۔

ہادی نے انہماک میں سر ہلایا۔ طیلو کی فکر بندی کی یہ اوا اسے بھلی لگی اور اس کے دل میں امید جاگ اٹھی کہ وہ کل
ضرور آئے گی۔

عام نیکی اور آبی نیکی کے گراہے ہوئے رہا تھا۔ خواہ وہ ذرا مبادلہ ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہادی پیدل
نیو نیو یا کیپ پلیس کی طرف روانہ ہو گیا۔ قریب آدھ گھنٹے کے بعد وہ اپنے خیمت کے اندر تھا۔ وہ چٹائی پر لیٹ گیا اور
خیمت کی تھوڑی چھت کو گھورنے لگا۔ اس کی نگاہیں بار بار طیلو کی شبیہ بھر رہی تھی۔ اس کی روشن پیشانی جو اس
کی دانتیں مسکراہٹ کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ کوئی خاص بات تھی اس معرہ صفت لڑکی میں۔ ورنہ وہ اس طرح کسی کے
بارے میں سوچنے والا تو نہیں تھا۔ اس نے اپنا نام طیلو اپنا لیا تھا۔ پتا نہیں یہ نام بھی درست تھا یا نہیں۔ وہ سوچتا رہا نہ
جانتے اسے کب تھا کٹ کے سبب پیدا ہوئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو دن کا جڑا آیا تھا۔ ونچر یا کیپ میں سرخ و پیلا جوڑوں کی چٹل پہل تھی۔ زیادہ تر نوجوان

"میرا حال تھوڑی بہت تبدیلی تو اب نظر آتا شروع ہو گئی۔ یہ طیلو! لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج عام ہو رہا ہے۔
وہ گھروں سے نکل رہی ہیں۔ عملی زندگی میں قدم رکھ رہی ہیں۔ بے شک ڈری ڈری ہیں۔ سبھی سبھی ہیں لیکن آگے تو
بڑھ رہی ہیں نا۔"

"ہاں۔۔۔ ایسا ہوتا رہا ہے لیکن رفتار بڑی سست ہے۔ اگر آپ نمائندہ مائیں تو جی یہ ہے کہ عورت کے پاؤں پر
کھڑے ہونے سے مرد کی خاک کھینک کر بزدلی بڑی ہے خاص طور سے ہمارے ہاں کا مرد تو یہی سمجھتا ہے کہ عورت آگے
بڑھنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اس کے پیچھے سے نکلے اور اس کو گھونٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اس عمل کو اپنی مردانگی
کے لیے ایک بہت بڑا پیش قدمی سمجھتا ہے۔ ڈیٹیشن جاتا ہے اور عورت کے ہڈ کاٹ کر اسے بچرے میں
کھینچنے کے لیے اپنے پورے اختیار استعمال کرتا ہے۔"

ہادی نے پہلو بدلنے ہوئے کہا۔ "لیکن طیلو! ہمیں تصور کیا بس ایک رخ ہی تو نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہم بھی تو
دیکھ رہے ہیں کہ جو لڑکیاں یا عورتیں برسر روزگار ہو جاتی ہیں وہ اپنے گھروں کی طرف سے غفلت برتتے نکلتی ہیں۔
اپنے والدین اور شوہروں کو کسی خاطر میں نہیں لاتیں۔ سسرالیوں کو شکستے میں کھینچتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی پوری
ازدواجی زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے۔"

طیلو نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے بالوں کو پونی نیل میں کسا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا سر اچاڑ کر چڑچڑاہٹ نظر ہو
جاتا تھا۔ اس کی شرمت کا گر بیان ہوا میں پھر پھڑا رہا تھا۔ وہ ذرا ٹھہرے لیجے میں بولی۔

"میں اس بات سے انکار نہیں کرتی ہادی صاحب کہ کہیں کہیں ایسا ہو رہا ہے۔ لیکن یہ دونوں طرف سے ہے
کہیں مرد سے زیادتی ہوتی ہے کہیں عورت سے لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اس حوالے سے ایک ابتدائی مرحلے
سے گزر رہے ہیں۔ عورت عملی زندگی میں پہلے پہلے قدم رکھ رہی ہے۔ دوسری طرف مرد کو بھی عورت کی اس آزادی کا
نیا نیا تجربہ ہو رہا ہے۔ دونوں ایڈجسٹمنٹ کے دور میں ہیں لیکن اگر کہیں کوئی خرابی نظر آتی ہے تو اس کا مطلب یہ تو
نہیں کہ ہم تبدیلی کے اس پورے عمل کو ہی لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔ پھر وہی سوچ اپنالیں کہ عورت اور گائے
بکری میں زیادہ فرق نہیں۔ دونوں کا کام بس اپنے مالک کی خدمت کرنا ہے۔ ایذا جان، اپنے گوشت اور اپنی کھال کو
ان کے لیے وقف کرنا ہے اور خدمت کرتے کرتے مر جانا ہے۔"

ہادی خاموشی سے طیلو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے خیالات طیلو اسے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن وہ جان
بو جھ کر اختلافی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے کریدنا چاہ رہا تھا اور اسے اس میں تھوڑی بہت کامیابی ہو رہی تھی۔

دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں ہادی کو اندازہ ہوا کہ یا تو طیلو خود شادی شدہ ہے اور اس کی ازدواجی زندگی میں
تغییاں ہیں، یا پھر اس کی شادی ہونے والی ہے لیکن وہ اپنے ہونے والے شوہر اور سسرالیوں سے مطمئن نہیں ہے۔
اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ طیلو کی کسی بڑی بہن یا قریبی عزیزہ کی ازدواجی زندگی میں جو اور ان تینوں نے طیلو
کے اندر بھی خدشے اور بیزاریاں بھردی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے طیلو اسے اپنی کسی شادی شدہ بہن کا ذکر بھی کیا تھا
جو اب بہت کم ان سے ملتی تھی۔

یہ جتنی وقت کہیں بیٹھ کر مشائخ کرنا نہیں چاہتی تھی۔
 وہ استعمال کی عام چیزیں مثلاً کیمرا، ٹیلی اسکوپ، چھتری اور تھرماس وغیرہ لے کر کیمپ ٹیمس سے نکلے اور
 ہنس کی سڑکوں پر آ گئے۔ علیز اسکے ہاتھوں میں ایک نقشہ بھی تھا جس سے وہ گاہے بگاہے مدد لے رہی تھی۔ گرمی توقع
 سے چھجڑا ہوا تھا۔ موسم کی مناسبت سے علیز انے ٹرے رنگ کی ہاف سلوشنٹ اور سفید چٹون پہن رکھی تھی۔ اس
 کے بال ایک خوبصورت ربن سے بندھے تھے۔ اس کے پاس شرٹ کا ہم رنگ شولڈر بیگ تھا۔ دھوپ کے سیاہ چہرے
 میں اس کے چہرے کی رنگت کچھ اور نکھری نظر آتی۔

ان دونوں نے قریبی سناپ پر پانچ نمبر بس کا انتظار کیا۔ اس میں زیادہ تر سیاح ہی فیسے ہوئے تھے۔ آج چھٹی
 کے دن یہ سب لوگ وٹس کے گلی کوچوں میں آوارہ و مند لانا چاہتے تھے۔ پتا نہیں کیوں آج ہادی ایک ٹین۔ جرز کے
 کی طرح سوچ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آج پھر بس میں بہت رش ہو اور اسے علیز اسکے ساتھ کھڑے ہو کر سفر
 کرنا پڑے۔ ایسی صورت میں وہ علیز کی قربت کو زیادہ شدت سے محسوس کر سکتا تھا۔

ہادی کی یہ جتنا پوری ہوئی اور انہیں ایک دوسرے کے زبرد کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا انہیں کچھ دیر بعد علیز ایک
 انہیں خاتون سے اس طرح باتوں میں مصروف ہوئی کہ آخر تک اس نے ہادی کی طرف رخ نہیں پھیرا۔ وہ اپنے
 آپ میں کوئی شائبہ نہیں پر وٹس کے پرفیوم کی خوشبو علیز اسکے جسم سے اڑاؤ کر ہادی تک پہنچتی رہی۔ بس کی "ٹیک دل"
 لینا ڈرائیور نے بھی شاید ہادی کی اس کڑھن کو محسوس کر لیا۔ سفر کے آخری مرحلے میں اس نے ایک جگہ اتنے زور
 سے بریک پیدل دیا کہ علیز آخری بادی کے اوپر ہی آن گری۔ ہادی چند سیکنڈ کے لیے اس کے جسم کے گداز اور خوشبو
 میں ذوق سا گیا۔ ہادی خود ایک مسکراہٹ خاتون کی آغوش میں گرتے گرتے بچا تھا۔

"دیری سوری۔" علیز انے کہا۔ کھانا ہو رہا تھا۔ (مخاطب ہادی تھا)
 مسکراتی مسکراتی اور علیز کی طرف دیکھ کر شراکت سے بولی۔ "کوئی بات نہیں..... میرے خیال میں تو
 ہادی نے اسے اپنے فریڈ کو تیار کر لیا۔ ادا کرنا چاہیے۔"

علیز کا چہرہ کچھ اور بھی سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکراتی خاتون کے اس
 مذاق کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ لوگ مین بس اسٹینڈ پر اترے اور پھر وہاں سے پیدل ہی ایک
 آبی رنگ کے کنارے کنارے چلے گئے۔ علیز اچک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسی جگہ سے گزرے جہاں کل رات
 بھی وہی لڑکی سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہو سے اس باغیچے کی میز چیاں نظر آئیں جس پر وہ کل شب بیٹھی
 سسکیاں لے رہی تھی۔ علیز ایک دم پھر بھی ہی ہادی نے صاف محسوس کیا اس کی پیشانی کی غیر معمولی چمک کسی
 دھندلے میں کھو گئی ہے۔

ہادی اس کا موزہ مزید خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اسے ہنس کے پاس کوئی بات نہیں کی۔ وہ خود ہی ٹھنڈی
 سانس بھر کر بولی۔ "اللہ کرے وہ خیریت سے ہو اور خیریت سے گھر واپس چلی جائے۔"
 "ہاں اچھی لڑکی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس کے شوہر کو اس کے لیے اسٹینڈ لینا چاہیے۔"

لڑکے لڑکیاں ہی نظر آتے تھے۔ وہ نہانہا کر نکل رہے تھے اور نکل نکل کر نہانہا رہے تھے۔ کچھ ناشتہ کر رہے تھے۔ کچھ اس
 کی تیار یوں میں مصروف تھے۔ ایک علیزہ جگہ صاف سترے پختہ واش روہر بنے ہوئے تھے۔ ہادی نے شیو کی۔ منہ
 ہاتھ دھویا اور فریش ہو کر ناشتہ کرنے کے لیے ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ یہ ریسٹورنٹ اس کے خیمے کے بالکل پاس ہی واقع
 تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے علیز کا انتظار شروع کر دیا۔ کبھی دل کہتا تھا کہ وہ آئے گی، کبھی کہتا تھا نہیں آئے گی۔ اگر
 اسے آتا ہوتا اور ایک دم چھپنا نہ دیتا ہوتا تو کم از کم اپنا کوئی کنٹیکٹ تو اسے دیتی۔

وہ ادھر ادھر کھوٹا چاہ رہا تھا۔ کچھ کچھ خیموں کے اس شہر کا نظارہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ ڈر تھا کہ کہیں علیز انہیں
 خالی دیکھ کر واپس نہ چلی جائے۔

وہ واپس خیمے میں آ گیا اور ادھر ادھر کھڑی اشیاء دوسرے کرنے لگا۔ گاہے بگاہے اس کی نگاہ اپنی رستہ واقع
 کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ پورے سوا گیارہ بج گئے تو وہ کچھ کھانے سے باہر آ گیا۔ یہی وقت تھا جب کوئی اس پر
 جھپٹا اور ساتھ ہی زوردار نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ جگ کر بھاگ گیا اور گھومتے گرتے بچا۔ یہ علیز تھی۔ وہ خیمے کے
 کے پاس ہی موجود تھی اور اس نے ہادی کو کامیابی سے ڈرا دیا تھا۔ وہ اس میں کڑھن کر رہی ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ گھٹا
 تھا۔

ہادی کھسپانے انداز میں ہنسا۔ علیز اسکے ڈرانے پر جب وہ بچھے بنا تو اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے کمر لگایا
 تھا۔ اس کی زخمی کلائی پھر دکھ گئی۔ اس نے ذرا تکلیف محسوس کی۔ علیز انے فوراً یہ بات نوٹ کی۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو
 گئی۔

"اوہو....." اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ہادی کی کلائی پر جھک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہادی
 کا ہاتھ دیا۔ "اوہ..... سوری ایم ویری سوری..... میں نے آپ کی کلائی دکھا دی۔ تکلیف ہو رہی ہے آپ کو؟"
 "نہیں..... کچھ زیادہ نہیں۔" ہادی نے کہا۔

"ویسے آپ بہت نرمے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ سویرے سب سے پہلے یہ پنی بدلیں۔ یہاں
 ہوا میں رطوبت ہوتی ہے۔ انفیکشن کا خطرہ ہو سکتا ہے۔"

وہ ہادی کو کھینچ کر خیمے کے اندر لے آئی۔ خیمے کی ایک پاکٹ میں مرہم پنی کا سامان موجود تھا۔ اس نے فوراً پنی
 کھولی۔ وہ ذرا چٹنی ہوئی تھی۔ ہائیڈروجن کے استعمال سے اس نے پنی کو زخم سے علیحدہ کیا۔ پھر کانٹن کے استعمال
 سے اچھی طرح زخم کو صاف کیا اور آئینٹ لگا کر دوبارہ پنی باندھ دی۔

یہ کام اس نے بڑے اطمینان سے کیا۔ اسنے اطمینان سے کہ اسے ہادی کے چہرے کے بدلے ہوئے حادثات
 کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ علیز کا لکس، اس کا محبت بھرا انداز اس کی فکر مند کی، یہ سب کچھ مل کر ہادی پر عجیب سا اثر کر رہا تھا۔
 پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں ہادی کا دل چاہا کہ اس کا زخم شدت میں زیادہ ہوتا اور وہ دیر تک بند خیمے میں اسی طرح
 اسے اپنی آنکھوں کے مہربان کس سے فوڑتی رہتی۔

ہادی نے اس کے لیے ناشتہ منگوا چاہا لیکن اس نے بتایا کہ وہ ناشتہ کر کے گھر سے چلی تھی۔ کیونکہ سیر و تفریح کا

رقت کھو مٹا کیسا لگے گا۔“

دو کچھ دیر گہری فکروں سے اسے دکھتی رہی۔ تب اس نے نچلا ہونٹ بولے سے دانتوں میں دبایا اور اس کی پیشانی پر مسر اسٹہ ٹھکی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کو نہ لگا ہے۔"

”کیا نرا لگا ہے؟“ ہادی کا دل دھڑک اٹھا۔

”یہی جو میں نے آپ کو فوٹو بنانے سے منع کر دیا۔“

ہادی نے انگلیاں چلا کر اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور دور پانی پر ڈالنی خوش رنگ کشتیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "نہ انہ ماہیے کا۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں کوئی گرو کنت ہوں اور میرے ساتھ چلتے ہوئے آپ ہر وقت اپنی جیب پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔"

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”وہی جو آپ کھڑی ہیں۔ آپ کو اپنے بارے میں کچھ بھی بتانا پسند نہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ
میں آپ کی کے ساتھ نہیں ایک کیلی کے ساتھ چل چھڑا ہوں اور یہ کیلی میرے ذہن کو ہر وقت تباہ میں رکھ رہی
ہے۔“

اس نے ہونٹ مسکڑے "تو آپ میرے ساتھ نہیں ایک "تناؤ" کے ساتھ گھوم پھر رہے ہیں۔"

"ایسا ہی مجھ کو لگتا ہے"

”تو پھر اس شاؤ کا کیا عمل ہوگا؟“ اس کا لہجہ اس بات تھا۔

”جوں جوں وقت گزرے گا یہ تازہ ہو جیتا جائے گا۔ بہتر ہے کہ اسے حیدر نہ بڑھایا جائے۔ اگر آج اکیلے

مکھنڑا پھرنا حاقق ہں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اسی نے نور سے ہادی کو دیکھا۔ کچھ دیر چپ رہی پھر بولی۔ "ٹھیک ہے ہادی صاحب اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو پہلے جائیں۔"

بانی کے مرنے پر غمناک سا لگا۔ لیکن اب تو تیر کمان سے اٹھل ہی چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ "اب یہ" خوبصورت
 مانتا تو اسے آغا فانا چھوڑنا پڑے گا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "اور آپ؟"

”میں ابھی یہیں رکوں گی۔ اسی لیے یہاں چھاؤں ہے اور ہوا بھی آ رہی ہے۔“ اس کا لہجہ اجنبیت لے کر تھا۔

وہ چہرے کی خاموشی کے بعد گویا ہوا: ”نیک ہے میں بہت مشکور ہوں کہ آپ نے کچھ اچھا وقت گزارنے کا موقع دیا“ اور مجھے یہاں کا سب کچھ دکھایا۔

نر بادی کا خیال تھا کہ وہ سچو بولے گی تو اسے نہیں بھاریں گے۔

ہادی نے دہنا شولڈر بیک کندھے سے جھلایا، کسرا اٹھایا، دو تین اچھڑکی کھلتا ادا کیے اور میل پڑا۔ جتنا نہیں
 گھلی ہادی کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے تو آواز دے گی، بلائے گی۔ لیکن اس نے آواز نہیں دی۔ وہ چلا آیا۔ چند رہے

”دل تو جانتا تھا کہ پھر اس سے ملیں لیکن اب اتنا وقت ہی نہیں ہے۔“ وہ اپنی رست و اچ دکھیہ کر بولی۔

ہادی نے اس کی جانید کی۔ اب وہ ایک کشادہ منہ کے کنارے تھے۔ اس کو دیش کی شاہراہوں میں سے ایک شاہراہ کہا جاسکتا تھا۔ یہاں بڑی بڑی آبی بنس اور بجرے وغیرہ تیر رہے تھے۔ وہ مشہور زمانہ کشتیاں بھی تھیں جنہیں گنڈولایا ونیز انکسی کہا جاتا ہے۔ انہیں ایک لمبے چو سے چلایا جاتا ہے۔ چلانے والے نے ایک خاص دھاری وار شرٹ اور سیٹ زیب تن کر رکھا ہوتا ہے۔ ان ونیز انکسیوں یا "گنڈولاز" کا کرایہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لہذا ہادی اور علیز ان کی طرف رخ نہیں کیا۔ علیز انے بتایا کہ دیش کا مقبول ترین ذریعہ آمد و رفت ACTV سروس ہے۔ اس سروس میں چھوٹی بڑی کشتیاں اپانی کی بنس اور کرائے پر دی جانے والی کشتیاں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے بھی ACTV کی ایک بس کے ذریعے ہی سفر کیا اور بالٹو کے کچھ فاصلے پر اتر گئے۔ نہروں کا جال تھا اور ان پر بحرانی پل بنے ہوئے تھے۔ یہاں لوگوں کا اثر و حام تھا۔ کئی لوگ سارا بھارہ تھے۔ بہت سے کھاپی رہے تھے۔ یہاں وہاں بے فکر نولیوں کی شکل میں بیٹھے دلچسپ معروضات اپنائے ہوئے تھے۔ سامنے ہی دو نوجوان دوست ایک دوسرے کی میز جیوں پر بیٹھے تھے ان کے گرد کچھ قاشانی موجود تھے۔ دونوں دوست شرملا کا کرکھیل رہے تھے۔ کھیل یہودہ کیوں دلچسپ تھا۔ وہ دونوں تھوک رہے تھے اور دیکھنا یہ تھا کہ کس کا تھوک زیادہ دور جاتا ہے۔

علیز نے نہ اسامہ نہ بتایا۔ وہ چلتے رہے اور تصویریں کھینچتے رہے۔ بھی علیز اٹا، لی کی تصویر کھینچی بھی وہ اس کی۔ لیکن دونوں کی تصویریں ان کے اپنے اپنے کمروں میں تھیں۔ دونوں کی اکٹھے کوئی تصویر نہیں تھی۔ ایک مرتبہ بے خیالی میں ہادی نے اپنے کمرے سے علیز کی تصویر کھینچنا چاہی، تو وہ ایک دم بدک سی گئی۔ "نو۔۔۔ نو۔۔۔ نو۔۔۔" تو اس نے ہنسنے ہوئے کہا اور رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

”سوری۔“ ہادی نے کہا اور ایک دم بجھ سا گیا۔

”فروٹ کھائیں گے؟“ کچھ آگے جا کر علیزائے بادی کو آخر کی اور پھر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک ریزمی کی طرف لپک گئی۔ اس خوبصورت ریزمی پر شیشے کا بڑا ایکس تھا اور اس میں مختلف قسم کا کٹا ہوا پھل پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے گھاسوں میں بھرا گیا تھا۔ چند کھڑے سیب کے، چند خربوزے کے، تھوڑی سی ناشپاتی، تھوڑا سا تر بوڑ، دو چار دانے کالے انگور کے۔ ایک چھوٹا گھاس ڈھائی پور میں آیا۔ سالم پھل کے مقابلے میں یہ کافی مہنگا تھا۔ علیزائے نے ایک گھاس بادی کو تھما دیا۔ بادی نے تھوڑا سا کھایا۔ پھر ہاتھ روک لیا۔ گھاس ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ دو سامنے کھڑے غبارے والے کی طرف متوجہ تھا۔ بہت بڑے بڑے رنگ برنگے غبارے تھے۔ خریدار بچے اور مرد و جمع تھے۔

”کیا بات ہے؟ آپ کھائیں رہے؟“ علیز نے ادا سے پوچھا۔ ”کیا اچھا نہیں لگا؟“

”اچھا تو ہے..... لیکن ذرا ٹھہر کے کھاؤں گا۔“

”کیا بات ہے۔ آپ چپ سے ہو گئے ہیں؟“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”کوئی خاص بات نہیں..... بس سوچ رہا تھا کہ کل آپ تو ملی جائیں گی۔ میں اکیلا یہاں کھوم رہا ہوں گا۔ اس

”آپ خواتین کی بہت ہے بھی بازاروں میں تھکن سے بے ہوش ہو جاتی ہیں لیکن ہوش میں آنے کے بعد پھر نشہ شروع کر دیتی ہیں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لڑکی کا ذکر بھی نہیں کیا جس سے وہ ابھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کچھ بھی بولی نظر آ رہی تھی ہادی نے بھی کرید نامناسب نہیں سمجھا۔

وہ دونوں ریالٹو کی بارونق وسعت میں گھومنے لگے۔ وہ ایک بڑی سی قدیم ہندو گم کے سامنے بیچ پرزک گئے۔ یہ انہی دنوں کے زمانے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہاں ریالٹو کی تاریخ زبان انکس دیواروں پر کندہ تھی۔ وہ گھومتے رہے اور مختلف آثار دیکھتے رہے۔ ساتھ ساتھ تھوڑی بہت گفتگو بھی ہوتی رہی۔ اس گفتگو سے صرف اتنا پتا چلا کہ علیزاروم میں (جسے وہ روماکہ رہی تھی) شمالی جانب Cassia نامی کسی علاقے میں رہتی ہے۔ ہادی نے تنصیب پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ تفصیل سے بات کرنے کا وعدہ تو علیزاروم کی کرپٹی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کسی نہ سکون جگہ پر بیٹھ کر سچ کریں گے اور باتیں بھی لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت ہادی کو لگتا تھا کہ وہ تذبذب میں ہے۔ جیسے سوچتی ہو کہ وہ بالکل کرے یا نہیں۔

یہاں پاس ہی کہیں تاریخی نوعیت کی مچھلی مارکیٹ بھی تھی۔ شور و غیرہ تو سنانی دے رہا تھا اور مچھلیوں کی باس بھی محسوس ہوتی تھی مگر مارکیٹ نظر نہیں آئی۔ وہ ویش کے قدیم وید کشش گلی کو چوں میں گھومتے رہے۔ چکراتے رہے اور پھر ”مارکو“ کی طرف بھل آئے اس قدیم عبادت گاہ کی کشش نے علیزاروم کی ساری توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ وہ اس عبادت گاہ پر گھر رہی تھی اور انہی چپکے چپکے اس کا۔ وہ کسی بچے کی سی بے مہارت رنگ کے ساتھ ان درو دیوار میں کھولتی تھی۔ ہادی کا دل چاہا کہ وہ چپکے چپکے اس کی ایک تصویر بنا لے اس نے اپنے گلے میں آویزاں کمرے کا زرخ غیر محسوس طور پر علیزاروم کی طرف کیا اور بہن و بایا۔ علیزاروم میں تھا اس لیے علیزاروم کو کچھ نہیں ہوئی۔ بہر حال یہ ایک دلکش تھا۔ علیزاروم چل جاتا تو خبر نہیں کہ اس کا رومل کیا ہوگا۔ ہادی کو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ تصویر کیسی آئی ہوگی اور آئی کی ہوگی یا نہیں۔ لیکن وہ دوبارہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

علیزاروم نے کہا: ”آپ کو پتا ہے اس جگہ کا پورا نام کیا ہے؟“ ہادی نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولی (Besilica of San Marko) اور جو سامنے ہے جہ نظر آ رہا ہے اس کی تعمیر 828ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر کی کہانی بھی بڑی مزیدار ہے۔ آپ نے سنی ہوگی ہے؟

”نہیں۔“

”اے... مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ آج محسوس پر اپنی باندھ کر ویش میں محکوم رہے ہیں۔ بندہ خدا جس شہر کی سیاحت فرمائی ہو پہلے اس کے بارے میں تو ذرا بہت پڑھنا چاہیے۔“

”آئندہ خیال رکھوں گا میم!“ ہادی نے کہا۔ حالانکہ وہ گھٹا چاہتا تھا کہ وہ انکسوں پر اپنی تو آپ کی وجہ سے بندھ گئی ہے پھر۔

وہ مسکرائی اور بولی: ”مارک نام کے بہت بڑے عیسائی بزرگ تھے۔ روایت کے مطابق وہ اسکندریہ میں رہتے

اپنے چہرے کے سامنے ہلایا اور بولی۔

”میں خود کو ایک دم میڈان چاہتا محسوس کر رہی ہوں۔“

”آپ کے محسوس کرنے سے کیا ہوگا۔ آپ ایسی ہیں ہی۔“

ان تعریفی کلمات پر وہ ہلکھلا کر ہنس دی لیکن اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔ غالباً اس موضوع کو مزید طول دینا نہیں چاہتی تھی۔

بازار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ تک گئے تھے۔ ایک جگہ پتھر لے بیچ پڑے نظر آئے۔ یہاں چھوٹے بھی تھے۔ وہ بیٹھ گئے اور اس کریم کھانے لگے۔ علیزاروم کو یاد آیا کہ اسے اپنی ایک بھانجی کے لیے ایک خاص طرح کا دسی پنکھا لینا ہے۔ وہ آنکھ کر دو بارہ شاہنگ مال کی طرف بولی گئی۔ ہادی وہیں بیٹھا آتے جاتے ہوئے گھوم رہا تھا۔ اس بازار کو دیکھ کر اسے ”انارکلی“ جیسے پاکستانی بازار یاد آئے۔ جو ہر قسم کے سامان سے بھرے رینج ہیں۔ لوگوں کے آگے شال اور سالوں کے آگے ٹیلی۔ شاہنگ مال کی نسبت یہاں اچھا مناسب دامنوں میں رہی ہیں۔

علیزاروم کو گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کی چھتری کیمرا اور شاہنگ والا لگا ہوا بھی ہادی کے پاس ہی پڑا تھا۔ ”کہاں چلی گئی؟“ ہادی نے سوچا۔

چار پانچ منٹ مزید انتظار کرنے کے بعد وہ اشیاء سمیت کراچی جگہ سے اٹھا اور اپنی شاہنگ مال کی طرف بڑھا۔ ایک دسی پنکھے کے لیے اس نے اتنی دیر لگا دی تھی۔ ابھی وہ چند روپے قدم ہی چلا تھا کہ اس کی نگاہ علیزاروم پر پڑ گئی۔ وہ بازار کے سوز پر موجود تھی۔ شاہنگ بازار کے ایک گول ستون کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اس کے پاس اس کی ایک ہم عمر لڑکی تھی۔ لڑکی نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ درمیانی شکل و صورت کی تھی بلکہ تھوڑی سی رملات۔ ساتھ قبول صورت بھی کہی جاسکتی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی کھڑی لمبی ناک تھی۔ وہ دونوں ہاتھ ہلکا کر آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ علیزاروم نے دو تین بار تیزی سے انکار میں سر ہلایا۔ پھر لمبی ناک والی لڑکی نے اپنے شلوار قمیص میں سے کوئی چیز نکالی اور علیزاروم کو تھما دی۔ یہ کوئی کاغذ تھا۔ علیزاروم نے اسے احتیاط سے اپنے بیک کے اندرونی خانے میں رکھ لیا۔

علیزاروم کا کافی جلدی میں لگتی تھی۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ اب اسے خدا حافظ کہہ کر واپس آنے والی ہے۔ ہادی بھی واپس مڑا اور پتھر لے بچوں کی طرف چلا آیا۔ پاس ہی ڈیکوریشن پیرز کی ایک شاندار دکان تھی۔ وہ اس کے ”ڈسپلے“ میں جھانکنے لگا۔

اسی دوران میں علیزاروم واپس آگئی۔ ”ہیلو ہائی صاحب! آپ کیا کر رہے ہیں؟“

ہادی نے جو کتنے کی اداکاری کی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”بھئی بڑی دیر کر دی آپ نے دسی پنکھا خریدنا تھا یا ایئر کنڈیشنر؟“

وہ پچھلے انداز میں مسکرائی۔ ”خرید تو پنکھا ہی ہے لیکن جیسا چاہتی تھی ویسا نہیں ملا۔“ اس نے جائیزہ طرز کا ایک چمکی بھر پنکھا ہادی کو دکھایا۔

بوتھیں موجود تھیں۔ "ابھی آیا" ہادی نے کہا اور اُنھ کھڑا ہوا۔

سڑک پار کر کے وہ جنرل سنور تک پہنچا۔ منزل وافر کی دو بوتلیں لیں دو جوس لیے اور بسن کی چٹنی جو چیزا کے ساتھ بہت اچھی لگتی تھی۔ جب دو کاؤنٹر پر ادا کی گئی کرنے لگا تو کیش مشین میں کچھ خرابی ہو گئی۔ مشین کے ٹھیک ہونے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ ہادی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ کاؤنٹر پر اس کا نمبر چوتھا تھا اور اگلی کر کے اور سڑک پار کر کے دو چیزا شاپ میں داخل ہوا تو ٹھیک گیا۔ علیز امیز پر نہیں تھی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ شاید واش روم تک گئی ہوگی۔ مگر جب وہ صیان سے دیکھا تو اس کے سینے میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ علیز اکا شولڈر بیگ جو میز پر رکھا تھا وہاں نہیں تھا۔ نہ ہی کمراندہی وہ شاہز جن میں اس کی شاپنگ موجود تھی۔ فقط ہادی والا شولڈر بیگ اور شاہز ایک خالی کرسی پر موجود تھے۔ "تو وہ چلی گئی؟" یہ خیال ایک زہریلے تیر کی طرح اس کے سینے میں پوسٹ ہو گیا۔

وہ تیزی سے مڑا۔ چیزا شاپ سے باہر آیا۔ فٹ پاتھ پر دائیں بائیں دور تک دیکھا۔ قریبی دکانوں کے اندر جھانکا۔ دو کیش مشین تھیں۔ تب وہ دوبارہ چیزا شاپ کی طرف پلٹ آیا۔ دل میں امید تھی کہ شاید وہ دوبارہ میز پر موجود ہو اور سڑک پار کر کے وہاں آئے ہوئے کہے۔ سامنے گفٹ شاپ تک گئی تھی۔

مشین وہ نہیں تھی۔ کیش مشین تھی۔ وہ شاید جا چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ ہادی کو شدید تذبذب میں دکھائی دی تھی۔ ابھی گفٹ شاپ تک ایک قریبی دوست کی طرح سب کچھ ہادی سے گوش گزار کر دے گی، کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کچھ نہیں بتائے گی اور یونٹی پہلو پر کھڑی رہے گی۔ اپنے خشک لیوں پر زبان پھیرتی رہے گی۔ پہلا امکان درست ثابت ہوا تھا۔ اسے متعلقہ ملا تھا اور وہ اچانک چلی گئی تھی۔

ہادی قریب ایک گھنٹہ تک وہیں بیٹھا رہا۔ کچھ سے سائز کا اٹالین ویزا آ گیا جس پر "موسلی" کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں بسن کی چٹنی بھی موجود تھی۔ مگر اب ہادی کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے چند لقمے لیے اور علی کے باہر آ گیا۔ ابھی بھی امید کی مہووم کرن باقی تھی۔ شاید وہ لمبی ٹاک والی دراز قد فرینڈ اسے پھر مل گئی ہو اور وہ اس سے ساتھ فوراً کھینچ جائے پر مجبور ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ دوبارہ یہاں آئے۔ چیزا شاپ سے نکلنے کے باوجود وہ زیادہ دیر نہیں گیا۔ وہیں ایک پاتھ پر بھلتا رہا اور دکانوں میں جھانکتا رہا۔ شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ چھپنے والے کس اب نئے زاویے سے دیکھ رہے تھے۔ سورج کی ترجمانی کر رہی تھی۔ آبی شاہراہوں پر اشرافیاں سی نکھر رہی تھیں۔ ہادی تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹا ہوا۔ رات 8 بجے تک وہ اپنے کمپ میں واپس پہنچ چکا تھا۔ لاشیہ کی چٹائی پر چٹ لیت گیا اور علیز کی اس عجیب حرکت پر غور کرنے لگا۔ اسے علیز اسے انکی بد مہندی اور کج روی کی توقع نہیں تھی۔ اگر وہ کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی تو بھی صاف لفظوں میں ہادی سے کہہ سکتی تھی۔ ایسی صورت میں وہ ایسے طریقے سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ پاتے۔ انجان چیزوں کے حوالے سے انسان زیادہ کشش محسوس کرتا ہے۔ علیز بھی ایک انجان ہستی کے طور پر اس کے سامنے آتی تھی۔ لیکن یہی اس موقع پر جب وہ انجان سے شناسا ہونے والی تھی اسے اپنے بارے میں کچھ بتانے والی تھی، وہیں نے اسے "ہزپ" کر لیا تھا۔

تھے۔ ایک فرشتے نے سینٹ مارک کو بتایا تھا کہ مرنے کے بعد ان کی آخری آرام گاہ وہیں نام کے ایک شہر میں ہوگی جس میں ہر طرف نہریں بہتی ہوں گی۔ حالانکہ اس وقت وہیں شہر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ صدیوں بعد جب وہیں نے ایک مہرے پڑے شہر کا روپ دھارا تو وہاں کے باسیوں کو سینٹ مارک کی پیش گوئی یاد آئی۔ انہوں نے پتہ ارادہ کیا کہ وہ سینٹ مارک کے جسد خاکی کو اسکندریہ یعنی مصر سے لا کر وہیں میں دفن کریں گے۔ وہیں کے کچھ تاجروں نے یہ فخر و مولیٰ لیا اور سینٹ کی لاش کو اسکندریہ سے اسمگل کر کے وہیں پہنچا دیا۔ تب یہاں یہ شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا اور دوسری عمارت ہادی کی بنی۔

شاندار گنبدوں، اور دروازوں والی یہ عمارت ہادی کو بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے داخلے دروازے پر چار بہت بڑے گھوڑوں کے کلاسیکل مجسمے نصب تھے۔ مگر ان سارے مناظر سے زیادہ دلچسپی ہادی کو اس بات میں تھی کہ جلد از جلد کہیں بیٹھ کر کچ کرے اور علیز اسے اپنے بارے میں بتائے۔

اب سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہادی کی گھڑی ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ ہادی کو بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک یقیناً علیز کو بھی لگی ہوگی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جلد ہی کھانا نہیں کھا سکتی۔ یا پھر وہی تذبذب والی بات تھی۔ وہ اس کشش میں تھی کہ ہادی کو اپنے بارے میں کچھ بتائے یا نہیں۔ ہادی خود سے دیکھتا تھا تو یہ کشش اس کے چہرے پر بھی نظر آتی تھی۔

آخر ایک ریسٹورنٹ پر دونوں کی نگاہ پڑی مگنی۔ علیز ابولی۔ "چلیں پھر یہیں بیٹھتے ہیں نا۔" ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ ایک چیزا شاپ تھی۔ اگلی کا چیزا پوری دنیا میں مشہور ہے۔ علیز اور ہادی کے سامنے حامل حرام کا مسئلہ بھی تھا۔ لہذا انہوں نے اس عام سی بنگلا ویشی چیزا شاپ میں بیٹھنا مناسب سمجھا۔ یہاں آرڈر پر تیار کیا جاتا تھا۔ آرڈر دینے کے بعد وہ دونوں میز کے مقابل کناروں پر خاموش بیٹھ گئے۔ علیز اندرونی کشش اس وقت عروج پر نظر آتی تھی۔ ایک دوبار اس نے ہادی کی طرف دیکھا پھر نکالیں جو کالیں۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں کو حرکت دی مگر پھر ہونٹوں پر بس زبان پھیر کر رہ گئی۔

"ہاں جی کچھ کہیے گا یا پھر اسی طرح بس سنا رہی لیتی رہیں گی؟"

"کیا کہوں؟" وہ جھپکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مستنائی۔

"جو بھی آپ کے دل میں آئے اور جو آپ اپنی خوشی سے بتائیں۔"

"چلیں۔۔۔ پہلے آپ بتائیں۔" وہ خشک گلے کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں بتا دیتا ہوں۔ پوچھیں آپ کیا جانا چاہتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے آپ تھوڑا سا کچھ لیں۔"

"بس۔۔۔ ساوہ پانی پلا دیجیے۔"

یہ اس تو ہادی کو بھی لگ رہی تھی اور ساوہ پانی کو ہی دل چاہ رہا تھا۔ اس نے ویزا کو آواز دی۔ مگر حسب اندیشہ ان لوگوں کے پاس صرف کوک اور لائم جوس وغیرہ تھے۔ سامنے سڑک کے پار ایک سنور نظر آ رہا تھا وہاں منزل وافر کی

اس نے ایک بار پھر بیگ میں سے پارکر کی خواہصورت ڈبے نکالی۔ اسے محویت سے دیکھنے لگا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ ایک دم کیوں چلی گئی؟ اور اگر جانا ہی تھا تو پھر جاتے جاتے یہ امید کا دم چھل کیوں چھوڑ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے پرسوں رات اور کل کے سیر سپانے کا حساب برابہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ گھوٹے پھر نے کے دوران میں اکثر موقعوں پر بادی نے ہی ادا تگی کی تھی اور علیہ کے اسرار کے باوجود اسے پرس کھولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

بادی کے سینے میں مایوسی کی ایک سرد لہریں دوڑ گئی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس نے بے دلی سے لہجہ کیا۔ اپنی کلائی کی پٹی ایک فرنگی خاتون کی مدد سے بدلی۔ تھوڑے سے کالے انگوٹھ کھائے اور نیپے کے اندر لیٹ گیا۔

اچانک اسے اپنی وہ حرکت یاد آئی جو اس نے کل غلیظہ کی بے خبری میں کی تھی۔ اس نے جلدی سے کیمرا اٹھایا۔
 آٹھ آن کیا اور ڈھیلے پر کل والی تصویریں دیکھنے لگا۔ جلد ہی وہ تصویر اسے مل گئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ تصویر بہت
 عجیب تھی مگر غلیظہ کا سائڈ پوز واضح تھا۔ اس کا دلکش جسم کمان کی طرح ٹخم کھائے ہوئے تھا۔ وہ چہرے کی ایک
 دیرپا برقعہ پہنی ہوئی تھی اور اس پر کندہ آرٹ ورک دیکھ رہی تھی۔ ٹھیکے سے اس کی روشن پیشانی چمک رہی تھی اور بھی تسمائی ہوئی
 نظر آ رہی تھی۔ وہ بالکل بخوشی۔

ہادی نے ایک تسمیہ کو کمرے کی سکرین پر چھوٹا اور بڑا کر کے دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ اس کی نگاہیں کمپ کے واضح راستے کی طرف بھی کھینچ رہی تھیں۔ وہ اسی گولہ کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ شام کے سائے طویل ہونے لگے۔ وہ نہیں آئی۔

ایک روز دو پیر بارہ بجے تک بھی بادی اپنے نیت کے اس پاس ہی رہا۔ پھر اس یقین ہونے لگا کہ اب وہ کس آئے گی۔ اسے خود پر جھانپت محسوس ہوئی۔ وہ گھول بیہ تو فلوں کی طرح بار بار اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ وقت ضائع کر رہا تھا۔ "گو فونل" اس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنے جوگر چمن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ادب اس کا ہتھیار نہ کہس چاہتا تھا۔ وٹس میں سچو اچھا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ پھر بھی ہٹا نہیں کیوں جب وہ بیٹھ خیمے سے روانہ ہوئے لگا تو اس کتف ساتھ والے خیمے میں موجود فرنیچ خاتون سے رابطہ کیا اور انگلش میں اس سے کہا۔ "اگر کوئی لڑکی مجھ سے ملنے کے لیے آئے گی تو آپ یہاں موجود ہوں تو اسے میرا یہ سیل نمبر دے دیجیے گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک چٹ فرنیچ خاتون کی طرف رخ کر دیا۔

یہ وہی خاتون تھی جس نے کلائی کی پٹی بڑھائیے میں ہادی کی مہر دیکھی تھی۔ وہ اپنے بھائی بہن کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ اس نے خوش اخلاقی سے کہا: "میں نے پرسوں دیکھا تھا آپ کی فریڈ بڑی پیاری ہے۔"

”عقلمندی“ ہادی نے کہا اور کمپ سے نکل کھڑا ہوا۔
 آج بلکی ہوا چل رہی تھی۔ گہرے غلیظ آسمان پر بالوں کے سفید ٹکڑے تھے۔ وہ چلتا رہا اور تصویریں لیتا رہا۔

وہ ونس کی ہزار باروشن اور نیم تاریک گلیوں اور آبی کڑر کاہوں میں کم ہوتی تھی۔ اب وہ اسے کیسے ڈھونڈ سکتا تھا۔ اس کے پاس اس اُبھری ہوئی گتھی کا کوئی سراہی نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ خود چاہتی تو اب بھی اس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اس نے یہ کیسپ پلیس دیکھی ہوئی تھی اور بادی کا خیبر بھی۔ لیکن اگر اس نے اس فیے تک آنا ہوتا تو پھر یوں نام و نشان چھوڑے بغیر غائب بھی کیوں ہوتی۔

دن بھر کی بجائے روزانہ لڑتا رہا۔ سبب بادی کے جسم میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔ اس نے ڈسپرین نکالنے کے لیے اپنے شوئذر بیگ کی پیر وئی پالت میں ہاتھ دلا تو انھیں کسی سخت چوکور شے سے ٹکرائیں۔ یہ پالٹنگ کی کوئی ڈھنگ لگتی تھی۔ بادی نے اسے باہر نکالا اور وہ لٹ گیا۔ پارکر چین کو وہی سیٹ تھا جو اس نے ریڈیو کے ایک سٹینڈ مال میں دیکھا تھا۔ قیمت کچھ زیادہ تھی اس لیے اس نے خرچ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

وہ بکا بکا رہ گیا۔ اس امر میں شبہ کی گنجائش کبھی نہ تھی۔ علیزائے ہی اس سے بیٹ لیا یا بیٹو میں اس کا
لیکن یہ اس نے کب خریدا اور کب رکھا؟ اسے یاد آیا کہ شاہجہاں مال سے کچھ آگے آنے کے بعد دو چتر لیے تھے
بیٹو گئے تھے۔ علیزائے کہا تھا کہ وہ اپنی کسی بھانجی کے لیے دئی تھا اور وہ بچی ہے۔
”اوہ کاڈ“ ہادی کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

اس نے بڑی نرمی سے یہ کہہ کر چھوڑا۔ اس میں سے ظلم اور ہال پوائنٹ نکالنا ایسی ہی باتوں میں سے تھی۔
 مائیکس کو محسوس کیا۔ علیز کا چہرہ پوری آب و تاب سے اس کی نگاہوں میں چمکا۔ اس کے دلی میں اسے جاگے کہ دو گھر
 آئے گی۔ وہ اس خیمے کو ایک بار پھر رونق بخشنے گی۔ ایک جیسی سی مسکراہٹ نے اس کے بیونوں کو چمکایا۔ اس نے
 لیے لیے ایک آنکھرائی لی اور آنکھیں موند لیں۔

اگلی صبح وہ زیادہ دیر تک نہیں سویا۔ اس نے آنکھ کھولی تو کھڑی کی سونیاں اٹھ بیجھ کا وقت بتا رہی تھیں۔
 کی رو جہلی کر نہیں، درختوں میں سے چمن چمن کر رہی تھیں۔ برکتے عیموں تک پہنچ رہی تھیں۔ طیرانے اسے بتایا تھا کہ
 یعنی آج اسے روم واپس چلے جانا ہے۔ مگر وقت کا نہیں بتایا تھا۔ ہادی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ جانے سے پہلے
 ایک بار ضرور یہاں آنے کی۔ عین ممکن تھا کہ صبح سویرے ہی پہنچ جاتی۔ تجھلی دنگ جب وہ خیابان سے نکلا تھا تو
 اچانک ایک طرف سے برآمد ہوئی تھی اور اس نے ہادی کو ڈرا دیا تھا۔ اسی امید کے تحت ہادی نے خیابان کے کنارے
 زوہری کھولی اور گردن نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ جاٹنگ کرتے ہوئے دو جوڑے اس کے سامنے سے گزر گئے۔
 اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس تھا کہ اس نے اپنے گھر کے سامنے سے گزر گئے۔

بادی نے ڈر کا پردہ پھر گرا دیا۔ پھر وہ یہ اجدادہ واٹس رومز کی طرف چلا گیا۔ فریش ہو کر واپس آیا، ماتھے پر کپڑے دھو کر بے پروائی سے سو گیا۔

سازمی میں تھی۔ رکی نفلت کے بعد ہادی نے اس سے پوچھا۔ "انیسہ کا شو ہراسے لے گیا؟"
لڑکی نے مایوسی سے لنگی میں سر ہلایا۔ ہندی لب دلچے میں بولی۔ "وہ فلورنس سے واپس آچکا ہے لیکن ابھی تک
یہاں نہیں آیا۔ فی الحال اپنی والدہ کی سائیڈ لے رہا ہے اور انیسہ سے کہہ رہا ہے کہ وہ خود ہی واپس آئے لیکن....." وہ
چپ ہو گئی۔

"لیکن کیا؟" ہادی نے پوچھا۔

"ٹیلیفون پر بات چیت ہو رہی ہے۔ دوش تو صاف طور پر انیسہ کی ساس ہی کا ہے۔ اب وہ کہہ رہی ہیں کہ
انیسہ نے بھی ان پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں بڑی سے بڑی سوگند کھا سکتی ہوں کہ انیسہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کر ہی نہیں سکتی۔"
"انیسہ کا شو ہراسے میں کیا کہتا ہے؟"

"من تو اس کا بھی یہی کہتا ہے کہ انیسہ نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ معاملہ سلینے کی آشا ہے۔ ہو سکتا
ہے کہ ایک دو روز میں وہ آکر انیسہ کو لے جائے۔"

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "علیزہ اگر دوبارہ یہاں نہیں آئی؟"

"علیزہ! وہی لڑکی جو اس رات آپ کے ساتھ تھی؟" ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "نہیں وہ تو نہیں آئی۔ لیکن
آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ بس وہ ایک دو دن سے رابطے میں نہیں تھی۔" ہادی نے گول مول سا جواب دیا اور پھر چند رکی
کھات کے بعد اس نے لڑکی سے رخصت ہو کر واپس آ گیا۔ اگلے روز وہ بذریعہ ترین قریب انیسہ کو ستر کر کے روم
جائے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

روم جہنگناؤنک ہادی کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ چھت دسچ رقبے پر بسا ہوا شہر تھا۔ سات رنگوں سے سجا ہوا اور
دیا بھر کے سیاہیوں کی نگاہوں کا مرکز۔ ہادی نے اس شہر کو دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ یہاں ایک صاف ستر سے
ہوٹل ڈولو سے میں قیام پزیر تھا۔ علاقہ تھا "پرائی" یہ روم سنٹرل میں واقع تھا۔ ہادی کو آسانی سے من پسند سواری مل
جاتی تھی اور وہ ہر طرف ستر کرنے کے قابل تھا۔

دو تین دن میں اس نے محسوس کیا کہ اپنے پاؤں پر دم کر لیا۔ اسے لگا کہ اگر روم کے کچھ علاقوں کو میوزیم سے
تشبیہ دے دی جائے تو سب سے جانے ہوگا۔ یہاں آثار قدیمہ اسٹے پاس پاس ہوتے ہیں کہ سیاح کو پیدل چلنا ہی اچھا لگتا
ہے اور جب وہ ایک بار پیدل چلتا ہے تو پھر چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ پاؤں تھک جاتے ہیں لیکن آنکھیں نہیں ٹھکتی۔
ہادی بھی بڑے اشتیاق سے روم کے طول و عرض میں گھوم رہا تھا۔ اسے مزہ آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس
بھی ایک "بزنس" کی طرح کا تھا کہ وہ سیانی روح یعنی علیزہ بھی اسی شہر میں کہیں رہتی ہے۔ انہی گلی کوچوں میں گھومتی
ہے تھری رات جب وہ ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں انرجی ڈرنک کا ایک گلاس پینے کے بعد سکرینٹ پھونک رہا
تھا۔ پاکستان سے فون آیا ایک والدہ اور بھائی کے سوا ہادی کا کوئی قریبی عزیز اس دنیا میں نہیں تھا اور یہ والدہ دیا بھائی کا

پھر وہ آبی بس پر بیٹھ کر ریلو کی طرف آ گیا۔ لیکن آج ریلو اسے نسبتاً آسان اور کم دلچسپ محسوس ہوا۔ وہ ادھر ادھر
گھومتا رہا۔ چھوٹی موٹی خریداری کرتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں وہ نہ چاہتے
ہوئے بھی علیزہ کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کے دل میں امید ہے کہ شاید وہ اسے کہیں گھومتے پھرتے نظر آ جائے۔
پہیلیاں ہمیشہ انسان کو الجھاتی ہیں۔ ان کے جواب نہیں تو وہ اکثر ذہن سے چٹ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کتنا
اچھا ہوتا کہ کل وہ پانی کی بوتلی میں اپنے لیے سڑک کے پار نہ جاتا۔ ویٹر سے ہی کچھ منگوا لیتا۔ ہو سکتا تھا کہ انٹھار کے
وہ لمبے اس طرح کم نہ ہوتے اور علیزہ اپنے تذبذب میں سے نکل کر اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیتی۔

وہ ایک دم ٹھنکا وہ اس جگہ سے ہٹ گیا جہاں کل دوپہر اس نے علیزہ کو ایک لمبی ناک واک لڑکی سے بات کرتے
دیکھا تھا۔ وہ دونوں اس گول ستون کے نیچے کھڑی تھیں۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ چند کپڑے پر چھوٹے دروازے
تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کل علیزہ کے اچانک چلے جانے کی وجہ سے لڑکی ہو۔ وہ دوبارہ آئی ہو۔ اس کے علیزہ
کوئی ایسی اطلاع دی ہو کہ اسے اچانک وہاں سے لٹکانا پڑ گیا ہو۔ کچھ شمار کمالات تھے بہر حال یہ بات تو سنی
علیزہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس نے ہادی کے شولڈر بیک میں پارک کر رکھی تھی۔ اپنا سامان اٹھایا تھا اور
ہادی کے لوٹنے سے پہلے ہی نکل گئی تھی۔

گزرتے گزرتے ہادی نے اس بیزا شاپ میں بھی جھانکا جہاں اس نے کل آخری بار علیزہ کو دیکھا تھا۔ پھر وہ
سیدھا نکلا چلا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ وینس کی معروف سیرگا Doge's Palace میں تھا۔ یہ قدیم عمارت
اسپتہ اندر ایک خاص قسم کی شان اور وہ بے رکتی تھی۔ ہادی نے سنا تھا کہ جب پرانے زمانے میں بحری جہاز وینس کے
ساحل کی طرف آتے تھے تو مسافروں کو سب سے پہلے اس شاندار پالیس کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ اس گھنٹے لوٹنے کے
والوں، راہداروں اور چیرلز میں گھومتا رہا۔ آرٹ ورک کے نادر نمونے اور پینٹنگز دیکھتا رہا۔ دل کے کسی
گہرے گوشے میں شاید یہ خیال بھی موجود تھا کہ ہو سکتا ہے اسی طرح چلتے پھرتے کہیں وہ نہ جیں بھی نظر آ جائے۔
شام تک آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ تھکا ہارا سنی سینٹر کی طرف آ گیا۔ ایک سوزانی ہوٹل سے رات کا کھانا
کھایا اور کھپ واپس آ گیا۔

اگلے دو تین دن ہادی نے عجیب سی کیفیت میں گزارے۔ وہ اس پڑ بھار شہر سے بیزا سا ہو گیا تھا۔ اپنی تمام
رعنائیوں کے باوجود اب وینس اسے زیادہ کشش نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل جگہ بدلنے کو چاہ رہا تھا۔ اور جگہ عظیم الشان
رومان یعنی روم کے علاوہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ عجائبات کے اس پڑ شکوہ شہر کو دیکھنے کی خواہش ہمیشہ ہادی کے دل میں
رہتی تھی۔ اور اب تو اس شہر کو دیکھنے کی ایک اور "وجہ" بھی پیدا ہو چکی تھی۔

وینس چھوڑنے سے ایک دن پہلے وہ یونانی گھومتا پھر ACTV کی بس پر ستر کر اس ہستی کی طرف نکل گیا
جہاں وہ ایک رات علیزہ کے ساتھ آیا تھا۔ مصیبت زدہ بنگلا دیشی لڑکی انیسہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ اسے اس
فرینڈ کے گھر چھوڑ کر گئے تھے۔ آج پھر ہادی نے اس سے منزل مکان کی درمیانی ڈور نکل بجائی۔ کچھ دیر بعد کھڑکی میں
اسی لڑکی کا چہرہ دکھایا جو اس رات بھی انہیں ملی تھی۔ وہ ہادی کو پہچان کر نیچے چلی آئی۔ وہ آج بھی ایک بلی

کی۔ مقول تعداد بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہاوی نے صرف پرانی چیزیں سنانے پر اکتفا کیا۔ تازہ لکھے ہوئے دو بے دو ووشش کے باوجود نہیں سنا سکا۔ اس سلسلے میں ہمیشہ سے اس کا نظریہ تھا کہ کمزور چیز منظر عام پر لانے سے بہتر ہے کہ اسے ردی میں پھینک دیا جائے اور اچھی چیز کا انتظار کیا جائے۔

پانی چیزوں پر بادی کو خاطر خواہ دلدلی تاہم اس حوالے سے شرکاء و تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی کہ بادی نے کوئی نئی چیز سرے سے سنائی ہی نہیں۔ اس نے جو کہ پڑھا وہی تھا جو دو ہجھیلے پانچ چھ سال سے انسی نشستوں پر پڑھتا آیا تھا۔ یہ مکمل موسم کی خرابی کے سبب مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی اختتام پذیر ہو گئی۔

اگلے چار پانچ روز تک بادی نے خوب "روہ گردی" کی۔ وہ زیادہ تر پیدل ہی چلتا تھا اور اس کی خواہش ہوتی تھی کہ اکیلا ہی رہے۔ وہی امن انشاء کا قول۔ اکیلا سیاح..... سیاحت کی اصل روح سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ واقعی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شاید مزید ہونا اگر اس کے ذہن میں نظیر اوالا کا نشانہ چھپا ہوتا۔ وہ گھومتے پھرتے، سڑکیں نہانے اور مختلف عمارتوں کے اندر آتے جاتے جیسے لاشعوری طور پر نظیر اکوہمی دیکھتا رہتا تھا۔ کسی لڑکی پر اسے نظیر اکا شہم نہ پہنچا۔ وہ اس شبے کو رنج کیے بغیر آگے نہ بڑھتا۔

آئیہ دن اس کے ذہن میں آیا کہ روم میں آوارہ گردی کرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ اس علاقے میں کی جائے جہاں سیرا سے لڑے بغیر ہونے کا چانس موجود ہے۔ ونس کے ایک بازار میں ہونے والی گفتگو کے دوران میں علیزا نے رانی میں اسے بتایا تھا کہ وہ شمالی روم میں Cassia کے علاقے میں رہائش پذیر ہے۔ اب باوی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ "کاسیا" کا علاقہ کتنا بڑا ہے۔ اور کیا وہاں گھومنے پھرنے سے سیاحت کے فائدے بھی پورے ہوتے ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ اس طرح علیزا کو وہ کچھ حاصل بھی کر پائے گا یا یہ بھوسے کے ذمیر میں سے سوئی ذمہ داری نے بالہات ہی ہوگی۔ پھر ایک اور سوال بھی اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ فرض محال علیزا اسے مل بھی سکتی تو وہ اس سے کہنے کا یہ ارادہ ابھی تک خود بھی یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھا کہ اس سے چاہتا کیا ہے۔

اگلے روز ناشتے کے فوراً بعد بادی زمین دوزخین کے ذریعے "کاسیا" کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ جان کر اسے نقلی ہونے کی یہاں بھی کھلی کوچوں میں قدیم آثار بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کے جتنے بھی دکھائی دیتے تھے۔ یوں یہ ایک رہائشی علاقہ تھا۔ ٹھیک مٹھکس اور کھین تھیں لیکن ٹھیک سڑکوں اور گلیوں میں ہی چلتے چلتے "سیاح" اچانک خود کو کسی عظیم الشان "مومنٹ" کے سامنے پا تا تھا۔ ایک دوا ایسے کوچوں میں بھی بادی گیا جہاں گاڑی کا داخل ہونا بھی دشوار تھا۔ لیکن ان کوچوں میں ایک دو عظیم الشان چوچوں کے دروازے موجود تھے۔ اندر داخل ہو کر بندہ دنگ رہ جاتا تھا۔ اگلے تین دن بادی نے اس علاقے کی جہول جہول میں گھومتے گزارے۔ اس کے پاس علیحدگی کی تصویر موجود تھی۔ کس وقت اس کا دل چاہتا کہ وہ اس تصویر کا پرنٹ لے لے تاکہ اسے یاد میں تھا۔ اور ہر راگیر کو تصویر دکھا کر دیکھتے۔ آپ نے اس اول جہول لڑکی کو دیکھا ہے۔ یہ وہی ہے آج کے باجرہ میں مجھے چمکے دے کر کہیں غائب ہو گئی ہے۔

چوتھے دن تک دو شامی روم میں کایا کے علاقے میں محکمہ محکم کر تھک گیا۔ اب یہاں دیکھنے والی کوئی قابل ذکر

فون نہیں تھا۔ اتنا سے توکل ہی لمبی بات ہوئی تھی۔ یہ اس کے ایک کلائمٹ کا فون تھا۔ وہی میوزک کمپنی کے ڈائریکٹر احتشام شجہت جہیں وہ لوگ کبھی کبھی بے تکلفی اور پیار سے شیخو صاحب بھی کہتے تھے احتشام شیخ کے ایڈوائس کی رقم چند ہفتے پہلے ہادی نے بمشکل اسے واپس کی تھی اور الیم کے لیے گانے لکھنے کے لیے فی الحال معذرت چاہی تھی۔ اب وہ پھر اصرار برآباد وہ تھے۔ فون پر اصرار تو بد اخلاقی ہوتی۔ ہادی نے بادل خواست فون پر میسج کیا۔ کیا حال ہے ہادی کیسے ہو؟

شیخو صاحب نے چھوٹے ہی پوچھا۔
 ”نہیک ہوں شیخو صاحب! میں انجان نہیں جانتی آپ کو ضرورت ہے ابھی کچھ بھی نہیں سوچو رہا۔ دماغ بالکل خالی ہو رہا ہے۔ ایک دم پاکستانی سینما گھروں کی طرح۔“
 ”یار! کوئی مت دو مجھے پتا چلا ہے کہ لاہور کے بازار بھائی کے لیے کچھ لکھ رہے ہو تم۔“
 ”فائیت ہو جائے تو جو چور کی سزا دو میری۔ میں نے بھی سمجھت نہیں بولا آپ جانتے ہی ہیں۔ جو لکھوئی کا پتہ۔“
 ”آپ کے لیے ہوگا۔ پھر کسی اور کے لیے۔“

”یار! بھلاؤ شاد ہو جانے کی بات ہے تو بتا دو۔“

”کانوں کو ہاتھ لگائیں شیخو صاحب! میں نے آج تک ایسی بات کی ہے آپ سے ہمیشہ سب کچھ آپ پر ہی چھوڑا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا۔“

”آئندہ تو جب ہو گا جب لکھو گے۔ مجھے تو لگتا ہے تم نے ویسے ہی کان بڑھا دی ہے۔ اب خواہو اور خیرے اُٹھو رہتے ہو اور مزے لے رہے ہو۔“

”اگر آپ واقعی اس طرح سوچ رہے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہے۔“
حسب معمول شیخو صاحب نے ایک بلند قبضہ لگایا اور بولے۔ ”تم مجھ سے لگاؤ کر لیتے ہو میں تم سے کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے تم دوسروں سے ذرا مختلف ہو۔ بہر حال اپنا خیال رکھو۔ وہاں اہل میں کسی بھی طرح کی مداخلت ضرورت نہ ہو تو مجھے کال کرنا۔ خاص طور سے روم میں وہاں اپنے ایک رویا رہیں۔“

مرد و رت پر جوتے کاس کرنا۔ خاص کر رت کے در اس جوتے پر پاؤں سے لگا کر۔ دو دانہ کچھ لکھ بیس پاؤں
ممنٹگو ختم کر کے ہادی بستر پر چت لیٹ گیا۔ دونوں بازو صوڑ کر سر کے نیچے رکھ لیے۔ دو دانہ کچھ لکھ بیس پاؤں
تھا اور اس علیز اوائل واقفے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ دو خالی خالی تھا۔ وسطی روم میں فروغ اردو ادب کے نام۔
ایک انجمن قائم تھی۔ بڑے بڑے نام اس انجمن سے وابستہ تھے۔ ان کے مقابلے میں ہادی کی کوئی حیثیت نہیں تھی
لیکن ایک لحاظ سے حیثیت تھی بھی۔ وہ پاپرلر شاعری کرتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اس کے گیت سنتے اور سر دہ
تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انجمن والوں نے اس کے ساتھ ایک شام منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ ایک چھوٹے چھوٹے
کی تقریب تھی اور کسی بونل کی بجائے ایک مقامی ممبر کے گھر میں ہوتا تھی۔ ایتھنا وہاں اس سے تازہ کلام سناے جا
کی فرمائش بھی کی جاتی تھی لیکن کوئی تازہ چیز اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ وہ رات گئے تک کوشش کرتا رہا اور بمشکل
باجو دے لکھ پایا۔ ان کا معیار بھی بس گزار سے لائق ہی تھا۔

پانچ دو بجے تک پایا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس دور کے ادیبوں کو بھی موجود تھے اردو ادب کے مقامی ہندوستان

بات کا نہ اتنی نہیں منالیا گیا تھا۔

فرہ اندام شخص سیدھا اس کی میز پر آیا۔ ”السلام علیکم“ اس نے خوش اخلاقی سے ہادی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ہادی نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔

فرہ اندام شخص بولا۔ ”مخالف سمجھے گا میں نے آپ کو ضرب کیا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ ہادی صاحب ہی ہیں نا؟ پاکستان سے؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ میں ہادی ہی ہوں۔“

فرہ اندام شخص کے چہرے پر سرنخی پھیل گئی۔ اس نے ایک بار پھر گرم جوش سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ”ہم آپ کے ہندوستان میں سے ہیں جی۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ برسوں یہاں روزے کے علاقے میں کوئی ادبی نشست بھی ہوتی تھی۔ اس کی تصویر آئی تھی یہاں کے اردو ہفت روزے میں۔ اس تصویر کی وجہ سے ہی میں نے پہچانا ہے۔ اٹ ایڈیٹر فل۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں آپ کے پاس؟“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔“ ہادی نے خوش خلقی سے کہا۔

دو دروہوں بیٹھ گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ فرہ اندام شخص کا نام ظہیر الدین معلوم ہوا۔ فرہ اندام ہونے کی وجہ سے وہ دروازہ نظر آتا تھا۔ وہ بالکل فوجوان تھا۔ وہ اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ بڑے بھائی کی سی وہ دروازے والے پار عرب سے صاحب تھے جو میز کے سرے پر بیٹھے تھے۔ ساتھ میں ان کی وائف بھی تھی۔ بچہ بھی اسی فیملی کا تھا۔

یہ جان کر ایک بار پھر ہادی کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی کہ یہ لوگ یہیں کا سیاہ علاقے میں رہتے ہیں۔ ظہیر الدین تو ہمیشہ کی رہنے والی تھی۔ تو کیا وہ بھی اسی فیملی کا حصہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ ظہیر الدین کی چھوٹی بہن یا بھانجہ (بھانجہ) لیکن اتنی جلدی وہ اس طرح کے نازک سوال نہیں پوچھ سکتا تھا۔ وہ بس ایک دوسرے سے جان پہچان کی باتیں کرتے رہے۔ ظہیر الدین نے بتایا کہ وہ دونوں بھائی یہاں ایک ڈیپارٹمنٹل سنور چلاتے ہیں۔ اچھا خاصا سنور ہے۔ ”مختل آدنی“ ہے۔ اپنا گھر گاڑی، ملازمین سبھی کچھ ہے۔ کشائش سے گزر رہا ہو رہی ہے۔ اب یہ لوگ میلا نو مٹ بھی ایک ایسا ہی سنور کوٹھانے کی تیاری کر رہے تھے۔

”آپ کا کتنے دن کا پودہ گرام ہے یہاں؟“ ظہیر نے اپنا مینت سے پوچھا۔

”بس ایک ڈیڑھ ہفتہ۔“

”کہاں رہ رہے ہیں آپ؟“

”ڈول وے ہوٹل۔ وائٹ اسکوائر کے علاقے میں۔“

”نہیں جناب! ایسا تو نہیں چلے گا۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں نہیں رہیں گے۔ اتنا بڑا گھر ہے۔“

”آٹھ دس مہمانوں کے لیے تو گھر میں ہر وقت جگہ رہتی ہے۔“

ہادی کے سینے میں پچھلی سی جھوٹ گئی لیکن اس نے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ”نہیں ظہیر

جیز باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے کمرے میں سینکڑوں تصویروں جمع ہو چکی تھیں۔ یہ امید بھی تقریباً توڑ گئی تھی کہ اس علاقے میں چلتے پھرتے کہیں اچانک ڈرامائی انداز میں علیز کی صورت نظر آ جائے گی۔ یہ واقعی بھوست کے ذہیر میں سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔ چوتھے دن دوپہر کے کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ آج تقریباً دس بارہ کلومیٹر چلا تھا۔ اس کے شاندار جوگرنے سے چلتے میں زبردست مدد دیتے تھے۔ ایک بار پھر وہ قدم قدم سے کھلی کوچوں سے گزرتا ہوا پہلے ہی اندر گراؤ میں ٹوڑنے کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ کاسیا کے علاقے سے نکلنے کے بعد اسے تقریباً دو کلومیٹر سڑک پر پہنچا تھا۔ اور پھر اسٹیشن تک پہنچنا تھا۔ وہ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر تھاجب اسے ایک جگہ آکس کریم نظر آئی۔ گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آکس کریم باریک طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر پہلے ہو کر اس نے کون آکس کریم لی۔ کون آکس کریم لینا اس کی غلطی تھی۔ آکس کریم زیادہ سخت نہیں تھی۔ چھلتی جا رہی تھی۔ اس سے بچنے کے لیے ہادی کو جلدی جلدی منہ چلانا پڑا۔ اس کا انداز دیکھ کر قریب کھڑے دو فرہ اندام لڑکے ہلکا سا ہنسنے لگے۔ ہادی نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس کی نظر آکس کریم کے اندر گئی۔ یہاں لوگ موجود تھے۔ اچانک ایک چہرہ دیکھ کر وہ بے طرح چونکا۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہی ناک والی وہی دروازہ لڑکی تھی جسے ہادی نے ریالٹو میں دیکھا تھا۔ یہ وہی تھی۔ ہادی کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی کون آکس کریم کھس کر نیچے گر گئی۔ اسے بس فرہ اندام لڑکوں کی مدد نہی سنائی دی تھی۔ اسے اس فہمی کی پروا نہیں تھی۔ بلکہ کسی چیز کی طرف بھی نہیں تھی۔ وہ لڑکی کو وضاحت سے دیکھنے کے لیے بار کے اندر چلا گیا۔ اس کی رگوں میں خون سنسناتا تھا۔ یہ وہی ظہیر الدین کی دوست تھی۔ وہ فیملی کے ساتھ تھی۔ ایک طویل میز کے گرد چھ سات مرد و زن بیٹھے تھے۔ یہ سب ایشیائی بلکہ شاید پاکستانی تھے۔ دو تین پردہ نشین خواتین تھیں۔ ایک بھاری جسم کا خوش ہاش شخص تھا جس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ایک بچہ بھی تھا۔ سیاہ داڑھی والا ایک جواں سال شخص میز کے سرے پر بیٹھا تھا۔ اس کے بال انگریزی ٹراش کے تھے۔ وہ کھانسی میں تھا۔ اپنے لباس اور چہرے سے یہ سارے لوگ کسی خوش حال فیملی سے لگتے تھے۔ وہ جس آکس کریم باریک

بہن سے ہوئے تھے وہ بھی خاصا مہنگا تھا۔

بہن ناک والی لڑکی آج ساڑھی میں تھی۔ پلو اس کے سر پر تھا۔ وہ کھیت سے ایک چادر پوش معمر خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک میز خالی تھی۔ ہادی وہاں جا بیٹھا۔ اس کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ظہیر الدین کو کہیں نظر نہیں آئی مگر اس کی سبیلی کا نظر آ جاتا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہادی کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ وہ کیا کرے؟ کس طرح بات آگے بڑھائے۔ کیا اسے کھڑی ناک والی دروازہ لڑکی سے بات کرنی چاہیے۔ پھر خاموشی سے ان لوگوں کے پیچھے جانا چاہیے۔ ان کی رہائش معلوم کرنی چاہیے۔ یا کوئی اور طریقہ؟ وہ گاہے بگاہے چادر پوش خواتین کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ان میں سے دو تو بالکل جوان دکھائی دیتی تھیں۔ چادر کے نقابوں میں سے فقط ان کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ کہیں ان میں سے ہی تو کوئی علیز انہیں؟ اس نے سوچا لیکن پھر خود ہی اس خیال کو زور دیا۔ کیا وہ چوبک گیا۔ اس نے پچیس پچیس سال کے فرہ اندام شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ ہادی کے

صاحب! میں بہت آرام سے ہوں۔" اس نے کہا۔

"آرام سے تو آپ یقیناً ہوں گے۔ ظاہر ہے اتنا مہنگا ہوٹل ہے مگر اکیسے بھی تو ہوں گے ہمارے پاس ہوں گے تو اکیلا پن نہیں ہوگا۔ پردیس میں دیس کا مزہ پائیں گے اور پھر آپ روم کی ایسی ایسی جگہیں بھی دیکھ سکیں گے جو کوئی گائیڈ آپ کو نہیں دکھا سکتا۔ بس یہ طے ہے۔ اگر کوئی خاص مجبوری نہیں تو پھر آپ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کی مہمان نوازی کر کے مجھے بے حد خوش ہوگی۔" ظہیر نے "بے حد" پر اتنا زور دیا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"اچھا..... مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔"

"آپ بے شک سوچ لیجیے۔" جواب فیصلہ ہادی نے زور خواہش کے مطابق ہی دیا۔

پھر وہ ہادی کا جواب سنے بغیر اٹھا اور اپنی بیوی کی طرف چلا گیا۔ اس نے بڑے بھائی کے قریب جھک کر کچھ کھسک پھسکی۔ بڑے بھائی صاحب بھی اٹھ کر ہادی کی بیوی کی طرف آ گئے۔ چھوٹے بھائی کی نسبت یہ قدم خاموش طبع تھے۔ چہرے پر گہری کار و باری سنجیدگی تھی۔ بھائی ان شلوار قمیض پر ویسٹ کوٹ میں تو اتنا جسم پر تنگ رہا کہ ہادی نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ وہ تینوں بیٹھ گئے۔ بڑے بھائی صاحب کا نام جمال الدین تھا۔ ظہیر نے بڑے بھائی سے ہادی کا تعارف ایک مشہور ملی نغمے کے حوالے سے کرایا۔ یہ ملی نغمہ آنکھیں دھڑکیں دے کر بڑے بھائی سے بڑا تھا اور خاصا مقبول تھا۔

جمال صاحب نے نغمے کی تعریف کی اور اس طرح کے چند دوسرے گیتوں کو بھی سراہا۔ پھر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تعریف و توصیف میں کفایت شعاری سے ہی کام لیتے ہیں۔

اسی دوران میں ان کے سیل فون پر کال آ گئی۔ وہ کال سننے سننے لابی کی طرف چلے گئے۔ ظہیر صاحب اور ہادی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کال سے فارغ ہونے کے بعد جمال صاحب نے ہادی کو کہہ دیا کہ انہیں فوراً ہی طور پر واپس جانا ہے۔ انہوں نے ہادی سے ہاتھ ملایا اور خواتین کی طرف چلے گئے۔ ظہیر صاحب نے ہادی سے ہونٹ کا روم نمبر وغیرہ معلوم کر لیا تھا۔ جاتے جاتے انہوں نے کہا۔ "کل گیارہ بجے رابطہ ہوگا آپ سے۔" بلکہ شاید میں خود ہی آ جاؤں۔" انہوں نے اپنا ڈائینگ کارڈ بھی ہادی کی طرف بڑھا دیا۔

صورت حال نے یہ عجیب پلٹا رکھا تھا۔ نہ صرف علیز کا کھوج آیا تھا بلکہ اس کھوج کو مزید کھونے کا موقع بھی خود بخود ہی مل رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا بیٹھا سوچنے لگا۔ کیا کل واقعی ظہیر کے گھر میں علیز اسے ملاقات ہو سکتی ہے اور اگر ایسا ہوا تو علیز کا راجہ عمل کیا ہوگا۔ وہ تو اپنا نشان چھوڑے بغیر اوجھل ہو گئی تھی۔ اب اگر اس نے یکا یک ہادی کو اپنے سامنے پایا تو اس کا راجہ عمل کیا ہوگا۔ نہیں وہ یہ تو نہیں سوچے گی کہ ہادی اس کا سرخ لگا ہوا اس کے پیچھے آیا ہے۔ اس نے جس تعلق کو ایک خوبصورت موز دے کر ختم کر دیا تھا۔ وہ پھر ایک بے ڈھنگا موز مڑ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوگا۔

ہوٹل کے کمرے میں وہ رات ہادی نے بڑی بے قراری سے گزاری۔ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ دوسرا سرا اٹھا رہا تھا کہ کہیں ظہیر الدین اپنا ارادہ بدل ہی نہ ڈالے۔ وہ علیز کو کم از کم ایک بار مزید دیکھنا چاہتا تھا اور ضرور دیکھنا

چاہتا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ بے معنی سی خواہش اس کے دل میں کیوں جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ ایک سوال اور ہادی کے ذہن میں بار بار اٹھ رہا تھا۔ اس گھرانے کی خواتین تو پر وہ نشین تھیں مگر علیز ابھی ای گھرانے سے تھی تو پھر وہ پردے کے بغیر کیوں نظر آتی تھی؟ اسے تو ہادی نے باقاعدہ چٹون شرٹ میں دیکھا تھا۔

اگلے روز گیارہ بجے تو ہادی سر تا پا ظہیر صاحب کی فون کال کا منتظر تھا۔ سو گیارہ بجے کے قریب یہ کال آ گئی۔ یہ کال کمرے کے نمبر پر تھی۔ "جاگ گئے ہادی صاحب! ظہیر کی خوش باش آواز سنائی دی۔"

"تقریباً۔" ہادی نے کہا۔

"تو تھیک ہے آپ تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو لینے آ رہا ہوں۔"

"لیکن....."

"لیکن کی گنجائش نہیں۔" ظہیر نے کہا اور فون بند کر دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہادی اپنے مختصر اسباب سمیت ظہیر صاحب کے گھر میں تھا۔ یہ ایک اچھا رہائشی علاقہ تھا۔ ہادی کی کونیاں اور ولاز تھے۔ ہادی جس گھر میں آیا وہ بھی اندازاً دو ڈھائی کمنال میں تھا۔ گھر کا رہائشی حصہ اور مہمان خانہ پاس پاس تھے احاطہ کافی وسیع تھا اور یہاں بہت سے چھتری نما ستون پائین کے درخت کمرے نظر آتے تھے۔ ایک دو سوڑھی چٹان قدمی کرتے دکھائی دیے۔ پورچ میں دو شاندار گازیوں کھڑی تھیں۔ اس کے علاوہ انٹی کی خاص نشانی بڑے سائز کا ایک ویسپا اسکوٹر بھی یہاں موجود تھا۔ جو یقیناً شوقیہ رکھا گیا تھا۔ ورنہ اس گھر میں اسکوٹر کس نے چاہا تھا۔ ظہیر نے ہادی کو جس کمرے میں ٹھہرایا وہاں ہر جدید سہولت موجود تھی۔ ظہیر بڑی جلدی محل مل جانے والا نہیں تھا۔ اپنے بڑے بھائی جمال کی نصیحت وہ زیادہ نہ بنی نہیں تھا۔ جب ہادی نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس کے چٹون شرٹ جہن رکھی تھی۔ اس کی داڑھی بھی نہیں تھی۔ کھنی موٹھیں نفاست سے تراشی گئی تھیں۔ وہ بے سکرانا تھا تو دونوں کاؤں کا گوشت اوپر کی طرف چڑھ جاتا تھا اور انھیں چھوٹی نظر آنے لگتی تھیں۔

اس نے آتے ساتھ ہی کہا۔ "ہادی بھائی! اس کو اپنا گھر سمجھنا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بول دینا ہے۔ میں صرف تین چار دن زیادہ معروف ہوں کیونکہ بھائی میاں ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر آپ چاہیں گے تو آپ کے ساتھ ساتھ گھومیں گے۔ لیکن ان تین چار دنوں میں بھی ایک ڈرائیور گاڑی سمیت آپ کے لیے اسٹینڈ بائی رہے گا۔"

"یار آپ تو واقعی کرم فرمائی گے پہاڑ تو چڑھ رہے ہیں۔ میں سنکل ہیل اس کے نیچے دب کر مر جاؤں گا۔"

"کوئی کرم فرمائی نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ایک نامی گرامی پاکستانی فنکار اس وقت میرا مہمان ہے۔ آپ روزانہ اپنے دو تین گیت اپنی زبان سے سنایا کیجئے گا میں سمجھے گا کہ اگر کوئی کرم فرمائی ہے بھی تو اس کا بوجھ اتر گیا۔ میرے لیے ہنس یہ ہوگا کہ اپنے دو چار دوستوں سے ملے گی آپ۔ وہ ملاؤں گا اور ان پر اپنی احساں بھانڈاؤں گا۔" وہ جھما اور اس کی آنکھیں کسی جاہلی کی آنکھیں لگنے لگیں۔

"یار! اتنے نامی گرامی نہیں ہوں میں اور اگر آپ کے بڑے بھائی صاحب کو پتا چلا کہ میں نے صرف ملی نغمے ہی

لج کے بعد جب وہ دواش میں پر ہاتھ دھو رہا تھا اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ دو پردوں کی درز میں اس نے دیکھا کہ ایک ایڑھیز عورت ڈری ڈری سی گھر میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ شکل و صورت سے کھاتے پیتے گھر کی لگتی تھی۔ ریمٹ سفید، چہرے سے نیکی اور شرافت چمکتی محسوس ہوتی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک خوش اخلاق اور نیکہ خواتون ہے۔ اس کے سر پر ایک لمبی چادر تھی جس نے جسم بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھ میں ایک ٹوہری لیے وہ کھڑکی کے عین سامنے سے گزری اور ہانسی جسے کی طرف چلی گئی۔ ٹوہری میں پھل وغیرہ تھے ہادی کو اندازہ ہوا کہ یہی جناب کی والدہ ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے ڈکھ ہوا کہ گھروں میں ایسے حالات کیوں پیدا ہو جاتے ہیں کہ والدین کو اپنی بیٹیوں سے ملنے کے لیے یوں مجرموں کی طرح آنا پڑتا ہے۔ خوفزدہ نادم اور سبے سبے۔

کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے ہادی سو گیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جاگ تو خدمت گار شریفان آواز پیدا کیے بغیر کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ اس کا تعلق وسطی پنجاب کے شہر گجرات سے تھا اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی اپنے باتوں کو حرکت دیتے ہی رہتے ہیں۔ شریفان بھی غالباً ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس نے اس گھر میں اپنا مقام بنا رکھا تھا۔

اتنے میں مین گیت کی طرف گاڑی کا بارن سنائی دیا۔ ملازم نے بارن پہچان کر گیت کھولا۔ ایک شاندار سفید جیپ اندر داخل ہوئی۔ اسے باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ تجلی نشست پر ایک فربہ ادا عورت طمطراق سے بیٹھی تھی۔ ڈرائیور نے چہرے والی اس صحت مند عورت کو ہادی نے کل ظہیر کی فیملی کے ساتھ آکس کریم بار میں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر شریفان نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ بائے میں مگنی یہ اتنی ننھیلی واپس آئیں۔

”یہ کون ہیں؟“ ہادی نے درپاؤ کیا۔

”ظہیر صاحب کی امی!“ شریفان نے بدستور کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

ہادی کی طرف کوئی توجہ دینے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔

درمیانہ حال کچھ ہادی کی سمجھ میں آ رہی تھی ظہیر نے اپنی والدہ کو وقت سے پہلے ہی شاپنگ کے لیے بھیج دیا تھا تاکہ وہی دوران میں جناب کی والدہ آکر جناب سے مل لے اور نسلی سے بات وغیرہ کر لے۔ لیکن اب غیر متوقع طور پر ظہیر کی والدہ جلدی ہوئے آئی تھیں۔ جناب کی والدہ ابھی گھر میں ہی تھیں۔ اب ملازمہ انہیں باخبر کرنے گئی تھی کہ ظہیر کی والدہ واپس آئی ہیں۔

پندرہ بیس منٹ مزید گزر گئے۔ اندرون گھسے گھسے نکلا ہوا۔ کوئی جھگڑا ہوا یا نہیں۔ بہر حال ہادی نے اتنا ضرور دیکھا کہ عورت جو یقیناً جناب کی والدہ تھیں ڈرائیور کی ہادی ہی باہر آئی اور لڑکھائی ہوئی سی مین گیت سے باہر نکل گئی۔ اس کی لمبی چادر کا پلو اس کے پیچھے فرش پر گھسنا چلا جا رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں ہادی کو اس عورت پر ترس آیا۔ عجائبات بھی کہہ سکتے ہیں کہ اپنی بیٹی کے گھر میں اس طرح ڈری ہوئی آئی تھی اور یہی ہوئی تھی۔

شام سے ڈرائیو پہلے ہادی مہمان خانے سے نکلا اور خوبصورت کراچی کمان میں چہل قدمی کرنے لگا۔ کھاب اور

ارشاد نہیں فرمائے۔ کھانے شائے بھی نکلیے ہیں تو وہ مجھے کھڑے کھڑے روانہ کر دیں گے۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ شاعر ہیں یا را! اور یہ قابل فخر بات ہے بھائی جان خود اقبال اور فیض کی

بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔“

”کانوں کو ہاتھ کا ڈھکیا صاحب! مجھ تا چیز کو کن لوگوں سے مل رہا ہے ہیں کسی باذوق بندے نے سن لیا تو جھک

عزت کا دعویٰ کر دے گا۔“

اسی دوران میں ظہیر کے مہل فون پر کال آگئی۔ اس نے ذرا تذبذب کے بعد کال ریسیو کی۔ دوسری طرف

ایک زنانہ آواز تھی۔ ”ہیلو خالد جان! کیا حال ہے؟“ ظہیر نے کہا۔

”مہم سی آواز ہادی کے کانوں تک پہنچی۔“ ظہیر بالکل نمیک ہوں ظہیر بیٹا! ام۔۔۔ میں ڈرائیو چلا رہی تھی۔ جناب

سے ملنے کو دل کر رہا ہے۔ کافی دن ہو گئے ہیں۔“

”مگر۔۔۔“ ظہیر نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

عورت جلدی سے بولی۔ ”مجھے پتا چلا تھا کہ جلال بیٹا ظہیر سے باہر سے دو تین دن تک آئے گا اس لیے

رہی ہوں کہ مل لوں۔“

”پر خالد جان امی تو گھر میں ہی ہیں۔ پھر آپ سے ٹوٹو میں میں ہو جائے گی ان کی۔“

”مجھے پتا چلا تھا کہ انہوں نے بھی بازار جانا ہے آج۔۔۔“

”لیکن وہ تو شام کو جائیں گی نا۔“

”بب۔۔۔۔۔ بیٹا! کچھ کرو۔۔۔۔۔ میرا دل بڑا اداں ہو رہا ہے۔“ عورت کی گھٹکیاٹی ہوئی آواز سنائی دئی۔

”شاید کچھ اور بھی کہا لیکن ظہیر کال سنتا ہوا باہر چلا گیا۔

ساتھ والے کمرے سے ظہیر کے بولنے کی مہم آواز آتی رہی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ جس جناب

بات ہو رہی ہے وہ ظہیر کی بڑی بھائی یعنی جلال کی بیوی ہے۔ فون پر بولنے والی جناب کی والدہ تھی اور بیٹی سے ملنے

کے لیے یہاں آنا چاہ رہی تھی۔ یہاں سسرال میں جناب کے حالات غالباً زیادہ اچھے نہیں تھے لہذا ظہیر تذبذب میں

تھا۔ آخر میں بات ختم کرتے ہوئے ظہیر نے کہا۔ ”نھیک ہے خالد! میں کوشش کرتا ہوں کہ امی شام کے بجائے دوپہر

کو چلی جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں آپ کو ابھی فون کر دیتا ہوں۔“

منفقہ ختم کر کے ظہیر پھر ہادی والے کمرے میں آ گیا۔ اس موضوع پر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

مہمان خانے کی ملازمہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں تھوے کی پیالیاں اور دیگر لوازمات سجے ہوئے

تھے۔ اس درمیانی عمر کی ملازمہ کا نام شریفان معلوم ہوا۔ لگتا تھا کہ اس گھر میں شریفان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

کافی باتوں بھی تھی۔

دوپہر کا کھانا کافی پُر تکلف تھا۔ ہیزا تھا، بئیر کا بسنا ہوا گوشت اور کھیر قسم کی سویت ڈش تھی۔ مصروفیت کی

سے ظہیر کھانے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ لج ہادی نے اکیلے ہی کیا۔

سیک۔ رزم کے ارد گرد کی جگہ کچھ سرخ ہوئی تھی اور گرم بھی محسوس ہوتی تھی۔ یہ انٹیکشن کی نشانی تھی بادی نے بہتر سمجھا۔
 اس نے کوکھا کر اچھی طرح پی کر والے اور کھانے کے لیے بھی کوئی دوا لے لے۔ اس نے ایک دورا گیریوں سے
 پرچہ۔ پتا چلا کہ قریب ہی ایک بڑا ہسپتال موجود ہے۔ دو تین بڑے بڑے گیٹ تھے۔ دو منزلہ بلڈنگ کافی وسیع
 تھی۔ دوا اندر چلا گیا۔ ایمر جنسی میں کئی مرد و زن موجود تھے۔ کچھ بوڑھے جو میز جیوں یا غسل خانوں وغیرہ سے گر کر
 آئے تھے وہیل چیئرز پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ چند افراد اسٹریچرز پر بھی تھے۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے آ کر
 بادی کی چوٹ کا سرسری معائنہ کیا اور انتظار کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کا نظام کچھ ایسا قابل رشک
 نہیں ہے۔ مرلیف کر اور ہے تھے۔ بلند آواز میں بڑا بڑا رہے تھے۔ ڈاکٹروں کو پکار رہے تھے لیکن وہ اپنی روٹھن کے
 متعلق کام کر رہے تھے۔ چالیس پچاس مرلیفوں کے لیے غالباً دو تین ڈاکٹری میسر تھے۔ بادی بھی بیٹھ بیٹھ کر اکتا
 رہا۔ دوا وہاں جانے کا سوچ رہا تھا جب شور سن کر چونک گیا۔ ایک پارٹیشن کی دوسری جانب بھی مرلیف بیٹھے تھے۔
 یہ غالباً ایمر جنسی والے نہیں تھے۔ شور اسی جانب سے اٹھا تھا۔ کچھ دیگر افراد کی طرح بادی نے بھی جا کر دیکھا۔ ایک
 خاتون انتظار گاہ میں بیٹھ بیٹھ موصوفے پر گر کر رہے ہوش ہوئی تھی۔ لوگ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک
 نے اسے سہارا دے کر پانی کا گلاس اس کے منہ سے لٹکایا۔ اسے دیکھ کر بادی بے طرح چونکا۔ یہ وہی نیک
 صورت خاتون تھی جنہیں اس نے کل ظہیر کے گھر میں دیکھا تھا۔ بادی کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی تھیں۔
 اسے میں ایک انداز میں ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے لوگوں کو پیچھے بنایا اور خاتون کا معائنہ کیا۔ انہوں نے اب
 آنکھیں کھول دی تھیں اور دیکھ کر سانس لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر انہیں سہارا دے کر اپنے ساتھ ہی کمرے میں لے گیا۔
 ایک عورت انگریزی میں پوچھ رہی تھی۔

”اتنا طویل انتظار کرواؤ گے تو ظہیر مرلیف ایسے ہی بے ہوش ہو ہو کر گر گئے۔“

”نائن ڈاکٹر نے سن لیا۔ واپس مڑ کر اس نے پوچھنے والی خاتون سے تنگ لہجہ میں پوچھ لیا۔ الفاظ بادی کی سمجھ
 میں نہیں آتے۔ دو چار تند جملوں کے تبادلے کے بعد یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

دو عورت خاتون جو بادی کی معلومات کے مطابق جلال الدین کی ساس تھی اب ڈاکٹر کے ساتھ مشورے کے
 کمرے میں تھیں۔ بادی اسے یہاں دیکھ کر بے حد حیران ہوا تھا عورت کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ وہ اب
 پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ لیکن رنگ اب بھی ہلکا تھا۔ ایک نرس اسے سہارا دے کر لائی اور صوفے پر بٹھا دیا۔

ایک بار پھر بر کوئی اپنے اپنے کام میں لگ گیا۔ بادی عورت کے قریب جا بیٹھا۔ ”ماں جی! اب آپ کیسا
 محسوس کر رہی ہیں؟“ وہ اردو میں بولا تو عورت چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اپنائیت نمودار
 ہوئی۔

”اللہ کا شکر ہے۔ اب ٹھیک ہوں۔ بس ہلکا ہلکا پیکر آ رہے ہیں دم کون ہو؟“

”میرا نام بادی ہے۔ پاکستان سے ہوں۔ آپ بھی پاکستان سے ہیں؟“

”ہاں مجرات سے اور تم؟“

نرس کے پھولوں کی مہک دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ سورج کی ترجمی کر نہیں درختوں کی چونچوں پر جھلسلا۔ ہی تھیں۔
 اکثر یورپی عکس کی طرح فضا گرد و غبار سے پاک تھی۔ اس لیے ہر شے دکتی نظر آتی تھی۔ بادی سوچنے لگا۔ کیا ایسا ہو
 سکتا ہے کہ ظہیر واقعی اس گھر کے کسی کمرے میں موجود ہو۔ اسی فضا میں سانس لے رہی ہو۔ اس نے دوپہر سے کئی
 بار سوچا تھا کہ ملازمہ شریفیال سے کچھ سن گن لے لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ ابھی شریفیال سے اس کی جان بچان میں
 درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ ایسے سوالات کر سکتا۔ ویسے بھی اسے اس گھر میں آئے ابھی سات آنکھ گھٹنے ہی ہوئے
 تھے۔

اچانک وہ ایک منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی نگاہ ہائش حصے کی طرف گئی تھی۔ رہائشی نے کوکھا دینا کی ایک چار پانچ
 فٹ اونچی باڑے تلچھہ کر رکھا تھا۔ باڑے کے قریب پھول دار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ اتنا کیا یہاں کے قریب بادی کو
 کچھ گرد آلود پھل پڑے نظر آئے یوں لگا جیسے یہ پھل کچھ عرصے اوپر سے باہر پھینک دیئے گئے ہو۔ پھل کچھ
 انگوڑوں کے تھے۔ انجیریں تھیں۔ کچھ کیلے اور تروتازہ لہو شاپتان تھیں۔ یقیناً یہی وہ پھل تھا جو قباب کی دکانوں
 میں لے کر آئی تھیں۔

بادی سمجھ گیا۔ یہ پھل گرائیں جگہ پھینکا گیا تھا۔ غالباً گھر کی مالک اس پھل کی آواز پسند نہیں آتی تھی۔ شاید اب
 کسی نوکر کو بھی اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس پھل کو سمیٹ کر بوڑے دان میں ڈال دیتا۔ وہ جہاں کا جہاں پڑا تھا۔
 پتا نہیں کہ اس گھر میں کس طرح کا تناؤ چل رہا تھا۔ چھوٹا بھائی ظہیر جتنا خوش باش تھا بڑا بھائی جلال اتنا
 خاموش طبع تھا۔ گھر میں اس کا کافی رعب و اب بھی نظر آتا تھا۔ اگر جلال کی بیوی اور ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو
 رہا تھا تو ممکن تھا کہ اس میں جلال کا اپنا ہاتھ بھی ہو۔

بہر حال بادی کو ان باتوں سے کیا لینا دینا تھا۔ وہ کسی اور مقصد سے یہاں آیا تھا اور ابھی تک اس مقصد کی
 جھلک اسے نظر نہیں آتی تھی۔

○ ○ ○ ○ ○

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ظہیر الدین اپنے ڈیپارٹمنٹل سنور سے لوٹ آیا۔ وہ خاصا پُر جوش تھا۔ اس نے
 بتایا کہ کل اس کا ایک دوست اس سے ملنے آئے گا۔ وہ گلوکاری بھی کرتا ہے اور بادی کے گیتوں کا مداح ہے۔
 جو خاطر تو منع یہاں بادی کی دوری تھی اس کے عوض ظہیر کے دو چار دوستوں سے ملنا کوئی بڑی مشقت نہیں
 تھی۔

اگلے روز ظہیر باتھنے کے فوراً بعد اپنے کام سے نکلا گیا۔ اس نے بادی سے کہا کہ ایک ڈرائیور اور گاڑی اس
 کے لیے تیار رہیں گے۔ وہ کہیں بھی جانا چاہے شریفیال یا مقصود کو بتا دے۔ مقصود مہمان خانے کے ملازم لڑکے کا کام
 تھا۔

دس بجے کے قریب بادی نکلا ضرور لیکن گاڑی پر نہیں۔ وہ اپنی مرضی اور آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتا تھا۔ اتنا
 نے ڈیڑھ دو گھنٹہ سڑک کے ذریعے طے کیے پھر پیدل چلنا شروع کر دیا۔ کلائی کا زخم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔

ایک قبول صورت نو جوان تیزی سے ٹیکسی کی طرف آیا۔ اس نے خاتون کی جانب والا دروازہ کھولا۔ ہادی کو دیکھ کر بھی وہ قدرے حیران ہوا۔ "فخریت امی جی!!" اس نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں فیصل! بس ذرا چکر سا آگیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔"

"آ... آپ کا رنگ تو بالکل پیلا ہو رہا ہے۔" نو جوان نے پریشانی سے کہا۔

"اب تم مجھے کہہ کر اور پیلا کر دو گے۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرائیں۔

فیصل نامی اس نو جوان نے سہارا دے کر والدہ کو ٹیکسی سے اُتارا۔ ہادی نے شاہرزادہ نکالے۔ شاہرزادہ میں ایک مضامی والا ذہن بھی تھا۔ یہ پاکستانی ٹاپ مشائی تھی ہادی کرایہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر فیصل نامی نو جوان نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ خاتون کے اصرار پر ہادی بھی ان کے ساتھ ہی گراہی لان میں چلا گیا۔ ملازم نے پھرتی سے دو تین کرسیاں مزید وہاں رکھ دی تھیں۔

ہم وطنی کی طرح بول چال اور لب و لہجہ بھی ایک دوسرے کو قریب لانے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ہادی کی طرح یہ لوگ بھی وسطی پنجاب کے رہنے والے تھے اس لیے قحوظی ہی دیر میں آپس میں مل گئے۔ خاتون کا نام صوفیہ تھا۔ ان کے تین بچے تھے۔ ایک فیصل جو یہاں موجود تھا۔ بڑی بیٹی اپنے میاں کے ساتھ جرمنی میں تھی۔ دوسری بیٹی جناب یہاں جلال الدین کی بیوی تھی۔ کچھ بڑی بالوں اور بینک والا ایک کزور سا ادیبز عمر شخص فیصل اور جناب کا والد تھا۔ ان کا نام بعد ازاں فیاض احمد معلوم ہوا۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ہادی کے انکار کے باوجود فیاض صاحب نے اسے روکے رکھا اور کہا کہ وہ کھانا کھا کر جائے گا۔ پروگرام لان میں ہی کھانے کا تھا۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے مظلوم ایرا لود ہو گیا۔ وہ لوگ اندر بے سہائے روم میں آ گئے۔ لوگ بھی کھاتے پہنچے مگر اسے کتے تھے۔ بہر حال نصیر الدین اور جلال الدین والی لڑکیاں ابونت یہاں نظر نہیں آتی تھی۔ ہادی نے اس بارے میں بالکل خاموشی اختیار کی کہ وہ آج کل جلال الدین کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اپنی رہائش کے بارے میں سوال کا اس نے گول مول سا جواب دیا اور کہا کہ وہ پہلے ہوٹل میں تھا، پھر ایک قریبی دوست کے اصرار پر اس کے گھر میں شفقت ہو گیا ہے۔ اس نے اٹنی میں اپنی آمد کا مقصد سیر و سیاحت ہی بتایا۔ اپنے پردیش کے کامرے میں بھی اس نے کوئی خاص بات نہیں کی۔

کھانے کے دوران میں ہی ہادی نے نو جوان کو دیکھ کر حیران ہوئے لگا۔ روم میں ہادی کی یہ جگہ بارش تھی اور ایسی تازہ توڑ کہ بس سماں بندھ گیا تھا۔ اس کے مزید ارہونے کی ایک وجہ اس کا بالکل پاکستانی طرز کا ہونا بھی تھا۔ فیاض صاحب کا فیصل دیکھ کر ہادی کی باتوں سے ہٹا چلا تھا کہ وہ لوگ پندرہ بیس سال سے یہاں مقیم ہیں۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے اپنے زمانہ پہنچے ہیں پاکستانیت برقرار رکھی ہوئی تھی۔ فیاض صاحب نے بچوں کو دینی تعلیم بھی دلائی تھی اور اپنی ثقافت سے دور نہیں ہوئے دیا تھا۔

کچھ عرصہ کا اصرار تھا۔ کچھ دیر سے بھی یہ فیصل آج کچھ خوش نظر آ رہی تھی۔ کھانے کی گئی اور ہادی کو بھی کھانے

"میں لاہور سے ہوں۔"

"میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔ تم لاہور کے ہو گے۔" وہ خوش دلی سے بولیں اور پھر لیے سانس لینے لگیں۔ انہوں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک نرس کو آواز دے کر بلانے کی کوشش کی لیکن وہ سنی ان کی کرتی تیزی سے نکل گئی۔

"آپ نے کیا کہنا ہے اس سے؟"

"کچھ نہیں بیٹا! یہ میرا تھوڑا سا سامان ہے۔ کوئی مدد کر کے مجھے ٹیکسی تک پہنچا دے تو..." انہوں نے ایک طرف رکھے شاہرزادہ کی جانب اشارہ کیا۔ خاتون وہ شاہرزادہ کرتے ہوئے اس طرف آئی تھیں۔

"میں پہنچا دیتا ہوں ماں! یہاں کہاں جانا ہے آپ کو؟ میرا مطلب ہے رہائش کہاں ہے آپ کی؟"

"زیادہ دور نہیں۔ یہیں" ایون میوز کے علاقے میں رہتی ہوں۔" انہوں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے

کہا۔

"چلیں میں چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔ آپ کی طبیعت بھی پوری طرح ٹھیک نہیں۔"

"نہیں... میں چلی جاؤں گی۔ بس ٹیکسی..."

"اٹھیں... اٹھیں... آپ آئیں۔" ہادی نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور انہیں سہارا دے کر اٹھا لیا۔

اس مہربان چہرے والی خاتون کے لیے وہ ولی ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے ان کے شاہرزادہ کو اس نے دوسرا بازو ان کی بغل کے نیچے رکھا اور انہیں سپورٹ دیتا ہوا ہسپتال سے باہر آ گیا۔ باہر وہ آؤٹ کی تو سے پاک تازہ ہوا تھی۔ اب دو پہر کا ایک بج چکا تھا۔

چند قدم چل کر خاتون ہانپ گئیں لیکن کوشش کر کے چلتی رہیں۔ وہ دونوں ایک ٹیکسی تک پہنچے اور روانہ ہو گئیں۔ خاتون نے کہا۔ "ویسے تو ایک کینک ہمارے گھر کے پاس بھی ہے لیکن میرا ہسپتال انشورنس کا کارڈ اس ہسپتال کا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر تیسرے چوتھے روز یہاں آنا پڑتا ہے۔"

"مسئلہ کیا ہے آپ کا؟"

"بس بیٹا! وہی بڑھاپے کی بیماریاں، بلڈ پریشر ہے۔ کبھی کبھی سانس کی تکلیف بھی ہو جاتی ہے۔"

"آج تو آپ بے ہوش ہی ہو گئی تھیں۔"

"بس چکر سا آگیا تھا۔"

ان کی باتوں کے دوران میں ہی ٹیکسی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی۔ خاتون نے ایک سیاہیٹ کے سامنے ٹیکسی رکوٹی۔ بارن دینے پر گیت کھل گیا۔ ٹیکسی اندر داخل ہو گئی۔ سبز گراہی لان میں سفید کرسیوں پر دو افراد بیٹھے تھے۔ ایک ملازم انہیں شردب پیش کر رہا تھا۔ خاتون نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کسی کو بتانا نہیں کہ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ خراخراؤ پریشان ہوں گے۔ بس کہہ دینا زدا سانس خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے چھوڑنے آ گیا۔"

سب ایک دم گم سم نظر آنے لگے تھے۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی خالہ صوفیہ کے ساتھ ساتھ لیبل بھی لپک کر فون کی طرف چلا گیا۔ ہادی اور فیاض صاحب کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ ”وہ..... پہلے سے بیمار تھی“ ہادی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

فیاض صاحب بے تکلف گفتگو کرتے تھے۔ اب بھی انہوں نے واضح انداز میں بات کی۔ کہنے لگے۔ ”ہماری بیٹی کی شادی کو ڈھائی تین سال ہوئے ہیں۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ اب اللہ نے آس نکائی ہے۔ اسی سلسلے میں شاید طبیعت تھوڑی بہت خراب ہوئی ہے۔“

”اللہ بہتر کرے۔“ ہادی نے کہا۔

دوسرے کمرے میں خالہ صوفیہ فون پر بات کر رہی تھیں۔ لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ حجاب کا یا اس کے سر ایلوں کا فون نہیں ہے۔ کوئی دوسری نوعیت کی بات ہو رہی تھی۔ فیاض صاحب اپنے موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ لیکن پھر کرتے کرتے رک گئے۔ سامنے تپائی پر مٹھائی کا ڈبہ پڑا تھا۔ اب یہ بات ہادی کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے کھائی جانے والی مٹھائی اسی ”خوشی“ کے سلسلے میں تھی جس کا ذکر ابھی فیاض صاحب نے کیا تھا۔

دو چار منٹ بعد خالہ صوفیہ اور فیصل کمرے میں واپس آ گئے۔ دونوں ابھی تک پریشان تھے۔ خالہ صوفیہ نے کہا۔ ”حجاب کی تبدیلی غیرہ کا فون تھا۔ بتا رہی تھی کہ حجاب کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تھی۔ کل ساری رات ہی ہسپتال میں رہی ہے۔ لی بی بی بہت کم ہو گیا تھا۔“

فیاض صاحب بوکے۔ ”ان لوگوں کو کم از کم بتانا تو چاہیے تھا ہمیں۔ ایک فون ہی کر دیتے جلال خود تو شہر سے ہے اور واجدہ کا آپ کو پتا ہی ہے۔“ خالہ صوفیہ نے کہا۔

فیصل گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں ہسپتال کے لڑکے گئے تھے۔ وہاں کے اسٹینڈرڈ کا تو پتا ہی ہے سب بیمار تو مشہور ہے کہ باقی کو چند دن کے لیے یہاں لے آئیں۔ ڈاکٹر انکل بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں ہم سب کی طبیعت کو۔ باقی کو تو ہمیشہ آرام ہی ان سے آتا ہے۔“

”لیکن جلال کی ماں مان جائے گی۔“ فیاض صاحب بولے۔

”آ..... آپ فون کر کے دیکھ لیں۔“

”نہیں بھی میں تو نہیں کروں گا۔ اب میں کوئی سخت بات نہ ہو جائے اس سے یا مجھ سے۔“

”میں کر لیتا ہوں۔“ فیصل نے کہا۔

”نہیں..... تم تو بالکل نہیں کرو گے۔“ خالہ صوفیہ بولیں۔

”تو پھر کون کرے گا امی؟“

”چلیں..... میں کر کے دیکھتی ہوں۔“ خالہ صوفیہ نے کہا۔

”کیا ہوگی؟“ فیاض صاحب نے پوچھا۔

گئی۔ غائبانہ لوگوں کے لیے یہ کوئی مسرت کا موقع تھا۔ مگر اس موقع کے بارے میں ہادی کو کچھ بتایا نہیں گیا۔ کھانے کے بعد قلمی آم رکھے گئے۔ یہ پاکستانی آم تھے۔ بالکل بھی لکھ جیسے لاہور کی بارش ہے اور لاہور ہی کے آم ہیں۔ آم کھانے کے بعد ہادی ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف آیا مگر کسی وجہ سے وہاں پانی نہیں آ رہا تھا۔ لیبل اسے ایک قلمی کمرے میں لے آیا۔ یہاں واش بیسن موجود تھا اور پانی بھی۔ اس کمرے کی ایک دیوار پر ایک بڑی سی تصویر لگی تھی۔ یہ دراصل ایک شاندار پینل اسکیچ تھا۔ بالکل فوٹو گراف کی طرح محسوس ہوتا تھا اس بلیک اینڈ وائٹ اسکیچ نے فرش کے چھت تک پوری دیوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ ایک قبول صورت لڑکی تھی اس کے بال نفاس سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ پہلے تو ہادی نے سمجھا شاید یہ حجاب ہی کا پورٹریٹ ہے۔ لیکن پھر اس کی نظر نیچے لکھے ہوئے ایک فقرے پر پڑی۔ ”انجمن کے کفن کش رسم الخط میں لکھا تھا۔“ میں جہیں بھی جھول نہ پاؤں گی۔ اس فقرے کے نیچے لکھنے والی کا نام حجاب فیاض لکھا تھا۔

بس ایک نظر اس تصویر پر ڈالتا ہوا ہادی کمرے سے باہر آ گیا۔

بارش ایک بار شروع ہوئی تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ کمرچ چمک بھی جاری تھی۔ موسم کی گرمی ایک نہایت خوشگوار خشکی میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ اب ہادی بے تکلفی سے فیاض صاحب کو بالکل فیاض اور ان کی بیوی کو خالہ جان کہہ کر بلارہا تھا۔ خالہ صوفیہ اب چائے بنا رہی تھیں۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے کا وہ واقعہ قریباً بھول چکی تھیں جب انہیں ہسپتال میں چمکرایا تھا اور وہ باقاعدہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ خاصی باہمت اور نڈر ہار خاتون تھیں وہ۔ انہوں نے بڑی بے تکلف دودھ پتی بنائی۔ روم کی سوسلا دھار بارش میں بیٹھ کر لاہور کا چونس کھانے اور مہجرات کیا دودھ پتی پینے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ باتوں سے معلوم ہوا کہ فیاض صاحب یہاں ایک کالج میں پڑھاتے رہے ہیں۔ اب راجا ٹرڈ اور ہیں اور ایک قریبی آفس میں جڑواں کام کرتے ہیں۔ بیٹا فیصل ایم بی اے کرنے کے بعد ایک معقول جاب کر رہا ہے۔ یہ گھبران کا اپنا تھا۔ ہادی نے بھی اپنے بارے میں کافی کچھ بتایا، سوائے اس کے کہ وہ آج کل حجاب کے سرسبز علاقے کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔

اتنے میں فون کی بیل ہوئی۔ فیاض صاحب نے جا کر فون سنا۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

”خیر یہ ہے نا؟“ خالہ صوفیہ نے پوچھا۔

”واجدہ کا فون تھا۔ حجاب کی طبیعت خراب ہے۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ خالہ صوفیہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”الٹی وغیرہ آ رہی ہے۔ بلڈ پریشر بہت گر گیا تھا۔ رات کو دو تین گھنٹے ہسپتال بھی رہی ہے۔“

”ہائے اللہ! اب کیسی ہے؟“

”واجدہ تو یہی کہہ رہی تھی کہ بہتر ہے۔ آگے اللہ جانے۔“

”مم..... میں فون کروں حجاب کو؟“

”نہیں..... ابھی نہ کرو۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ دیر بعد خود ہی کر لے۔“

بیت دباؤ میں تھے۔ ہادی کا دھیان بار بار اس دیوار گیر تصویر کی طرف بھی جا رہا تھا جو یہاں ایک کمرے میں آویزاں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کی تصویر ہے جو اب اس دنیا میں نہیں یا پھر اتنی دور ہے کہ اس سے ملاقات ممکن نہیں۔ وہ حجاب کی بہن تو ہرگز نہیں لگتی تھی۔ بہر حال ہادی نے اس سلسلے میں فیاض صاحب سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

شام کے وقت بارش میں وقفہ آیا اور ہادی ان لوگوں سے رخصت ہو کر واپس اپنی قیام گاہ پر واپس آ گیا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ سے اپنی کلائی کی سرہم بنی بھی کروائی اور ڈاکٹری لٹچے پر دوا بھی لے لی۔ ظہیر بھی اپنے کام سے واپس آ چکا تھا۔ اس کا موڈ آج کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ بہر حال وہ دیر تک ہادی کے پاس بیٹھا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ ہادی نے اسے بتایا کہ اس نے کلائی کی جینز بیچ کر وائی ہے۔ ہسپتال کی بدانتظامی کا نقشہ بھی اس نے ظہیر کے سامنے کھینچا۔ ظہیر نے اقرار کیا کہ یہاں کے کئی سرکاری ہسپتالوں کی صورت حال مایوس کن ہے۔

منشیہ کے دوران میں ہادی نے بار بار کوشش کی کہ کسی طرح غلیظ اکا کوئی کھوج باتھ آ سکے۔ اس گھر میں کل چھ کمرے تھے۔ ظہیر اس کی بیوی فوزیہ، اس کے بڑے بھائی جلال، بھابی حجاب، والدہ واجدہ بیگم اور ظہیر کی ایک سال بڑی بہن ارم بھی آج کل ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔

ہادی نے ذیل میں مقولات کرتے ہوئے ظہیر سے پوچھا۔ "آپ کی سسران لاہ (ارم) آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتی؟"

"وہ اکاؤنٹنسی کر رہی ہے۔ منشیہ کی یونیورسٹی میں داخلہ ملا تھا اس لیے وہیں رہنا پڑ رہا ہے۔" منشیہ کے نام پر ہادی کا دل دھڑکا۔ کس طرح ظہیر اور ارم ہی تو نہیں تھی؟ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنا نام غلط لکھا ہو۔ ہادی نے صاف دیکھا تھا کہ جلال کے مطابق منشیہ اس کا چھوٹا بھائی ظہیر زیادہ کمر ذہن کا نہیں ہے۔ وہ مذہبی معاملات پر زیادہ سخت رائے نہیں رکھتا تھا۔ اس کی بیوی فوزیہ بھی یوں تو پردہ کرتی تھی۔ مگر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلال کی نیکی کی نسبت قدرے روشن خیال ہے۔ ظہیر کو بھی ہادی نے خاصے ایڈوائس روپ میں دیکھا تھا۔ تو کیا ظہیر اسی دراصل ارم ہے؟

"بڑی خوش مزاج ہے۔ ظہیر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "سیر پائے کی بھی شوقین ہے۔ دو تین بار پاکستان جا چکی ہے۔ پاکستان کے بارے میں جتنا جانتی ہے شاید ہم بھی نہیں جانتے۔ یہاں ہوتی تو آپ کو لاہور کی گلیوں کے نام بھی بتا دیتی اور یہ بھی بتا دیتی کہ کون سی گلی میں کون سی چٹارے دار شے بکتی ہے۔"

"پھر تو ان سے ملنا چاہیے تھا۔ مجھے بھی ابھی جیت پنی چیزوں کا شوق چڑھا ہے۔" ہادی نے بات بھائی۔

"ویسے چار پانچ دن میں اسے آتا تو ہے۔ اگر آپ تب تک یہاں تو پھر ملاقات ہو سکتی ہے۔" ظہیر نے عام سے لہجے میں کہا۔

"آپ بتائیں۔" خال صوفیہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "اس سے کہو کہ دو تین دن کے لیے بھیج دیں حجاب کو عطا ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے ڈراجنزل چیک آپ کر لے گا۔" حجاب کا۔

"اچھا میں کرتی ہوں بات۔" خال صوفیہ نے کہا اور پھر ڈھمکتی ہوئی سی فون کرنے چلی گئیں۔ ہادی بظاہر لائق تھی۔ ایک انگلش میگزین دیکھ رہا تھا مگر اس کی توجہ گفتگو کی طرف ہی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ حجاب کے سرہانوں سے کتنے سے رہتے ہیں۔ ایک دن پہلے وہ اپنی آنکھوں سے بھی خال صوفیہ کی بے چارگی کا منظر دیکھ چکا تھا۔ گھر میں حجاب کی ساس کے آنے کے تھوڑی سی دیر بعد خال صوفیہ گھر آئی ہوئی سی گھر سے نکل گئی تھیں۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد بھی نے وہ پھل بھی باہر پھینک دیا تھا جو وہ بڑی چاشت سے بنی کے لیے لے کر گئی ہوں گی۔

دوسرے کمرے میں خال صوفیہ، حجاب کی ساس کو فون کر رہی تھیں۔ یہاں کمرے میں فیاض صاحب اور چہروں پر تناؤ لیے بیٹھے تھے۔ خال صوفیہ بڑی مسناتی ہوئی عاجزاہ آواز میں بول رہی تھیں۔ الفاظ ہادی تک نہ پہنچ رہے تھے۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئیں۔ ان کے چہرے پر مایوسی کا سایہ تھا۔ "کیا کیا واجدہ نے؟" فیاض صاحب نے پوچھا۔

"واجدہ سے نہیں۔ جلال سے بات ہوئی ہے۔ وہ آگیا ہے واپس۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے۔ اب وہ ٹھیک ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں اور کہتا ہے کہ ہم بھی کوئی ایسی بات نہ کرے۔"

سے حجاب شش و پنج میں پڑے۔

"حجاب نے بات کی؟"

"نہیں جلال بتا رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔"

"وہ تو جب بھی فون کریں، یہی بتاتے ہیں کہ سو رہی ہیں، ہاتھ روم میں ہیں، دس دھند فون کریں تو ایک دھند بات ہوتی ہے۔" فیصل نے نمہ اساتہ بنا کر کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"ہمیں جانا چاہیے؟" فیاض صاحب نے بیوی سے پوچھا۔

"جانا تو چاہیے۔ لیکن پتا نہیں وہ نمہ اندہ مانیں۔ یا پھر پہلے ایک بار فون پر حجاب سے بات جائے۔"

"چلو انتظار کر لو۔" فیاض صاحب نے کہا۔ شاید وہ سچو اور بھی کہتا چاہو رہے تھے مگر ہادی کی موجودگی کا خیال

کے موضوع بدل دیا۔ گفتگو کا رخ مسلسل برسنے والی بارش کی طرف مڑ گیا۔

ہادی اس گھر کی صورت حال دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ یہ لوگ حجاب کے سرہانوں کے حوالے

ہیں ان کا رعب بھی کافی ہے۔ بس وہ ہر ویلے باقی کو تنگ کر رکھتے ہیں۔
"باہی کے سینے والے کوئی عمل دخل نہیں دیتے؟" ہادی نے پوچھا۔

"نہیں جی! بڑے شریف لوگ ہیں۔ ان کے تو ہر ویلے سادہ (سائس) سوکھے رہتے ہیں۔ باہی سے ملنے بھی آتے ہیں تو ڈر کر کہیں بھائی جان! راض نہ ہو جائیں۔ باہی کی طبیعت پرسوں سے خراب تھی۔ پران و چارواں کی ہمت نہیں ہوئی آنے کی۔ کل رات نوبہ آئے تھے بس تھوڑی دیر کے لیے۔ کسی نے چائے تک نہیں پوچھی ان کو۔ بعد میں ڈے بھائی جان آئے تو میں نے ان سے پوچھ کر چائے بنائی۔"

شریفاں جو کچھ بتا رہی تھی۔ اس کی تصدیق ہادی کے سامنے ہو چکی تھی۔ آج انکل فیاض کے گھر میں اس نے وہ سارا تاؤ اور خوف اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو بیٹی کے سسرال کے حوالے سے ان لوگوں کے دل میں موجود تھا۔

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سیانے کہتے ہیں، ظلم سہتا اور مسلسل سبتہ رہنا بھی ظلم ہے۔ تمہاری باہی باہی احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔"

"وہ تو بالکل اللہ میاں کی گائے ہیں جی! اگر ان میں تھوڑی بہت ہمت تھی بھی تو اب ختم ہو چکی ہے۔ شروع شروع دو چار مہینے وہ شاید ڈے بھائی جان کے سامنے بولی ہوں گی لیکن اب تو انہوں نے اپنی زبان بالکل بند کر لی ہے۔" می جی کے سوا کچھ کہتی ہی نہیں۔ پھر بھی ان کی شامت آئی رہتی ہے۔ پڑھی لکھی ہیں۔ سمجھ دار ہیں۔ پر ڈے بھائی جان کے سامنے ایسے ہوتی ہیں جیسے کوئی قمر قرآن پتی سکول کی کڑی ہو۔ خدا واسطے کی گل کی جائے تو انہوں نے اپنے بندے کے لیے خوراک بالکل مار لیا ہوا ہے۔ اپنی کوئی مرضی رکھی ہی نہیں ہے۔ ڈے بھائی جان کے کچھ گھر میں بھی پورا پردہ کرتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ چھوٹے بھائی جان ظہیر وغیرہ کے سامنے بھی نہیں آتیں۔ ان کی کسی سہمی سہمی سے تعلق واسطہ نہیں رکھا ہوا، انہیں ٹیبلٹوں میں رکھا ہوا۔ ماں بیٹے کے گھر آنا جانا نہ ہونے کے برابر کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی ایسا کام نہ ہو جو ڈے بھائی جان کو برا لگتا ہو۔ پھر بھی پتا نہیں کیا بات ہے ڈے بھائی جان کو بولنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ بھائی صاحب ہاتھ وغیرہ بھی اٹھاتے ہوں اس پر؟" ہادی نے خیال ظاہر کیا۔
"ابھی تک تو نہیں جی! لیکن ہمیں قسم کے ماطے پل رہے ہیں۔ کسی دن یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے جی! اب دیکھیں یہ بیاری والی گل بھی بھلا کھئی کے بس کی ہوتی ہے آپا خانم (جلال کی والدہ) کہتی ہیں کہ وہ ٹار اس لیے ہوئی ہیں کہ انہوں نے اپنی ماں کے گھر سے آئی ہوئی انجیریں کھائی ہیں۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ ڈی باہی نے انجیر کھیں بھی نہیں تھی۔ ایسے ہی بیکار باہی بھلا تھے ہیں۔" ہادی کو وہ پھل یاد آیا جو باز سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔

"ظہیر اور جلال صاحب کی والدہ کا سلوک کیا ہے تمہاری ڈی باہی کے ساتھ؟" ہادی نے پوچھا۔
"آپا خانم زیادہ تر بیٹے کا ساتھ ہی دیتی ہیں جی! پر ڈے بھائی جان غصے کے تیز ہیں۔ کبھی کبھار آپا خانم سے

اسی دوران میں ملازمہ شریفاں تیزی سے اندر آئی۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اس نے ظہیر سے کہا۔ "بھائی جان آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ظہیر تیزی سے شریفاں کے ساتھ چلا گیا۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے رہائشی حصے کی باز کے پیچھے اور جمل ہو گئے۔ دو تین منٹ بعد ہادی نے دیکھا کہ ایک بڑی کار تیزی سے پورچ کی طرف سے آئی اور میں گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اندھیرے میں ہادی صرف اتنا ہی دیکھ سکا کہ فرنٹ سیٹ پر ظہیر موجود تھا۔
"کہیں حجاب کی طبیعت پھر خراب نہیں ہو گئی۔" ہادی نے سوچا۔

اس بات کا جواب اسے قریباً پندرہ منٹ بعد ملا جب شریفاں واپس انگلیسی میں آئی۔ "کیا بات تھی شریفاں؟" ہادی نے پوچھا۔

"بڑی باہی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ انہیں پھر ہسپتال لے کر گئے ہیں۔" وہ رد ہادی اور بولی۔

"کیا ہوا ہے؟"
"کچھ پتا نہیں جی! بس دعا کریں۔ اس ویلے تو بے ہوش ہیں وہ۔" شریفاں نے گول مول بات کی۔ وہ باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔

یہ موقع اچھا تھا۔ ہادی، حجاب کے بارے میں اس سے مزید پوچھ سکتا تھا۔ اس نے ایک دو منٹ کیے جن کے جواب میں شریفاں نے بتایا۔ "وڈی باہی بہت چٹکی ہیں جی اتنی چٹکی جتنا کوئی سوچ سکتا ہے۔ پر اس گھر میں ان سے سلوک چنگا نہیں ہے۔ خاص طور سے ڈے بھائی جان تو ان پر ہر ویلے بہت غصے میں رہتے ہیں۔"
"ڈے بھائی جان یعنی حجاب کے میاں؟"

"آہ جی..... دراصل....." وہ کہتے کہتے تھک کر خاموش ہو گئی۔
"کہہ دو شریفاں! جو کہو گی صرف میرے تنگ ہی رہے گا۔"

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "کسی سے گل نہ کرنا جی آپ، پہلے ہی سارے کہتے ہیں شریفاں بڑا بولتی ہے۔"
ہادی نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ وہ بولی۔ "دراصل ڈے بھائی جان اور وڈی باہی میں شادی سے پہلے عیاں ناچاتی ہو گئی تھی۔ وڈی باہی کمپیوٹر پڑھی ہوئی ہیں۔ کافی لائق ہیں۔ ڈے بھائی جان کا رو باری ٹائپ کے ہیں۔ منگنی کے بعد وڈی باہی نے کہیں ڈے بھائی جان سے کہہ دیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے چاچا جی کے دفتر میں تین چار گھنٹے کی نوکری کر لوں۔ بس اسی گل کا بہت بڑا جھگڑا بن گیا۔ منگنی ٹوٹنے لگتی تھی۔ بعد میں وڈی باہی ماں بھی گئیں کہ وہ نوکری نہیں کریں گی۔ شادی بھی ہو گئی۔ وہ اس گھر میں بھی آگئیں۔ پر وہ نوکری والی گل ڈے بھائی جان کے دل میں ہی رہی۔ شادی کے سینے ڈیزدھ دو سینے بعد ہی دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ ساری دنیا جانتی ہے شادی کے بعد تو کڑی و چاری لا چا رہی ہو جاتی ہے۔ بندے کا چلہ ایک دم بھارا ہو جاتا ہے۔ باہی و چاری نے جھگڑا کیا کرتا تھا۔ بھائی جان کی طرف سے ہی ہوتا تھا۔ بھائی جان ویسے بھی مرد و چ باہی سے چھ ست سال وڈے

پچ تو نہیں ہے۔ کا۔ اب اللہ کرے وہ صحیح سلامت گھر آ جائیں۔

وہ کاجڑی میں بیٹھنے اور روم کی سرکوں پر فرارنے بھرتے تیزی سے ماڈو ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سفید "لان سیا" کاجڑی ظہیر خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ حجاب کی ابارشن کا سن کر ہادی کو دی آنکسوں ہوا تھا۔ اب تک ہادی کو جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق وہ کافی تکلیفیں سہہ رہی تھیں۔ اب ایک اور پتا اس پر آن پڑی تھی۔

ہسپتال پہنچتے ہی ہادی کے خون کا نمونہ لیا گیا۔ کراس پیٹنگ ہو گئی اور ہادی نے خون کا ایک بیگ دے دیا۔ جب دو بیگ دے کر باہر نکل رہا تھا اس کی نگاہ اچانک حجاب کی والدہ اور بھائی فیصل پر پڑی۔ وہ تیزی سے آئی سی یو کی طرف جا رہے تھے ہادی ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس نے خالہ صوفیہ اور فیصل وغیرہ کو ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ یہاں جلال صاحب کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اور وہ ابھی اس تعلق کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ جلال آئی سی یو سے کچھ فاصلے پر آمدے میں موجود تھا اس کے چہرے پر ویسے بھی بروقت گہری سنجیدگی رہتی تھی اور اب تو صورت حال بھی کیمبرجی خالہ صوفیہ ڈرے ڈرے انداز میں داماد کے پاس پہنچیں۔ اس سے دو چار باتیں کیں دور سے بھی اسی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ خالہ صوفیہ اور فیصل کو سردمہری سے جواب دیئے گئے ہیں۔ پھر جلال اپنی سیاہ داڑھی میں لکڑیاں چلا کر ایک ڈاکٹر کے ساتھ ایک کوریڈور میں داخل ہو گیا۔

خالہ صوفیہ وہاں موجود ایک پردہ پوش خاتون سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ خاتون یقیناً ظہیر کی وائف فوزیہ ہی تھی۔ شریفان بھی شکر چہرے کے ساتھ یہیں موجود تھی۔

اتنے میں ہادی نے ظہیر زار جلال کی والدہ آپا خانم کو تیزی سے آتے دیکھا۔ وہ آئی سی یو کی طرف سے آ رہی تھیں۔ خالہ صوفیہ سے آپا خانم کی سلام دعا ہوئی۔ چند باتیں ہوئیں۔ پھر ایک دم نہ جانے کیا ہوا کہ بنجیدہ صورت آپا خانم بڑبڑا اٹھیں۔ بلند آواز سے بولیں۔ "کیسے سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ اچھی بھلی سیانی ہو تم۔ بال بچے پیدا کیے ہیں تم نے۔ تمہیں پتا نہیں تھا کہ اس حالت میں بی بی کو کیا کھانا ہے اور کیا نہیں۔"

لیکن واجدہ! وہ تو تمہارے سامنے جی بتا رہی تھی کہ اس نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔

خالہ صوفیہ رو بانی آواز میں بولیں۔ "لیکن واجدہ! تم کسی بھی ڈاکٹر حکیم سے پوچھ لو۔ انجیر کا پھل تو کسی طرح بھی نقصان دہ نہیں ہوتا۔"

"ہاں سب سے زیادہ ڈاکٹری اور حکمت تو تمہارے ہی خانہ ان میں ہے۔ لوگ پوچھ پوچھ کر چلتے ہیں تم سے۔" واجدہ نے جلی کئی آواز میں کہا۔ وہ اتنے بلند آواز میں بات کر رہی تھی کہ پچاس سانچہ فٹ دور ہادی کے کالوں تک صاف پہنچ رہی تھی۔

خالہ صوفیہ نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کہتے کہتے روٹھ گئیں۔ خود منہ واجدہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں اندرونی دھکی کی طرف چلی گئی۔ ماں بیٹا جس کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد جلال ان کے پاس سے گزرا لیکن ان کی طرف دیکھا

بھی لڑ پڑتے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے۔ ان دنوں ہادی سے آپا خانم کا سلوک کچھ چنگا ہو جاتا ہے۔ پر یہ وقتی بات ہی ہوتی ہے۔

"میرے خیال میں ظہیر صاحب تو تھوڑی بہت بھائی کی حمایت کرتے ہوں گے۔"

"آج بھی ظہیر بھائی جان اور ان کی بیوی بھی سمجھتے ہیں کہ اس گھروں کی وڈی وڈی ہادی کے ساتھ نہ اسلوک ہو رہا ہے۔ پر میں نے آپ کو بتایا ہے تاکہ وہ بھائی جان کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔"

ہادی اس گھر میں طویل عرصے سے آئی ہوئی تھی لیکن اب اسے اس دوسرے کردار میں بھی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ شریفان کے ساتھ منتقلی کے دوران میں ہادی نے باتوں کا رخ ایک بار پھر اپنے محفل پسند موضوع کی طرف موڑ دیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ظہیر کو ہی ارم نامی لڑکی ہے جو رشتے میں ظہیر کی سالی ہے اور اکاؤنٹنٹس پڑھنے کے لیے آج کل دینس میں مقیم ہے۔ کافی وہ کسی طرح ارم کی تصویر دیکھ سکتا لیکن تصویر وہاں شریفان سے لڑنے کی بہت سے نہیں ہوئی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد ہسپتال ہی سے ظہیر کا فون آیا۔ وہ ظہیر آواز میں بول رہا تھا کہ اس نے ہادی سے پوچھا کہ ہادی نے کھانا وغیرہ کھا لیا ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

ہادی نے پوچھا۔ "ظہیر بھائی! تمہاری بھائی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ اگلے ایک دو گھنٹے کافی اہم ہیں۔" ظہیر نے مختصر جواب دیا۔ ہادی نے بھی زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔

صبح ہادی جلدی بیدار ہو گیا۔ یہی کوئی سات ساڑھے سات کا وقت ہو گا۔ وہ کھٹ پٹ کی آوازوں سے جاگ رہا تھا۔ اس نے دیکھا ظہیر بڑی پریشان صورت کے ساتھ کمن روم میں موجود تھا۔ وہ کسی کو فون کر رہا تھا۔ ملازم لڑکا مقصود بھی لگرمندی سے تاثرات لیے اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ظہیر اپنے کسی رشتے دار سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو سے ہادی پر یہ انکشاف ہوا کہ ظہیر کی بھائی حجاب تشویشناک حالت میں ہے۔ اس کا ابارشن ہو گیا ہے اور ابارشن کے دوران میں کوئی پیچیدہ صورت حال پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے حجاب کے لیے خون کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ظہیر اسی سلسلے میں بات کر رہا تھا۔ اس نے جب بلند گروپ کا نام لیا تو ہادی چونک گیا۔ یہ اسے بی ٹیکنیک تھا یہ گروپ عام طور سے مشکل سے ملتا تھا۔ ہادی اٹھ کر ہاتھ روم میں گیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر آ گیا۔ ظہیر پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "بلڈ بینک میں مل جاتا تو پھر اتنی بھانگ دوز کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایک بول مقصود نے دی ہے ایک بول مقصود نے مزید پڑ سکتی ہے۔"

ہادی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ظہیر بھائی! میرا گروپ بھی اسے بی ٹیکنیک ہے۔ آپ مجھے ساتھ لے چلیں۔ اللہ ہے چاہا تو پیٹنگ بھی ہو جائے گی۔"

ظہیر کا چہرہ مکمل اٹھا۔ وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ بھائی اس وقت مشکل میں ہیں۔ ان

سکر کی کے سامنے سے گزرتا تھا۔ وہاں روشنی بھی تھی مین ممکن تھا کہ ”کارڈن لاسٹ“ کی اس دودھیا روشنی میں ارم کی ایک جھلک دیکھ سکتا۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی جھلک ہی نہیں اس کو بڑی وضاحت سے دیکھ سکے گا اور اس کی آواز بھی سن سکے گا۔

غیدان میں سیاہ گاڑی اندر داخل ہوئی لیکن رہائشی جسے کی طرف جانے کے بجائے انگلی کے سامنے رکب مچی۔ دراصل ظہیر یہاں اتر کر ہادی کی طرف آنا چاہتا تھا۔ ہادی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی نگاہیں گاڑی کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گاڑی کو ڈرائیور چلا کر لایا تھا۔ اس کے ساتھ والی نشست پر ظہیر تھا جو دروازہ کھول کر اپنے قریب جسم کو جھلاتا ہوا باہر نکل آیا۔ پچھلی نشست پر دو خواتین موجود تھیں۔ ایک کو تو اس کی سرنگی چادر سے ہادی نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ظہیر کی بیوی فوزیہ تھی۔ دوسری نے پردہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے سر پر فقط دودھ تھا۔ ہادی کی حیات سن کر آنکھوں میں آنکھیں۔ وہ یقیناً ارم ہی تھی جسے وہ لوگ ایئر پورٹ سے لے کر آئے تھے۔ ہادی اس کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ درمیان میں دودھ حال تھا۔ پھر صورت حال بدل گئی۔ دودھ والی لڑکی نے رخ پھیرا۔

کی کہانی اور ظہیر کی طرف ہاتھ ہلا کر چلی ”جلدی آئیے گا جیاجی“ اس کا پورا چہرہ ہادی کے سامنے تھا۔ ہادی دیکھتا رہ گیا۔ یہ ظہیر نہیں تھی۔ بھرے بھرے گالوں اور چھلے دار بالوں والی یہ کوئی اور لڑکی تھی۔ ہادی کے اندر جیسے کوئی تیز روشنی بجھ گئی۔ وہ گہری سانس لے کر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ آیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر سوچنے لگا۔ وہ کن پکڑوں میں پھنس گیا ہے۔

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور علامہ ظہیر جمومتا ہوا سا اندر آ گیا۔ ”دیکھو نام پر پہنچ گیا نا۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”کس چیز کا نام؟“ ہادی مسکرایا۔

”ہادی بھائی! تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی کچھ شاعری LIVE سناؤ گے۔ میرا مطلب ہے کہ منہ زبانی۔ یا ر! ویسے یہاں شاعر والی بڑا ماحول ہوا ہے تم سے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر تم یہاں قیام کے دوران میں ایک دو گیت اس کے سنے الگ کے لیے کہہ دو تو اس کا الم ہٹ ہو جائے۔ بڑا ایسا لڑکا ہے لیکن آج کل ذرا کراس میں آیا ہوا ہے۔“

”ظہیر بھائی! میں کچھ لکھنے لکھانے کے قائل ہوں تو اس وقت لاہور میں بیٹھا ہوں۔ فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بلکہ ارادے کی بھی بات نہیں۔ مجھ سے فی الحال لکھا جاسی نہیں سکتا۔“ آخر میں ہادی کا لہجہ ذرا ساجھ بوجھ ہوا تھا۔

ظہیر جلدی سے بولا۔ ”جیس نہیں۔ میں نے تو فیہی بات کی تھی یا ر! یہ شاعری کا کام ہی سوڈا کا ہے۔ میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”مسز ان لاء آنکھیں۔“ ہادی نے پوچھا۔

”ہاں..... ابھی نیچے ہیں۔“

ہادی نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”اچھا ظہیر بھائی! جس دن میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا۔“

تک نہیں۔ پھر فیصل نے ماں کو کندھوں سے تھا اور اپنے ساتھ لے کر بیرونی برآمدے کے چوبلی پنچوں پر جا بیٹھا۔ ہادی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ خالہ صوفیہ، بیٹی کی اس مصیبت پر مسلسل رو رہی تھیں۔

ہادی نے ریفریجیٹ کے بہانے ظہیر سے اجازت لی اور باہر چلا گیا۔ وہ خالہ صوفیہ اور فیصل کے سامنے آج نہیں چاہتا تھا۔

پتا نہیں کیوں ہادی اپنے سینے میں ٹھن سی محسوس کر رہا تھا۔ اسے حجاب کی والدہ پر بے تحاشہ ترس آرہا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک باوقار اور قابل احترام خاتون تھیں لیکن بیٹی کے لیے خوار ہو رہی تھیں۔ خود بیٹی بھی جیسے ایک منجھڑے میں پھڑپھڑا رہی تھی۔

ہادی یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ کسی چھٹی کے اندرونی مسائل کے لیے دل جلانے کی خاطر نہیں۔ اب وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ بس ایک چیز اسے روکے ہوئے تھی۔ ظہیر کے بیان کے مطابق پرسوں ارم وہیں سے یہاں رہی تھی۔ اسے دیکھے بغیر ہادی کے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ارم کے حوالے سے اب کچھ معلومات حاصل ہوئی تھیں ان سے بھی شک پڑتا تھا کہ یہی وہ سیلائی لڑکی ہے جس نے دھن میں اسے طیارے کے سے بیوقوف بنایا اور پھر گدھے کے ستنوں کی طرح غائب ہو گئی۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ سوال ایک گروہ کی طرح ہادی کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اگر وہ اپنے بارے میں کچھ بتا نہیں جانتی تھی تو صاف کہہ دیتی۔ ہادی بھی اس کے لیے اصرار نہ کرتا۔ مگر یوں اچانک بیٹھے بٹھائے اٹھ کر اوچھل ہو جانا بلاشبہ بداخلاقی بلکہ سنگدلی کے زمرے میں آتا تھا۔ وہ جاتے جاتے پار کر کلم کا سیٹ بھی ہادی کو دے گئی تھی۔ وہ اسی طرح ہادی کے بیک میں پڑا تھا۔ اس کی دلچسپی ہادی کے دل میں خواہ مخواہ کی کسک جگاتی تھی۔



تیسرے روز جلال کی بیوی حجاب ہسپتال سے گھر آ گئی۔ گھر کا ماحول جو پہلے ہی سنجیدہ تھا اب اور بھی سنجیدہ اور تناؤ بھرا ہو گیا تھا۔ اسی سہ پہر ظہیر اپنے ایک دوست کو ملانے لے آیا یہ وہی گلوکار تھا جسے ہادی سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ نوجوان ہی تھا مگر بال چشمانی سے اڑے ہوئے تھے۔ وہ ہادی کے لیے کچھ کتابیں اور چاکلیٹس وغیرہ لے کر آتا تھا۔ ہادی کو ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھنا پڑا اور ”سٹائش باہمی“ کے دور سے گزرتا پڑا۔ امان شیردانی نامی یہ نوجوان گیا تو ظہیر نے ہادی کو بتایا کہ ارم نوبج کی فلاحیت سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ وہ اسے لینے کے لیے ایئر پورٹ جا رہے ہیں۔ وہاں ہی پر ملاقات ہوگی۔

اس خبر کا ہادی صبح سے ہی منتظر تھا۔ بہر حال اس نے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا وہ بے تابی سے ظہیر کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جو گاڑیاں گھر میں آئی تھیں وہ گاڑیوں کی گاڑیوں کی دوسری جانب پورے میں جا کر رکتی تھیں۔ لہذا ہادی کو امید نہیں تھی کہ وہ ارم کو نوادیکھ سکے گا۔ بلکہ ابھی تک اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ارم گھر کی دیگر خواتین کی طرح مکمل پردے میں ہوگی یا نہیں۔

خدا خدا کر کے ساڑھے دس بجے اور ظہیر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ہادی کھڑکی سے نگ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کھڑکی سے کچھ ہی فاصلے پر اس نے آواز دے کر حجاب کو روک لیا وہ بہت ہی روگنی۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ سسکیاں لے رہی ہے۔ کمرے کے اندر چونکہ نیم تاریکی تھی اس لیے ان دونوں میں سے کوئی بھی ہادی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جلال الدین، حجاب کے پاس پہنچا۔ اس نے تیز سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔ انداز ڈانٹنے والا ہی تھا۔

حجاب سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ دوسری بار جلال قدرے زور سے بولا۔ اس مرتبہ حمزہ آواز ہادی کے کانوں تک بھی پہنچا۔ "یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟" جلال نے پوچھا کہ کر کہا تھا۔

حجاب نے سب سے پہلے انداز میں اپنی ہلکی سی آواز اٹھائی۔ کھڑکی سے ان دونوں کا فاصلہ بمشکل تین چار میٹر رہا ہو گا۔ سورج کی روشنی کمرے میں سیدھی حجاب کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ چہرے کا رخ ہادی کی طرف تھا۔ مگر اس کے چہرے میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ایک بار پھر ہادی کی لہر ہادی کے سینے میں دوڑ گئی۔ یہ طیارہ کی آنکھیں نہیں تھیں۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں ابھی تک ہادی کے حافظے پر نقش تھیں۔ حجاب کی آنکھیں ملکی براؤن تھیں۔ اس نے اپنی انگلیوں سے شوہر کو دیکھ کر کچھ کہا۔ یہ منمناتی ہوئی سی آواز ہادی تک نہیں پہنچ سکی۔

"پتہ واپس۔ مجھے ایسے تھامے پسند نہیں۔" ایک بار پھر جلال کی تیز سرگوشی ہادی کے کانوں تک پہنچی۔ "اگر جانا چاہو تو خود چھوڑ کر آؤں گا تمہیں۔"

حجاب "سم سم سم سم سم" اس کے جسم میں شاید اس کے آنسو ہی متحرک ہوں گے جو سرکتے ہوئے سیاہ چادر کے نقاب میں جذب ہو رہے ہوں گے۔ اس نقاب پر دو چٹکیں دھاریاں بڑی نمایاں نظر آتی تھیں۔ "جلال! جلال! جلال!" وہ دہرائی ہوئی آواز اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر حجاب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی کلائی تھامی اور اسے لیتا ہوا واپس چل دیا۔ وہ جیسے اس کے ساتھ بھینچتی چلی گئی۔ چند رو میں قدم آگے جا کر اس کی ایک جوتی اس کے پاؤں سے نکل گئی لیکن جلال کو پتا نہیں چلا۔ حجاب کے سر کی روشنی کو شش نہیں کی۔ وہ اسی طرح ذرا گھٹناتی ہوئی سی شوہر کے ساتھ گاڑ ڈیا کی باز کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ قریب ایک سو منٹ بعد گاڑ ڈینا کے عقب سے شریفان نمودار ہوئی اور حجاب کی جوتی اٹھا کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔

ہادی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ ارم ہی علیر اہو گی لیکن وہ نہیں تھی۔ پھر اس نے حجاب کے بارے میں ایسا سوچا۔ حجاب قدر قامت میں علیر جیسی ہی تھی لیکن اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ بھی علیر انہیں۔ ابھی تک شریفان اور علیر وغیرہ سے ہادی کی جو گفتگو ہوئی تھی اس میں بھی علیر ان کی لڑکی کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنے آپ کو طاقت کرنے لگا۔ وہ کیوں تھا خواہ ایک بیکار چکر میں الجھ گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی، اسے بچا دے کر نکال دی تھی۔ کوئی نام و نشان نہیں چھوڑا تھا اس نے۔ تو پھر اس کا بچھا کرنے کا فائدہ؟

بہنیں بیٹے ایک بات اس کے ذہن میں آئی۔ علیر نے بتایا تھا کہ ماریہ نامی وہ اونچی ناک والی لڑکی حجاب کی قریبی سہیلیوں میں سے ہے۔ دوسری طرف وہی لڑکی علیر کی قریبی دوست بھی معلوم ہوتی تھی۔ تو کیا کسی طرح حجاب سے علیر کے بارے میں کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا؟ مگر حجاب سے بات کرنا کیونکر ممکن تھا؟ جلال الدین اس کا

وہیں رہے ستوران میں آکس کریم کھاتے ہوئے، اس دن آپ لوگوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھیں۔ انہوں نے نقاب نہیں کیا ہوا تھا۔ ذرا اونچی ناک تھی ان کی۔ کتابی سا چہرہ تھا۔ "ہادی نے ہاتھوں کو حرکت دے کر باقاعدہ کتابی چہرے کا اشارہ دیا۔

ظہیر کی پیشانی پر دو تین سلونیں ابھریں۔ وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا، پھر چونک کر بولا۔ "ہاں..... وہ ماریہ تھی۔ بھابی حجاب کی فریڈ ہے۔ وہ بھی وٹس میں رہتی ہے بھابی سے ملنے آئی ہوتی تھی۔ اس دن واپس چلی گئی تھی شام کو۔" "اچھا..... میں جیہ ان ہوتا تھا کہ باقی خواتین تو بارہ ہیں، وہ کھلے منہ تھیں۔" ہادی نے بات بنائی۔

"ہاں..... وہ پہلی سے باہر کی تھی۔ کوئی بے پروا لڑکی ہے۔ بھابی کی دو تین قریبی دوستوں میں سے ہے۔ اب صرف وہی ہے جس سے بھابی کبھی کبھار ملتی ہیں۔ بھائی جان نے اس کی اجازت دی ہوئی ہے۔" ہادی کے ذہن میں شک کا بیج پڑ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک انوکھا خیال آنے لگا۔ "تھیں حجاب وہ لڑکی نہیں تھی؟

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ تو شادی شدہ تھی۔ پردے کی پانچ اور خانگاہیت بنیدہ اطوار والی۔ ہادی نے اسے تھوڑی سی مزید گفتگو کی جس سے اسے پتا چلا کہ حجاب بچھلے ہتے روم سے آگے لا کر کسی شہر میں گئی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ وٹس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

وہ سوچنے لگا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی طرح حجاب یعنی سز جلال کو دیکھ سکے؟ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ وہ چار دیواری سے باہر پردے میں نظر آتی تھیں ایک موقع پیدا ہو سکتا تھا انہیں دیکھنے کا، جب وہ ہسپتال میں تھیں اور ہادی نے خون دیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اچانک وہاں حجاب کی والدہ اور بھائی کی آمد ہو گئی تھی اور ہادی کو دیکھ نہیں پڑا تھا۔



کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچ رہا ہوتا ہے اس کا ہو جانا کافی دشوار محسوس ہوتا ہے لیکن پھر وہ دشوار نہیں رہتا۔ سز جلال یعنی حجاب کے خوالے سے بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اور تھمتے کے بعد نوبت کے لگ بھگ پہلی اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف آیا۔ یہ چھٹی کا روز تھا۔ باہر مکمل خاموشی تھی لیکن شاید سوئے پڑے تھے۔ ہادی کی کلائیوں پر ہاتھی جیسے کی طرف گئی۔ اس نے ایک چادر پوش لڑکی کو آنکھیں کی جانب آتے دیکھا۔ ہادی فوراً سمجھ گیا کہ یہ حجاب ہے۔ اس کی چادر کا رنگ کالا تھا اور اس پر تین چار چوڑی چٹکیں دھاریاں تھیں۔ یہ چادر ہادی پہلے بھی دو تین بار دیکھا تھا۔ چادر کے نقاب میں سے حجاب کی فقط آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے کندھے سے شوذر بیگ جھول رہا تھا۔ پیادری کے بعد کی نقاب اب بھی اس کی چال سے عیاں تھیں۔ وہ مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی اور ایسا کہہ ہوئے اسے ہادی کے کمرے کی کھڑکی کے نزدیک سے گزر رہا تھا۔ ابھی وہ کھڑکی کے چند رو میں قدم دور ہی تھی کہ ہادی کو ایک دوسری صورت نظر آئی۔ یہ سیاہ داڑھی اور سخت چہرے والا جلال تھا۔

وہ لمبے دم بھرتا ہوا تیزی سے حجاب کے پیچھے آیا۔ اس نے شوہر کے اوپر ایک نکتہ گون پھینک رکھا تھا۔

واپس۔ چہرہ قدرے زرد نظر آ رہا تھا۔ ایک دو سیکنڈ سکتہ زدہ رہنے کے بعد وہ تیزی سے مڑی اور دروازے سے نکل کر اوجھل ہو گئی۔

”یہ میری بیٹی حجاب ہے۔“ خالہ صوفیہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”آج ہی سسرال سے آئی ہے۔“

بادی نے بمشکل خود کو سنبھالا اور بولا۔ ”اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ پہلے سے کافی بہتر ہے۔ ہفتہ دس دن یہاں رہے گی تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

”آہ..... آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ سسرال میں کتنا بھی پیار مل رہا ہو لیکن جس طرح ماں، بیٹی کی دیکھ بھال کر سکتی ہے کوئی اور نہیں۔“

”پیار بھی تو کافی ہوئی تھی۔“ خالہ صوفیہ نے سرد آہ بھر کر کہا۔ (ابارشن والی بات وہ ہادی کو نہیں بتا سکتی تھیں)

اتنے میں اٹکل فیاض بھی آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں وہی اخبار تھا جو کچھ دیر پہلے علیزہ کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔ وہ

وہی اخبار! بے بھائی فیصل کو دکھانے کے لیے اندر آئی تھی اور اچانک بادی کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ اخبار دیکھنے لگے۔

بادی نے بھی سرسری سی نظر دوڑائی۔ اٹکل فیاض صاحب کی توجہ ایک جواں سال کلین شیو شخص کی تصویر پر تھی۔ تصویر

کے نیچے ایک خبر کا متن تھا۔ یا شاید یہ کوئی آرٹیکل تھا۔ اس میں اسلامی طرز کی بیکنگ کے کچھ نکتے بیان کیے گئے تھے۔

اٹکل فیاض نے ایک طرف دیکھ دیا گیا۔

اٹکل فیاض بھی تھل تھل کر ہادی سے باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بادی بطور

مہمان ان کی بیٹی کے سسرال میں ٹھہرا ہوا ہے اور چند دن پہلے ان کی بیٹی کو اس نے خون بھی دیا ہے۔ اس دوران میں

ہادی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ حجاب کو گھر میں پیار سے صرف ”حب“ بھی کہا جاتا ہے۔

جائے وغیرہ پینے کے بعد بادی زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہر سکا۔ اس کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ یوں تو

اٹکل فیاض اور خالہ صوفیہ وغیرہ سے باتیں کر رہا تھا مگر حجاب مسلسل اس ”معد لڑکی“ کی طرف لگا ہوا تھا جو کہیں علیزہ

کا، کہیں حجاب تھی اور کہیں صرف ایک نقاب تھی۔ یہ بڑی ڈرامائی صورت حال لگتی تھی۔ ہادی قریباً ایک گھنٹہ وہاں

بیٹھا۔ وہ بار بار ٹھہرتی اور اس کی صورت دکھائی دی۔ گھر والوں سے رخصت ہو کر بادی واپس اپنی قیام گاہ کی

طرف روانہ ہو گیا۔

اب اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہی چھوٹی موٹی لڑکی حجاب تھی جو علیزہ ابن کروٹس میں ہادی

سے ملی۔ لیکن اس کی آنکھیں اور اس کے بالوں کا رنگ؟ علیزہ کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور بالوں کا رنگ بھی قدرے

مختلف تھا لیکن جوڑ کی ابھی ہادی نے اٹکل فیاض کے ڈرائنگ روم میں دیکھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ سیاہ نہیں تھا اور

بال بھی شہرہ رنگ تھے۔ کسی فلم، ڈرامے کی سچو شخص ہوتی تو ہادی ضرور سوچتا کہ یہ حجاب اس کی جڑواں بہن یا ہم شکل

وغیرہ ہوگی لیکن یہ بیٹی جانتی زندگی تھی۔ ہادی نے ڈرائنگ روم میں اسے صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے دیکھا

تھا۔ وہ نانو سے فیصد علیزہ تھی۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں اللہ نے والی شناسائی تو پھر کیا معاملہ تھا۔

جب وہ وٹس میں اس سے ملی تو شاید اس نے بالوں کو رنگ کیا ہوا تھا اور آنکھیں؟ آنکھوں پر لینز لگائے گئے

موقع ہرگز نہیں دے سکتا تھا اور میں ممکن تھا کہ حجاب خود بھی بات کرنا پسند نہ کرتی۔ تو کیا وہ ظہیر سے اس سلسلے میں مدد

لے؟ مگر..... یہ بھی کسی طرح مناسب بات نہیں لگتی تھی۔ کیا وہ اس خاندان کی لڑکیوں کی ٹوہ نگانے کے لیے یہاں

ٹھہرا ہوا تھا۔ پرسوں اس نے شریفان سے تھوڑی سی بات کی تھی اور باتوں باتوں میں پوچھا تھا کہ علیزہ کون ہے؟

شریفان نے اس نام سے لاطینی کا اظہار کیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ڈراچونگی بھی تھی کہ بادی اس طرح کے

سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ اس کا چونکنا ہادی کے لیے شرمندگی کا باعث بنا تھا۔

دو پہر تک بادی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک دن مزید یہاں ٹھہر کر ظہیر سے اجازت لے لے گا اور کسی ہوش میں جا

ظہیر سے گا۔ اس کے لیے کوئی مقبولی سا بہانہ بھی اس نے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس دو دن وہ تین چار گھنٹے ظہیر کے

ساتھ روم میں ٹھہرتا رہا۔ انہوں نے ایک دو علاقائی ڈشز کھائیں۔ تین چار جگہوں کی سیر کی اور مدد معروف ”پونڈ آف

ڈشز“ بھی دیکھا۔ جہاں دنیا بھر کے سیاح پانی میں نہیک آچھالتے ہیں اور دل میں دہی ہوئی خواہشوں کو بڑی خاصوٹی

سے دعاؤں کی شکل دیتے ہیں۔ ہاتھیں کہ یہاں کیا کیا دعا مانگتی گئی ہوں گی۔ ان میں سے کئی دعائیں اس کی

ہوں گی جو اگر منظر عام پر آجائیں تو بے شمار افراد کی ٹانگی زندگی میں تھلک مچ جائے۔ شاید ماضی میں مانگی کی

دعائیں ایسی بھی ہوں جنہیں مانگنے والے اب خود اپنی دعاؤں پر غور مند ہیں۔ کچھ دعائیں ناکام حسروں کا دھپ

دھار چکی ہوں۔ کچھ دعائیں زندگیاں میں بہار لا چکی ہوں اور کچھ دعائیں ابھی تک ان فضاؤں میں بھٹک رہی

ہوں۔ پونڈ آف ڈشز کے مدار میں چکر لگا رہی ہوں۔ تالاب میں گرنے والی آبشاروں کے شہرے میں ان دعاؤں کی

سربراہت ہو۔

شام سے ذرا پہلے ظہیر کو اپنے ستود پر جانا تھا۔ ہادی کی خواہش پر ظہیر نے اسے ”کوئیسٹم“ کے قریب ایک

چوراہے پر اتار دیا۔ نہ جانے کیوں ہادی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس فیملی اور اس کے معاملات کو خیر باد کہنے کے

ایک بار پھر خالہ صوفیہ اور اٹکل فیاض سے مل لے۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ کی طرف اس کا دل کھینچتا تھا۔ وہ مہربان

چہرے والی خاتون اپنی شفیق مسکراہٹ سے اس کے دل کو چھو لیتی تھیں۔ ہادی کے اندازے کے مطابق اٹکل فیاض کا

گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔ ایک دو جگہوں سے پوچھ کر وہ منزل تک پہنچ گیا۔

گیت کی تیل بجانے پر مسکراتے چہرے والا نوجوان چوکیدار نمودار ہوا اور ہادی کو پہچان کر اندر لے گیا۔ ہادی

پورچ میں کھڑا ہو گیا۔ ملازم نے اندر جا کر اطلاع دی۔ چند سیکنڈ بعد نوجوان فیصل باہر نکلا اور اس نے ہادی کو خوش

آمد یہ کہا۔ ہادی فیصل کے ساتھ گھر کے بچے سجائے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ خالہ صوفیہ بھی وہیں موجود تھیں۔ اٹکل

فیاض کسی اور کمرے میں تھے۔ پاس ہی کہیں فی وی چنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ خالہ صوفیہ اس سے بڑی محبت سے

پیش آئیں۔ ان کے بے ہوش ہونے والا واقعہ ابھی ان دونوں تک ہی محدود تھا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ اسے

میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”فیصل..... فیصل یہ دیکھو“ پھر ایک لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ

میں نکلا ہوا اخبار تھا۔ وہ اچانک ہی اندر آ گئی تھی۔ ہادی اسے دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ وہ علیزہ تھی۔ بے شک وہ علیزہ

تھی۔ علیزہ نے بھی اسے دیکھ لیا اور نرمی طرح ٹھٹھکی گئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹے سر پر لے لیا۔ آنکھیں حیرت سے

ہوں گے۔ بالوں کو رنگنا اور مختلف رنگوں کے لیزر لگانا "فی زمانہ" اکثر خواتین کو بہت بھاتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی تھا۔ حجاب کو ونس میں جب ہادی نے علیر کے روپ میں دیکھا تو وہ ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ اس نے پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے مگر یہاں وہ سر تا پا چادروں اور نقابوں میں لپیٹی ہوئی تھی۔ ان دو روپ میں کس قدر تضاد تھا۔ کیا یہ کسی عمل کا رد عمل تھا؟ یا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی۔ ہادی جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ اب چاہئیں کیا بات تھی کہ علیر ایسی حجاب کا شادی شدہ ہونا بھی ہادی کے لیے ایک عجیب سی بے نام چھین کا باعث بنا تھا۔

ایک بات تو طے تھی۔ علیر ایسا حجاب اس کی یہاں موجودگی سے سو فیصد آگاہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ان کے گھر کی انٹیکسی میں بطور مہمان نمبر ہوا ہے۔ بہر حال اس حلقے میں اس نے مکمل خاموشی اختیار کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ہادی نقابوں اور چادر دیواروں کے پیچھے جھانکنے میں نا کام رہے گا اور دو چار دن میں یہاں سے چلا جائے گا اور یقیناً ہادی بھی ایسا ہی تھا۔ اگر آج اچانک علیر کے سامنے آنے والا واقعہ نہ ہوتا تو ہادی نے اس تناؤ بھرے ماحول سے نکل جانا تھا۔



وہ گھر پہنچا اب ظہیر بھی آنے ہی والا تھا۔ لیکن ہادی اس قدر "آپ سیٹ" تھا کہ کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شریفان سے کہا کہ اس کے سر میں ہلکا دورہ ہے اور وہ سوئے لیے جا رہا ہے۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر وہ دیر تک اس "معد لڑکی" کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہ علیر انہیں تھی۔ وہ حجاب بھی لگا۔ جلال جیسے سخت کلمے شوہر کی بیوی تھی۔ آج صبح سویرے بھی میاں بیوی کے درمیان کوئی گزبڑ ہوئی تھی۔ رونی سسکی پھونکی کہیں جارہی تھی جب جلال نے اسے روکا تھا اور سخت رویہ اختیار کر کے اسے واپس لے گیا تھا۔ یقیناً اس وقت حجاب نے اسے کچھ عیب کے گھمراٹے کا ارادہ ہی کیا تھا۔ جب جلال نے کہا تھا کہ اگر اس نے جانا ہی ہے تو وہ خود اسے چھوڑ کر آئے گا۔ ظہیر ایسی حجاب اپنے والدین کے گھر میں تھی۔ ونس میں اپنی گنگٹو کے دوران میں اس نے ہادی سے عورتوں کی مجبور یوں اور ان کے مصائب کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ ہادی کے ذہن میں تازہ تھیں۔ تو کیا ان کا مطلب تھا کہ وہ باتیں جبکہ جتنی نہیں آپ جتنی کے زمرے میں آتی تھیں۔

خبر نہیں کہ ہادی کتنی دیر ان سوچوں میں غلطاں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ آج شب روم کی فضا میں تھوڑی سی گرمی تھی۔ شریفان نے اس کے آنے سے پہلے ہی کمرے کا اسی آن کر دیا تھا۔ ٹھنڈک محسوس ہوئی تو ہادی نے اٹھ کر اسے سی آف کر دیا اور ہلکا سا پگھلا چلا دیا۔ اب رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کوٹھی میں سکوت تھا لیکن سو رہے تھے۔ بس کبھی کبھی چوکیدار کی دسل کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اتنے میں ہادی کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کوئی نامعلوم نمبر تھا مگر اٹلی کا ہی تھا۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک دھیمی نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو....."

"کون بول رہا ہے؟" ہادی نے پوچھا۔

"آ۔ آپ ہادی ہی ہیں؟" دوسری طرف سے دریافت کیا گیا۔

ہادی کا دل سینے میں اچھل کر رہ گیا۔ وہ پہچان گیا۔ یہ علیر اسی کی آواز تھی۔ ظہیر ایسی حجاب۔ وہ خود کو سنبھالا۔

ہوئے بولا۔ "جی! میں ہادی ہوں اور آپ کو کیا کہوں؟"

"میں سمجھی نہیں؟"

"آپ کو علیر اکبوں یا حجاب؟"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ پھر حجاب کی مدھم آواز آئی۔ آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں کون سی غلطی کر دی ہے؟"

"جی تو میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا غلطی کر دی لیکن۔ پہلے آپ بتائیں کہ آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

فیصل کے سیل فون سے لیا ہے۔" دوسری طرف سے سپاٹ لپچ میں جواب ملا۔

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کی آواز سن رہا ہوں۔"

وہ نمبر سے لپچ میں بولی۔ "دیکھیے ہادی صاحب! میں نے آپ کو ایک شریف ہم وطن سمجھا اور آپ نے ساتھ تھوڑا سا دقت گزارا۔ ہم اچھے گھر سے پھرے اور پھر خوش دلی سے ایک دوسرے سے ملے ہو گئے۔ میں آپ کے جواب سے کچھ اچھے تاثرات لے کر لوٹی۔ اور میرے خیال میں آپ کی کیفیت بھی یہی ہونی چاہیے تھی۔ یہ ایک بڑا اچھا وقت تھا۔ مجھے آپ سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی۔"

"کیسی توقع؟"

"جی جو آپ کر رہے ہیں۔" اس کا نچوہ قد رے ہو گیا۔ "میری نوہ لگاتے ہوئے آپ میرے گھر پہنچے اور پھر یہاں ان کے گھر بھی پہنچ گئے۔ ہم۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا چاہ رہے ہیں۔" اس کی آواز میں خوف کی لہر شل ہو گئی۔

"یہ سب جو اتفاقاً ہوا ہے۔ شاید آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ میں وہاں آئیں کریم بار میں گیا تھا۔ وہاں آپ کے ساتھ صاحب نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے ایک دن پہلے اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی۔ وہ اٹھ کر میری میز پر آئے اور بعد میں زبردستی اپنے گھر بھی لے آئے۔"

"میں یہ بات نہیں مان سکتی۔"

"کون سی بات؟"

"جی کہ آپ اتفاقاً اس شخص کریم شاپ پر آ گئے تھے۔ آپ یقیناً پہلے سے میرے پیچھے تھے۔" ونس میں اس کی آواز بھرائی ہوئی رہی تھی لیکن اب اس کا صاف اور ٹھنڈک وار تھی۔

ہادی چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ بات تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی وہ اتفاقاً آئیں کریم بار میں نہیں ٹھسا تھا۔ اس نے پہلے اپنی ناک والی ماریہ کو دیکھا تھا اور پھر جلال کی نظریہ ہی تھی۔

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟" وہ سنبھل کر بولا۔

"آپ کو یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پلیز میری چھوٹی سی غلطی کی بجائے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس کا نتیجہ میرے لیے کتنا برا نکل سکتا ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے گھر والوں کو بچا چل

کیا تو قیامت پر پا ہو جائے گی۔" اس کی آواز بھر گئی۔

"خلیو! میرا مطلب ہے حجاب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری وجہ سے آپ کے لیے کوئی مشکل کمزری ہو۔ مجھے تو صرف یہ تجسس تھا کہ آپ وٹس کے اس ریسٹوران میں بیٹھے ٹھانے اچانک کہاں چلی گئیں۔ کہیں خدا نخواستہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ میں سوچتا تھا کہ اگر آپ خود گئی ہیں تو اس طرح اچانک کیوں گئی ہیں؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی جس کی وجہ سے آپ ناراض ہو گئیں۔ یا پھر ایسا ہی کوئی اور وجہ؟"

"کوئی وجہ نہیں تھی! اپنی صاحب! کچھ بھی نہیں تھا۔ بس مجھے لگا کہ ہمیں اب الگ ہو جانا چاہیے اور میں آگئی۔"

"آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں وہاں آپ کا انتظار کرتا رہوں گا اور دیوانوں کی طرح سناٹا کھا کر گھومتا رہوں گا۔ دکانوں میں جمنا کھوں گا، راگبیروں سے پوچھوں گا۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اتنی سی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا دے دیں۔ پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔"

بیٹھ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔"

ہادی مسکرایا اور ہلکے ہلکے لہجے میں بولا "اور ان سوالوں کا کیا ہو گا جو میرے ذہن میں پیدا ہو گئے ہیں۔ کچھ وہاں وٹس میں اور کچھ یہاں روم میں آپ کے گھر کو اور وہاں کے ماحول کو دیکھ کر۔"

وہ ترسناک آواز میں بولی۔ "ضروری نہیں ہوتا کہ ہر سوال کا جواب ڈھونڈا جائے اور وہاں بھی جائے اور یہاں کوئی ایسا اہم سوال ہے بھی نہیں۔ میں ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ شادی شدہ زندگی کے جو تھوڑے بہت مسائل ہوتے ہیں وہ میرے ساتھ بھی ہیں۔ ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی ایسا نہیں ہے ہادی صاحب! جس کی آپ جتنو کر سکیں اور جس میں آپ کی دلچسپی کا کوئی سامان ہو۔"

ہادی نے کہا۔ "ٹھیک ہے حجاب صاحب! میں مانتا ہوں کہ آپ ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہیں۔ شادی شدہ اور باپروہ ہیں۔ لیکن اس لڑکی کو میں نے وٹس میں ایک اور سی جنٹل روپ میں دیکھا ہے۔ جین اور جوکر کے ساتھ بھاگتے دوڑتے جمو لے جمو لے اور پیڈل بوٹ چلاتے۔ اس لڑکی میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"بب۔۔۔۔۔ بس سمجھیں کہ وہ ایک ڈرامہ تھا۔ جو مجھے کسی مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑا، کسی کی خاطر۔ آپ اس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔" وہ پھر رو ہنسی ہو گئی۔

اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ بات کو پیٹ رہی ہے۔ سچائی کے قریب بھی جاتا نہیں چاہتی۔ ہادی بھی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ ایک تخلیق کار تھا۔ انسانی نفسیات کی گتھیوں کو بھٹکا اور سلجھانا اسے پسند تھا۔ وہ جانا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا چل رہا ہے۔ وہ کیا خوف ہے جس نے اسے اور اس کے ماں باپ کو اس نرئی طرح جکڑ رکھا ہے۔ لڑکی والوں کا لڑکے والوں سے دب کر رہنا کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی لیکن یہاں یہ صورتحال حال کچھ زیادہ گہیر تھی۔ بلکہ اسے ترسناک کہنا مناسب تھا۔

پھر ہادی کے ذہن میں وہ تصویر والی بات آئی۔ وہاں حجاب کے سینے میں ایک کمرے کے اندر ایک لڑکی کی

دو طرفہ تصویر لگی تھی۔ اس کے نیچے غالباً حجاب کے ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ "میں تمہیں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔"

حجاب نیا ض!

وہ کون لڑکی تھی؟ کیا اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ چکا تھا یا وہ کسی وجہ سے غلیظ یعنی حجاب سے جدا ہو گئی تھی۔ بہت سے سوال ہادی کے ذہن میں ٹکلا رہے تھے۔

"آپ کی ایک چیز میرے پاس پڑی ہے۔ وہ میں آپ کو واپس دینا چاہتا ہوں۔" ہادی نے بات بٹائی۔

"آپ پارک چین سیٹ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ آپ کا۔۔۔۔۔ حق بننا تھا۔ آپ نے زبردستی کر کے ہر جگہ اپنا پرس کھولا تھا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ آپ ویسے تو ہر گز پیسے نہ لیتے۔ میں نے قلم آپ کے بیگ میں رکھ دیئے۔"

"اگر آپ نے اتنی سی باریکی سے حساب کتاب کرنا تھا تو پھر پورا کر لیتیں۔ میرے پاس سب لکھا ہوا ہے۔"

واپس میں حساب لکھنا میری Habit ہے۔"

"کیا۔۔۔۔۔ کچھ اور نکلتے ہیں میری طرف سے؟"

"نہیں آپ کے نکلتے ہیں۔۔۔۔۔ کم از کم 60 یورو۔"

ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ دبی لہجے میں بولی۔ "آپ نے کچھ اور بھی تو کیا ہے میرے لیے۔ مجھے پتا ہے جب میں ہسپتال میں تھی تو آپ نے مجھے خون دیا۔ اس کی قیمت تو میں چکا ہی نہیں سکتی۔ بس آپ کے احسان کا شکریہ ادا کر سکتی ہوں۔"

"تو پھر آپ نے مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع کیوں نہیں دیا؟"

"طیس غلطی ہو گئی۔ اب اس کے لیے بھی مجھے معاف کر دیں اور پھر صرف ایک درخواست ہے پلیز آپ چلے جائیں۔ ایک اتنے دوست کی حیثیت سے میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" اس کے لہجے میں غلٹ اور بیکا گئی تھی۔

غلٹ اور بیکا گئی ہادی کو بڑی لگ رہی تھی۔ وہ اس کے کم از کم ایک بار تو ضرور ملنا چاہتا تھا اور وہ اس پوزیشن میں تھا جیسا کہ غلیظ اکو اس کے لیے مجبور کر سکتا۔ ویسے بھی وہ آٹھ دس دن کے لیے سیکے آئی ہوئی تھی۔ تھوڑا بہت وقت نکال سکتی تھی۔

اس نے تہن سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے غلیظ! میرا مطلب ہے حجاب صاحب! آپ کبھی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں بلکہ شاید دو چار دن میں آگئی سے ہی چلا جاؤں۔ لیکن ایک جموٹی سی بے ضرر شرط ہے۔ امید ہے آپ قبول کر لیں گی۔"

"کیا؟" وہ ڈری ڈری آواز میں بولی۔

"آپ نے مجھے دوست کہا ہے اور میں حقیقتاً ایک شخص دوست ہی ہوں۔ کم از کم ایک بار مجھ سے کہیں مل سکتے ہیں۔ تمہاری دیر کے لیے۔ ہم ایک دوسرے کو اچھے طریقے سے جانتے ہیں۔"

وہ چپ رہی۔ ہادی نے سمجھا شاید سوچ رہی ہے لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مزید بیکار ہو چکا تھا۔ "معاف مجھے ہادی صاحب! یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

اگلے روز ہادی صبح اٹھا تو طبیعت میں کچھ بھاری پن تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ شریفان کو آواز دے اور بیڈنی سے لیے کیے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ وہ انکیسی میں نہیں ہے۔ اگر بونی تو کہیں نہ کہیں سے کھٹ پٹ کی آوازیں ضرور آ رہی ہوتیں۔ وہ شاید رہائشی گھر کی طرف گئی ہوئی تھی۔ وہ یونہی لینا رہا۔ رات والی فون کال کی ساری تفصیل وہیں میں تازہ ہونے لگی۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ آج سہ پہر تک یہاں سے چلا جائے گا۔

کچھ دیر بعد شریفان خود ہی کمرے میں نمودار ہو گئی۔ "سلاماں لکھم صاحب جی!" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"تہاں چلی گئی تھیں؟" ہادی نے پوچھا۔

وہ ذرا متحہ بنا کر بولی۔ "وسی بی بی ارم کے لیے ہو والا قبوہ بنانے کے لیے۔ دو صبح سویرے جیتی ہیں۔ کافی قرعے خرچے ہیں ان کے۔ بس اب آگئی ہیں تا میری جان کو مصیبت پڑی رہے گی۔"

"کیوں تمہیں ان کا آنا اچھا نہیں لگا۔"

"کسی کو بھی نہیں لگتا جی! بلکہ میرا تو اندازہ ہے کہ خود فوزیہ یا بی کو بھی چنگا نہیں لگتا۔ پر وہ پھر بھی آ جاتی ہیں۔ اب تو..... سنا ہے کہ پکائی آگئی ہیں۔ ان کا داخلہ یہاں کے ایک کالج ہو گیا ہے۔ اب ادھر ہی رہیں گی۔" ہادی نے ہان بھنک کر کہا۔ "شریفان نے بیزارگی سے سر ہلایا۔

اندازہ دیتا تھا کہ وہ اسے زیادہ پسند نہیں کرتی۔

اسے میں ظہیر بھی آگیا تھا ہادی نے کل رات ہی ظہیر کو ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ وہ اب ذرا پہنچ جا رہا ہے۔ اس کے دوست نے یہاں کے ایک ہوٹل واسکوڈے میں قیام کیا تھا۔ اب وہ بھی دو چار روز وہاں رہنا چاہتا تھا۔ اسے رات سے روم کی سیر ادھوری لگنے لگی تھی۔

ظہیر نے ہادی کو روک کر کئی کوشش کی تھی لیکن زیادہ جوش سے نہیں۔ ہادی کو اندازہ ہوا تھا کہ شاید ظہیر کے ہاتھ پاؤں جلاں۔ یہاں مہمان خانے میں ہادی کے فون پر قیام کو زیادہ پسند نہیں کر رہے۔ پچھلے سات آندھ روز میں وہ صرف ایک بار یہاں آ کر ہادی سے ملے تھے اور وہ بھی کمرے کمرے (اس دوران میں بھی جناب کا فون مسلسل بجتا رہا تھا۔)

ظہیر کے آنے ہی شریفان کا ہاتھ چل گیا۔ ظہیر نے مایوس لہجہ میں کہا۔ "یار! اب تو تمہارے ساتھ دل لگنا شروع ہوا تھا۔ اب تم آؤں گے تو ہرے ہوئے ہو گے تو دم بھی ہوٹل میں تمہیں ڈر دینا چاہ رہی تھی۔"

"اس نے کہہ دیا ظہیر بھائی تو ہمیں ڈرنا ہو گیا۔ میری بہن سے میری طرف سے معذرت کر دیتا۔"

"یہ معذرت تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گی۔ ابھی یہاں جلاں جاتے ہیں تو وہ تم سے ملنے آتی ہے۔"

ظہیر کے فقرے سے ہی ظاہر تھا کہ اس گھر میں کوئی بھی کام کر گئے ہیں۔ پہلے جلال الدین کی خوشی یا ناراضی کا سوا جاتا ہے۔ جن کاموں میں اس کی ناراضی کا ذرہ ہو وہ اس کی غیر موجودگی میں کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ارم اس سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن ابھی تک نہیں مل سکی۔

"لیکن میں تو آپ کی بات مان رہا ہوں۔"

"تو اس کا کیا مطلب ہے؟ میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"یہ کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"وسی جو آپ سمجھا رہے ہیں مجھے۔" اس کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔ "افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ ہم نے ایک بڑے اچھے موڈ پر بات ختم کی تھی، لیکن آپ پھر دہناتے ہوئے آگئے ہیں میرے گھر تک۔ آپ..... آپ وہی کچھ کر رہے ہیں جو آپ جیسے مرد کرتے ہیں۔ آپ میں اور ان مردوں میں شاید کوئی فرق نہیں جو عورت کو بس ایک سی روپ میں دیکھتے ہیں ان کو بس گھیرنا چاہتے ہیں۔" اس کا لہجہ پختہ ہو گیا۔

"یہ کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"پلیز سٹ اپ..... پلیز سٹ اپ۔" وہ پھونکا رہا۔ "مجھے نہیں بلیک میل ہونا ہے آپ سے۔ میں نہیں مل سکتی۔ نہیں مل سکتی۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں نے آپ کو دوست کیا۔ آپ کے ساتھ وقت گزارا۔ مجھے شرم ہے۔" اس کی آواز غصے سے بھر گئی۔

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔"

لیکن دوسری طرف سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ ہادی نے کچھ دیر فون کان سے لگا کر دیکھا پھر مے مے سے اٹھ کر اپنے نیچے رکھ دیا۔ اسے حجاب سے اتنے شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی۔

اسے غلطی کا احساس ہونے لگا۔ شاید اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہاں سے جانے کے لیے اس سے ملنے کی شرط نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ یقیناً اس نے غصے کی وجہ سے ہادی کو اس پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اپنے حالات کی وجہ سے پہلے ہی ڈپریشن میں تھی۔ اب مزید ڈپریشن ہو گئی تھی۔

ہادی کو افسوس ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد اسی نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش ہو چکا تھا۔ نیکی سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اس نمبر پر کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اب نمبر تو آن ہو گیا تھا لیکن کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ قریباً ایک گھنٹے تک وقفے وقفے سے کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک جوابی ایس ایم ایس آیا۔ یہ اس نمبر سے تھا۔ حجاب نے بس اتنا لکھا تھا۔ "پلیز پلیز پلیز میرے حال پر رحم کریں۔"

حجاب کی شکل ہادی کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ وہی تابندہ پیشانی، وہی جاذب نقوش، جن میں معصومیت کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ ہی خالہ صوفیہ کا مہربان چہرہ بھی نکلا ہوں میں گھوما۔ یہ ماں جینی مشکلات کا شکار تھیں بلکہ چھوٹا گھرا تا ہی شکار تھا۔ ہادی ان کی مشکلات میں اضافے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر گم مہم رہنے کے بعد اس نے موبائل فون اٹھایا اور ایس ایم ایس لکھ دیا۔ "او کے حجاب! میں وہی کروں گا جو آپ چاہتی ہیں۔ گندہائے۔"

ایس ایم ایس لکھ کر جیسے اس کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ وہ کچھ دیر تک حجاب کے کسی جوابی پیغام کا انتظار کرتا رہا۔ جب نہیں آیا تو وہ تھوڑی دیر تک کروٹیں بدلتے کے بعد سو گیا۔

اگلے پانچ چھ روز ہادی نے روم میں گھومتے ہوئے ہی گزارے۔ اسے تاریخ میں بہت دلچسپی تو نہیں تھی لیکن وہ جن جگہوں کی سیاحت کرنا چاہ رہا تھا ان کے بارے میں اس نے کچھ نہ کچھ پڑھا تھا۔ روم میں جو چند جگہیں اسے لازمی دیکھنا تھیں۔ ان میں پونٹ آف وشر یعنی خواہشوں کا تالاب۔ کوئسٹیم یعنی دو قدم جلی اٹھاڑا جہاں انسان بھرے شیرے لڑتے تھے۔ گھنڈی ایٹر سکول جہاں سیاحوں کو بتایا جاتا ہے کہ گھنڈی ایٹر کیسے بنا جاتا ہے۔ اور پھر روم سے ذرا آگے پومپائی کے کھنڈرات جہاں انسان لاوے میں منجمد ہیں اور روم کی بڑی مسجد جو یورپ کی سب سے بڑی مسجد بھی ہے اور "وینی کن" یعنی عیسائیوں کا مقدس شہر وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے پونٹ آف وشر وہ دیکھ چکا تھا اب ان اتحاد جگہیں ابھی دیکھنے والی تھیں۔ وہ صبح سویرے نکل جاتا اور شام کو تھکن سے پھر ہو کر واپس آ جاتا۔ یہ مصروفیت اس کے لیے ایک طرح سے سودمند بھی تھی۔ وہ علیٰ ایضاً حجاب کی طرف سے اپنی توجہ بنانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کی تابندہ پیشانی، اس کے جاذب نقوش اور نقوش کے پیچھے چھپے ہوئے مسائل دھیرے دھیرے اس کی سوچ میں دھندلانے لگے۔ اگلی کے ہیزے کے بارے میں اس نے بہت سنا تھا۔ بلکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ ہیزا ایجاد ی ایلی سے ہوا تھا۔ یہاں اسے بیسویں قسم کے ہیزے دیکھنے کو ملے۔ کھانے کے وقت جہاں کوئی اچھی ہیزا شاپ نظر نہ آئی۔ اس میں گھس جاتا۔ اس نے مقامی دوستوں میں سے صرف دو بندوں کو بتایا تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا رہا ہے اور انھیں بھی ان کو تاکید بھی کر دی تھی کہ وہ اس قیام کو راز میں رکھیں۔ وہ کاغذ اور قلم سے دور ہونے کے لیے یہاں آیا تھا لیکن یہ دوست احباب اسے پھر ان چیزوں کی طرف تھکیٹ لاتے تھے۔ وہ چند ہیفے آزادی کے چاہتا تھا۔ مکمل آزادی کے۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ اسے اپنے ارد گرد کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آئے۔ بس وہ انجینی لوگوں کے درمیان، انجینی جگہوں پر گھومتا رہتا اور اس کے کانوں میں انجینی ناقابل فہم الفاظ ہی پڑتے رہیں۔ اگلے تین چار دن میں دوبارہ ظہیر کا فون آیا۔ ہادی نے اسے بھی مختصر بات ہی کی۔ اس کے دل میں کوئی کھد بھد پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اس کھد کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ کسی ایسی کیفیت کا اسے پہلے کبھی کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ اس کے سینے میں کوئی چھری جکڑ چلائی جا چکے اور کم گداز شکل اختیار کر گئی ہے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹا تو اس کی سماعت کو وحی الہیہ مجروح کرنے لگتے جو اپنی فون کال میں حجاب نے کہے تھے۔

"آپ سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ عورت کو بس ایک ہی روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس کو کسی طرح گھیرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ وقت گزارا۔"

چند دن تو ان جملوں کی تلخی کھاتی گھبراہٹ ہوئی، پھر ان کی کاٹ کا اثر کم ہونے لگا۔ بالکل جیسے حادثات اور ناہنیدیدہ واقعات کے نرے اثرات بتدریج معدوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن سینے کے اندر کا وہ بے نام گداز جوں کا توں رہا۔

یہ نویں دسویں روز کا واقعہ ہے۔ ہادی اپنے دو بھائی بالکلونی میں بیٹھا سکرینٹ چومک رہا تھا۔ یہ بالکلونی یہاں کی اکثر بالکلونیوں کی طرح پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ پھول کا سینکڑوں گولہ تھا اور یہاں سے نیچے سڑک کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ اس ٹریفک میں کھلی چھت کی سڑکی کاریں اور برطرنگ کے سکوز بھی نظر آتے

سہ پہر تک ہادی جانے کے لیے سامان پیک کر چکا تھا۔ ان چند دنوں میں شریفیوں کے ساتھ اس کی کافی سے تنگ ہو چکی تھی۔ وہ آرزوہ نظر آ رہی تھی۔ اپنی گلابی اردو میں بولی۔ "بھئی تے سب ہی غیث اردو میں گل کر گئے ہیں۔ میری تو زبان کو دل پے گیا ہے اردو بول بول کے۔ آپ نے اک دو داری میرے نال پنجابی ہے گل کیتی ہے۔ مجھے اپنے پنڈ کے کھیتوں اور باغوں کی خوشبو آتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں شریفی! میں تمہیں کبھی کبھی فون کیا کروں گا۔" ہادی نے کہا۔

اس دوران میں ارم بھی آگئی۔ اس نے چادر کا درمی سا نقاب کر رکھا تھا اس نقاب نے صرف اس کے ہونٹ اور ناک کا مختصر سا حصہ چھپایا تھا۔ لگتا تھا کچھ پردے کی عادی نہیں مگر یہاں جلال الدین کی مرضی پر چلنا پڑتا تھا۔ ارم قبول صورت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عمر میں نقاب کے کچھ چھوٹی ہو لیکن اپنے خدو خال کی وجہ سے چہرے کی ہم عمری نظر آتی۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور ایک خاص طبع کی بوشیاری تھی۔ اس نے ہادی کو بھائی جان کہہ کر مخاطب کیا تھا کہ وہ ہادی کو بطور گیت نگار جانتی ہے اور فی وی سے شرم ہو سکتے والے اس کے ایک دو گیت اسے بہت پسند آتے ہیں۔ اس نے چار پانچ منٹ ہادی سے بات کی۔ وہ لکھنوکا فن جانتی تھی اور ان لوگوں میں سے تھی جو بات چیت دوران میں اپنے بارے میں کم بتاتے ہیں اور دوسرے کے متعلق زیادہ سے زیادہ جان لیتے ہیں۔

ظہیر نے اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔ "بھائی جلال کی کوشش سے ارم کو یہاں روم کی ہی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے۔ اب اسے وٹس کی وال روٹی نہیں کھانا پڑے گی۔"

وہ خوشی سے بولی۔ "جی جی ادال روٹی تو خیر میں وہاں بھی نہیں کھاتی تھی۔ بہترین Cook بن گئی ہوں ان دنوں چار مہینوں میں۔ اگر مجھے یہ ڈرنہ ہوتا کہ آپ مجھے مستقل کام پر لگا دیں گے تو آپ کو اپنی کوٹنگ کے ایک ٹکڑے کی ضرورت دکھاتی۔"

"بہت دور کی سوچتی ہو بھی تم۔ تمہیں تو اقوام متحدہ کے پلاننگ سیشن میں ہونا چاہیے۔" ظہیر نے کہا اور چپے لگا۔ ہنسنے ہوئے اس کی تو نہ ظہیر سے ہنستی تھی۔

شریفیوں نے اسامہ مانتے ہوئے باہر چلی گئی تھی۔ ہادی کو ارم کا کردار کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس گھر میں اس کی موجودگی کو اس کی سگی بہن بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ پھر بھی وہ یہاں موجود تھی۔ شام سات بجے کے لگ بھگ ہادی اپنے ہونٹ کے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ یوں تو وہ ظہیر، شریفیوں اور ارم وغیرہ سے کبہ کر آیا تھا کہ ان سے فون پر رابطہ رکھے گا۔ تاہم وہ اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس نے حجاب سے جو کمنٹ کی ہے اس پر پورا اترے اور اب ان لوگوں کی زندگی میں کسی طرح کا کوئی دخل نہ دے۔ خاک کا ڈال دے سارے معاملے پر۔ غالباً حجاب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان دونوں کے اس بے ضرر تعلق کے بارے میں کسی کو پتا چل گیا تو قیامت آ جائے گی۔ وہ اس گھر کا ٹھن سے نہ ماحول دیکھ چکا تھا اور خاص طور سے جلال الدین کا دلچسپ ملاحظہ کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا جلال جیسے لوگ ایسے معاملوں میں بے حد "فنی" اور جذباتی ہوتے ہیں۔"

”ٹھیک ہے۔ میں ہوٹل میں ہی ہوں۔“ ہادی نے بلند آواز میں کہا۔
فون بند کر کے وہ آرام گری پر نیم دراز ہو گیا۔ سیل فون اس کی خوزی کو چھو رہا تھا۔ یہ کیسی کایا ٹھپ ہوئی تھی۔ ہادی
سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح حجاب کا فون آئے گا۔ نہ صرف فون آئے گا بلکہ وہ خود بھی ہوٹل آئے کو تیار ہو گئی۔
اس نے جندی جندی کمرے میں بکھری ہوئی اشیاء دیکھیں۔ بید شیت درست کی لباس پہنچ کیا اور اس کا انتظار
کرنے لگا۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں پہنچ گئی۔ دو چکیلی دھار یوں والی اسی سیاہ چادر میں تھی جس میں پہلے بھی
یہاں نظر آتی رہی تھی۔ نقاب میں سے بس اس کی دلکش آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ کندھے سے
ایک جھول رہا تھا۔ رکی کلمات کی ادا گئی کے بعد وہ سوئے پر بیٹھ گئی۔ اس نے چادر میں لگی ہوئی Pins کھولیں اور
اسے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اسٹائش شلوار قمیص میں تھی۔ یہ ہاف سیلونیٹ تھی جو اس کے چکیلے بازوؤں کو
نمایاں کر رہی تھی اور مناسب جسم پر بہت فخری رہی تھی۔

”آپ کیا بیٹیں گی؟“

”بھئی نہیں۔ بس چند کراہتیں کریں گے۔“

”چند نہ کہتے تو ہوتا چاہیے۔“

”مگر میں تو بھولتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

اس سے آج پھر اس عذرا کی جھلک نظر آ رہی تھی جس سے وہیں میں ملاقات ہوئی تھی۔ تاہم وہ کچھ افسردہ بھی
دکھائی دیتی تھی۔ نہ جاننے کیوں اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں دیکھ کر ہادی کو احساس ہوا کہ ان بچوں کے پیچھے کوئی
گیمبر غم کر رہی ہے۔ رہا ہے اور شاید چھ گھنٹے پہلے تک وہ روتی بھی رہی ہے۔

”یاد آ رہا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”نہیں کرا آپ کی آنکھوں کا یہ رنگ اصلی ہے۔“ اس نے دیکھا تھا۔

”آج اس وقت میں نے لیٹرنگ راکھ تھے اور بال بھی ڈائی کیے ہوئے تھے۔ اصلی وہی ہے جو آپ کو اس وقت نظر
آ رہا ہے۔“ وہ پھر مسکرائی اور اس کی چیشانی کا چاند چمک اٹھا۔

”آپ نے کہا تھا کہ کوئی مجبور رہی تھی اس وقت۔ جس کے سبب آپ کو وہ رنگ روپ اختیار کرنا پڑا۔“

”مجبوری ہی کہہ لیں لیکن کیا آپ کو صرف یہ اتنی باتیں ہی کرتے رہنا ہے۔ کوئی نئی بات کریں بھئی۔ کیا کر
سکتے ہیں؟ کیا نہیں سمجھ رہے ہیں؟ اور آج کل ہر روز کیا ہے آپ کا وغیرہ وغیرہ؟ کہیں مجھے آپ کے کان کے پاس
چھو کر کوئی خبر دینا چاہئے؟“ اس نے کہا اور خود ہی ہنس دی۔

”صورت حال تو آپ نے سمجھ لی تھی لیکن پھر آج آج سے سنبھال لیا خود کو۔“ ہادی نے بوجھل آواز
میں کہا۔

وہ ایک تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ نیچا ہونٹ ہونے سے وہ مسکرائی میں دبا رکھا تھا۔ یہ بڑا پیارا انداز تھا اس
کا۔ چند سیکنڈ بعد ہوئی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ سے اس طرح کا رویہ اختیار کیا۔ میں واقعی چاہتی

تھے۔ شام کا چھپنا دھیرے دھیرے رات کی سیاہی میں ڈھل رہا تھا اور روم کی ہزار ہا روشنیاں نمایاں ہوتی جا رہی
تھیں۔ سڑک کی دوسری جانب ایک کشادہ گلی میں ایک کار پارک تھی۔ اس میں ایک مخمور جوڑا رومانی موڈ میں موج
تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں لیا ہوا تھا۔ اپٹ رہے تھے، چوم رہے تھے اور اس طرح کی دیگر حرکات
میں مصروف تھے۔ ہادی کن کنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی کار اب اس پھر سے
ہوئے جوڑے کے لیے بلا کافی ہے اور اب وہ کہیں اور جانا چاہیں گے۔ شاید کسی ہوٹل میں یا پھر کسی گھر کے بند روم
میں اور پھر یہی ہوا۔ کار وہاں سے روان ہو گئی۔ ہادی نے اپنی توجہ دیگر مناظر کی طرف مبذول کر دی۔ مناظر کی یہاں
کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر مزاج کے شخص کے لیے ہر طرح کا سنجیدہ اور غیر سنجیدہ منظر یہاں موجود تھا۔
اپنا تک ہادی کے فون کی بل ہو گئی۔ اس نے مسکرائی۔ مقامی نمبر تھا وہ کچھ دیر دیکھا رہا تھا کہ ایک دم اس کی
رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ اس نمبر سے ایک بار حجاب نے اسے فون کیا تھا۔ تو کیا یہ حجاب تھی۔ لیکن اسے ہوسکتا تھا؟
اس نے لرزتی آنکھوں سے کال ریسیو کی۔

”وہ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کھٹک دار سوانی آواز سنائی دی۔“

”ہیلو کون؟“ ہادی نے جاننے پر جتنے سوال کیا۔

”میں حجاب بول رہی ہوں۔ کیسے ہیں آپ؟“

”بس ٹھیک ہوں۔“ ہادی نے بچھے بچھے لہجے میں کہا۔

”کہاں پر ہیں اس وقت؟“

”بسک روم سنٹر میں واسکوڈے ہوٹل ہے۔ آپ نے کیسے یاد کیا؟“

”اس یونٹی دل چاہ رہا تھا بات کرنے کو۔ آپ اس وقت مصروف تو نہیں؟“

”نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”یہ ہوٹل واسکوڈے یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میٹروپولین کے ڈریلے دس منٹ کا راستہ ہے۔ آپ کا روم
نمبر کیا ہے؟“

ہادی کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ ”118 سیکنڈ فلور۔ لیکن کیا آپ آنا چاہ رہی ہیں۔“

”شاید۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”مجھے آپ ناراض لگ رہے ہیں۔ ہماری جو آخری بات چیت ہوئی وہ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مجھے آپ سے اس
طرح نہیں بولنا چاہیے تھا۔“

ہادی کو ڈر محسوس ہوا کہ وہ کہیں فون پر ہی معافی مانگنی نہ کر لے۔ وہ ڈر ازور سے بولا۔ ”آپ کی آواز صاف
نہیں آ رہی۔ شور آ گیا ہے لائن میں۔۔۔۔۔“

”اچھا پلیس۔۔۔ میں آتی ہوں آپ کے پاس۔“ وہ بھی ڈر ازور سے بولی۔ ”تقریباً آدھ گھنٹہ لگے گا۔“

موڑے جو نہیں میں نظر آیا تھا۔

دروازے پر شائستہ دستک ہوئی اور دروم سر دس والا چائے کی ٹرائی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ حجاب خود ہی کھڑی ہو کر چائے بنانے لگی۔ ہادی نے کئی اکیموں سے اسے دیکھا۔ وہ ٹرائی پر جھکی ہوئی تھی۔ شہد رنگ بالوں کی دو ٹیس چہرے پر جھل رہی تھیں۔ کمان کی طرح خم کھایا ہوا جسم دلکش نظر آتا تھا۔ اس کا حسین سراپا کسی بھی دیدہ ور کو اس کے عشق میں جلا کر سکتا تھا اور جلال نے اس کی ناقدری کی انتہا کر رکھی تھی۔ ہادی نے سوچا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو چیزیں حاصل ہو جائیں وہ اپنی قدر کھودتی ہیں۔

انہوں نے بڑے اچھے موڑ میں چائے پی۔ ہادی نے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا صرف چوبیس پچیس دن پہلے وہ ہسپتال میں تھی لیکن اب بیاد کی آواز اس پر نہ ہونے کے برابر تھے۔ غالباً وہ سخت جان بھی تھی۔ کسی ایسے ساز کے تاری طرح جورات بھر بھرتا رہتا ہے لیکن صبح پھر تازہ ہوا نظر آتا ہے۔ ہادی نے اس سے انگلی فیاض اور مخالف صوفیہ کا حال احوال پوچھا۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ کا۔ ان کا ہسپتال میں بے ہوش ہو جانا اور پھر گھروالوں سے بات چیت ابھی تک ہادی کے ذہن میں تازہ تھا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر اگلے روز دس بجے آنے کا وقت کر کے وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی ہادی کا بکا رہا۔ وہ کیا شے تھی؟ اس کی کوئی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نہ جانے کیوں ہادی کو لگ رہا تھا کہ وہاں حجاب کے سیکے یا سسرال میں کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کے رد عمل میں اس کے مزاج میں یہ اچانک تبدیلی آئی ہے۔

دو دن سے شریفان کو فون کھینکنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بڑے اسرار کے ساتھ کہا تھا کہ وہ اس سے گاہے بگاہے بات کرتا رہے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ اس وقت وہ انیسویں میں ہی ہوئی تھی۔ ہادی نے نمبر ملایا۔ چند ہی منٹ بعد شریفان کی بات و آواز سنائی دی۔

”میں کون بول رہا ہوں؟“ وہ بخالی میں بولی۔

”تمہارا اناہوری بھائی ہادی۔“

”اوہ بھوری بھائی جان اتنی تے کمال کردتا۔ بڑی لمبی حیاتی ہے آپ کی۔ یقین کرو میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی رہی تھی۔ کیسے ہیں آپ؟ کہاں ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ مجھے تو فکر پڑی ہوئی ہے کہ آپ کو بازاری کھانے کھانے پے رہے ہوں گے۔ کتنا چکا بھوتا کہ آپ یہاں سے جاتے ہی نہ۔ کیا آپ واپس نہیں آسکدے؟“

”اگر آپ کے سوال کرتی چلی گئی۔“

ہادی نے اس کے سوالوں کے جواب دیے۔ کئی باتیں کہیں۔ حال چال پوچھا۔ پھر باتوں ہی باتوں میں بدلت گیا۔ ”تمہاری ڈی باجی سیکے سے آگئی ہیں کہ نہیں؟“

”ڈی باجی یعنی حجاب کے ذکر پر وہ ایک دم آداس ہوئی۔“

”مجھے کچھ نہیں بولی۔“ وہ تو چاری قسم کی بندی ہیں جی جی جب وہ بے بھائی جان کا آرزو ہو گا وہ آ جائیں گی۔ سستی بھی ڈھکی بھوں کی بس دوڑی چلی آئیں گی۔ وہ بڑے

ہوں آپ سے۔ دیکھیے چل کر آپ کے پاس آگئی ہوں۔ گھر آنے والے جانی دشمن کو بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔“

”چلیں۔۔۔ آپ کو احساس ہو گیا۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ یقیناً مجھ سے بھی یہ تو فی ہوئی کہ میں نے آپ پر دباؤ ڈال کر آپ سے ملاقات کرنا چاہی اس کے لیے میں بھی بہت معذرت چاہتا ہوں۔“

”تو ٹینشن بادی صاحب! ات اڑو کے۔ اب بتائیے کیا پروگرام ہے آپ کا؟“

”وہی جو آپ نے حکم دیا تھا۔ کل سویرے جا رہا ہوں اگلی سے۔ آسٹریا کا پروگرام ہے۔“ ہادی نے عجیب صورت بنا کر کہا۔

”لگتا ہے کہ واقعی آپ کے پاس کوئی بڑا سا غبارہ پھوڑنا پڑے گا۔“

”ہادی ہنسے لگا۔ وہ بھی ہنس دی۔ لوگ ڈانٹوں کو موتیوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ واقعی موتی تھے اور ان کی چمک چیشانی سے ہم آہنگ ہو کر اس کی مسکراہٹ کو ایک بے مثال دلکشی دے دیتی تھی۔“

ہادی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”مذاق کر رہا تھا۔ فی الحال تو کہیں نہیں جا رہا اور جی تو یہی چاہتا ہے کہ وہ یہاں روم میں ہوں، آپ میرے ساتھ گھومیں پھر میں جہیز لے کر بھی جاتا ہوں کہ یہ آپ کے لیے ناممکن ہے۔“

”کے گھر والے خاص طور سے سسرال والے تو کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتے۔“

وہ عجیب نظروں سے ہادی کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا ہو اور میرے ایسا کرنے سے آپ تہ دل سے میری معذرت قبول کر سکتے ہیں تو میں ایسا کر سکتی ہوں۔“

اب ایک بار پھر ہادی کے لیے شدید حیرت کا موقع تھا۔ دروم میں اس کے ساتھ کیسے گھوم پھر سکتی تھی۔ جلال جیسا شخص یہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ وہ تو شاید خون پی جاتا اس کا۔ ہادی کی اب تک کی معلومات کے مطابق وہ دولت مندی نہیں کافی بااثر شخص بھی تھا مقامی انتظامیہ میں بھی اس کے رابطے تھے۔ میاں تو جیسے شہر میں شاپنگ کرنا کوئی معمولی کام تو نہیں تھا۔ غرض وہ ہر لحاظ سے ایک دیگندہ تھا۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ وہ ادا سے بولی۔

”نہی کہ آپ مذاق کر رہی ہیں۔ یا واقعی ایسا کر سکتی ہیں۔“

”میں کر سکتی ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ۔“

”وہ کیا؟“

”میں چادر میں رہوں گی۔“

ایک دم بات ہادی کی سمجھ میں آگئی۔ بڑا سادہ اور آسان حل تھا۔ اگر وہ حسب معمول پردے میں ہوتی اور اس کے ساتھ گھومتی پھرتی تو اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو نہ دیکھ پاتا۔ یہ تو سلیمانی ٹوپی جیسا معاملہ تھا۔ نوپنی پہنی اور منظر سے غائب۔ صرف آنکھوں کو دیکھ کر تو اس کے گھر والے بھی اسے نہیں پہچان سکتے تھے (اسے صرف ایک نئی چادر اور ہوتی جوتی کی ضرورت ہوتی)

”زبردست۔“ ہادی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ یہ حجاب کا وہی

سہا تھا۔ اسے ایک سخت گیر ساس اور سخت گیر شوہر ملا تھا۔ پچھلے ڈھائی تین سال میں یقیناً بے شمار موقعوں پر اس کی اور اس کے والدین کی سخت توہین ہوئی تھی۔ توہین کا ایک واقعہ تو تازہ و تازہ تھا اور ہادی کی یہاں موجودگی میں ہی ہوا تھا۔ جب کہ ذہن دو ماہ کا حمل ضائع ہو گیا تھا۔ اس کا الزام بھی خباب کی والدہ پر لگایا جا رہا تھا کہ اس نے بیٹی کو انجیریں کھلا دیں جس سے یہ نقصان ہو گیا۔ یہ بالکل بے وزن سی بات تھی لیکن جلال کی والدہ اس پر مصر تھیں۔

جلال نے حجاب کو ایک باندی کی طرح اپنے حکم کی زنجیروں سے باندھ رکھا تھا اور وہ شاید ماں باپ کی عزت کے لیے بندھ بھی جاتی تھی لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اپنی حاکیت مسقط کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا اور وہ سب کچھ برداشت کرتی تھی۔ مگر اب اس گھر میں کچھ ایسا ہو رہا تھا جو ایک بیوی کی حیثیت سے حجاب کو قبول نہیں تھا۔ تو کیا یہی دو عمل تھا جس کے رد عمل میں وہ اپنا جھکا ہوا سراٹھارتی تھی۔ جیسے بڑے سکون سمندر کی تہہ میں چھپا ہوا کوئی طوفان دھیرے دھیرے سطح آب کی طرف بڑھ رہا ہو۔ جیسے کوئی قیدی اپنی زنجیروں کو ہل رہا ہو۔ انہیں انجموڑے اور توڑنے کا سوچ رہا ہو۔ مدتوں سے زنداں کے اندھیروں میں رہنے والا شخص زنداں کی سلاخوں سے ٹکرائے کا ارادہ کر رہا تھا شاید ہاں یہاں کچھ انوکھا ہو رہا تھا اور اگر انوکھا ہو رہا تھا تو اس کا کوئی غویل پس منظر تھا۔ اب اچھی اس پس منظر سے آگاہ نہیں تھا لیکن اس کی شگنی کو محسوس کر سکتا تھا۔ اگر یہ پس منظر سنگین نہ ہوتا تو حجاب جیسی ہاتھوں کی جس اتنی جزاؤں کیسے پیدا ہوتی۔

ہادی بنیل واسکو نے کے کمرے میں قفل رہا تھا اور کھڑکیوں سے باہر روم کی ہزار ہا روشنیاں جیسے اس کے منظر اب کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کے علاوہ بھی یہاں کچھ موجود تھا۔ یہ ایک سایہ تھا۔ یہ سایہ ہادی کے کمرے سے باہر کوریڈور میں موجود تھا۔ وہ کوریڈور میں دھیرے دھیرے چلتا کمروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

روم اپنے گھرے میں موجود تھی۔ جلال کی کوشش سے اسے روم ہی کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہ وہ خوش تھی کہ اسے مجھ سے روم میں اور خاص طور سے اسی گھر میں رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ وہ قہر آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے گھر سے بھرے جسم پر قمیص کو کھینچ کر نیچے کیا۔ بالوں کو کندھوں کے پیچھے پھینک کر ڈھیلے دھالے بنونے کی صورت میں پانچواں درجہ ایک خاص انداز سے سر پر اور سینے پر پھیلا کر دیکھنے لگی۔ وہ دوپٹہ وغیرہ کم ہی استعمال کیا کرتی تھی مگر جب سے اس گھر میں زیادہ آنا جانا ہوا تھا اسے دوپٹے اور کبھی کبھی اوزن بھی مستعمل کرنا پڑ رہی تھی۔ اس گھر میں کچھ بھی جلال کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا تھا اور جلال کی مرضی ارم کو بھی عزیز تھی۔

وہ جاتی تھی جلال بہت آہستہ آہستہ لیکن مسلسل اس کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ رفتار بہت سست تھی لیکن نہ ہونے سے تو بہتر تھی۔ جلال کے یوں اس کی طرف متوجہ ہونے میں کچھ گھل وغل میاں بیوی یعنی جلال اور حجاب کی اسی چپقلش کا بھی تھا۔ اس چپقلش میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ صورت حال ارم کے لیے خوش آئند تھی۔ وہ کسی کی مصیبت پر بغلیں بھانے والی تو نہیں تھی لیکن یہ توقف بھی نہیں تھی۔ زندگی میں اسے جو بھی موقع ملتا تھا وہ اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
PK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

مصروف ہیں۔ خود تو لینے کم ہی جاتے ہیں۔ بس چھوٹے بھائی جان ظہیر کو بھیج دیتے ہیں یا ذرا سیور وغیرہ کہ۔۔۔
 ”دوڑی حاجی کے بکھی ہونے کی بات کیوں کی تم نے؟ کیا کوئی مسئلہ ہوا ہے؟“

”کوئی اک مسئلہ ہو تو پھر ہے ناجی! یہاں تو مسئلے ہی مسئلے ہیں سب سے وڈا مسئلہ تو..... بس..... کچھ نہ بچیں گی.....“ وہ کہتے کہتے ہات بدل گئی۔

"شریٹاں! تم بات بھی کرتی ہو اور ذرا قی بھی رہتی ہو۔ اچھی بہن ہو تم؟ میں نے تم سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ تم اگر کچھ کہو گی تو وہ صرف اور صرف میرے حکم کے رہے گا۔ یا تو بات شروع نہ کیا کرو یا پھر پوری کر دیا کرو۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی: "عجب تھی! آج کل سب سے وڈا مسئلہ تو یہ ہے بی بی ارم عیسیٰ ہوئی ہے۔ ہاں ہمیں کہ اس نے کیا جن چیزیں حانا ہے۔ چٹکی، سٹکی، پٹکی، ٹکی، تکی، دو بے شہر میں۔ اب پھر آگئی ہے۔ پیلے ڈوے، بھائی جان کتے تھے کہ آٹھ دس دن اتھے رہے گی پھر ہوٹل سٹوٹل میں چلی جائے گی۔ پر اب اتھے اکی تک مگنی ہے۔ اس کا مسئلہ شامان بھی آگیا ہے گھروچ۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" ہادی نے پوچھا۔

”سب نوح ہتا ہے جی کہ باجی حجاب اس اور لی بی سے چڑھائی ہیں۔ وہ بونی چالو یاں کرتی ہے دوسے بھائی جان کی۔ آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے۔ اس کو یہاں کی یوندر سنی وچ داخل کروئے راجے بھی دے بھائی جان بھی ہیں۔ یوں گندا ہے کہ وہ ہولی بولی اس گھر وچ اپنا رستہ بنا رہی ہے۔ اندر وڑ رہی ہے اسی گھر ہے۔ اب پرسوں سے ایک ہو راتم شروع ہو گیا ہے۔ ہتا کھس کہ باجی حجاب کو اس کا ہتا چاہے کہ کھس۔ اچ کھس تو کل مل جائے گا۔ ان کو بھلا دکھ ہوتا ہے اس کا۔ وہ ابھی ابھی تو بستر سے اٹھی ہیں وچاری۔“

”کون سا کام شروع ہوا ہے؟“ ہادی نے عام سے انداز میں پوچھا۔

”اب جناب دؤے بھائی جان اپنی کار و روچ بی بی ارم کو یونادور سخی جھڈ کے آتے ہیں۔ یونادور سخی، سنور کے دستے میں آتی ہے۔ سنور جانے کے لیے نکلے ہیں تو اس بی بی کو بھی اپنے نال بٹھا لیتے ہیں۔ اب تو صاف پتا چلنے لگا ہے تھا کہ یہ بی بی ڈورے ڈال رہی ہے دؤے بھائی جان پر بلکہ شاید ڈال ہی چکی ہے۔ اس گھر و روچ بڑی میسٹیس سکی میما باجی حجاب نے اب پتا نہیں یہ آخری کسر روگئی تھی۔“ ذرا توقف سے شریفاں بولی۔ ”عورت بہت کچھ سہہ لیتی ہے۔“

صیب جی اُپر یہ جو آخری ظلم ہوتا ہے اس ظلم پر چپ رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ بڑا مشکل۔“ شریفاں کی آواز رندہ مگلی۔

”کچھ آہٹ سنائی دی۔ شریفاں جلدی سے بولی۔ ”اچھا مجھے لگدا ہے کہ بی بی ارم آوازیں دے رہی ہیں مجھے شاید کوئی کم ہوگا۔ میں چلتی ہوں۔ ہم فیصل کریں گے۔ آپ نیلیفون ضرور کرنا۔“

”ٹھیک ہے شریفاں۔“ ہادی نے کہا اور فون بند ہو گیا۔

یہ عجیب انکشاف جو رہا تھا ہادی پر۔ اس کے دماغ میں لپٹل سی جگہ ہوتی تھی۔ شریفاں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس گھر میں بڑی مصیبتیں سہمی ہیں باجی قباب نے بتائیں یہ آخری کسر روگ تھی۔ دو لکڑی کے قصبہ فرش پر بھٹلا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کی اب تک کی معلومات کے مطابق قباب نے واقعی اپنے شوہر کے گھر میں بہت

شریوں "جی بی بی" کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ بڑے انہماک سے شیروائی پرپس کرنے میں لگ گئی۔
 مہیا کرتے ہوئے اس کا دوپٹہ دھلک گیا۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور دھو کر دیا۔ گریبان سے اس کا چمکیا جسم جھانک رہا
 تھا۔ بالوں کی دوئیں پیشانی پر آگئی تھیں جلال کے قدموں کی مدد سے چمکیاں دی۔ مگر وہ اپنے کام میں لگی رہی۔
 جب اسے اندازہ ہوا تو جلال اندر آ گیا ہے تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے گڑبڑا کر سر پر دوپٹہ درست کر
 لیا۔ "اسلام علیکم! آپ جلدی آگئے۔"

"ہاں۔ ذرا جلدی لگتا ہے۔" جلال نے بھاری آواز میں کہا۔ اس کے سر اُپے کی طرح اس کی آواز میں بھی
 وہب تھا۔

"پس۔۔۔ یہ دو چار منٹ کا کام رہ گیا ہے۔" ارم نے توجہ سے شیروائی کی سلونیں نکالتے ہوئے کہا۔
 "کسی ملازمہ سے کہہ دیتا تھا۔"

"کیوں کہہ دیتی۔ مجھے آپ کا کام کرنا اچھا لگتا ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ادا سے بولی۔
 جلال کبھی سانس لیتے ہوئے آگے نکل گیا۔

وہ جتنی جلدی آیا تھا۔ اتنی ہی جلدی روانہ بھی ہو گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ارم اپنے کمرے میں
 واپس آئی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کھڑکیاں چیک کیں اور پردے بھی براہِ بروئے۔ بستر پر نیم دراز ہو
 کر اس نے اپنے عینے کے نیچے سے سیل فون نکالا اور ایک نمبر ملا۔

کال مل آئی۔ دوسری طرف سے باریک سی مردانہ ہیلو سنائی دی۔ ارم غصے سے بولی۔ "کیا بات سے گلزار۔
 کیوں بار بار فون کر رہے تھے؟"

"گلزار جب بار بار فون کرتا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔"

"مقصد کیا ہوتا ہے۔ کسی لڑکی کو چھوٹا کر اس کے ساتھ چکر چلانا۔ چند دن اس کے ساتھ گھومنا پھرنا اور پھر
 اس کے پیچھے پڑ جانا۔ ہاتھ دھو کر۔"

وہ جسنے۔ "یہ سب کچھ دوسروں کے لیے ہے۔ تم تو اپنی سسٹر ہوارم! اور ہمیشہ رہو گی۔ اللہ نے تمہیں بڑی خوبیاں
 دی ہیں۔ پس تمہاری ہی سبک دھو کر۔"

"میں تمہاری ہی سبک دھو کر کانی سارے کہنے ہو۔ اچھا بکواس بند کرو۔ فون کیوں کیا تھا تم نے؟"

"ایک خوشخبری ہے سسٹر! تمہارا کھانا کھانا ہے تمہارے دشمن جان کا۔"

"اچھا اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ۔ وقت برا وقت کرو۔"

"وقت برا نہیں ہو گا۔ گارنٹی دیتا ہوں لیکن سسٹر! تمہاری ہی سسٹر دھو کر کرنی ہوگی۔ سچ کہتا ہوں ایک
 دم لڑکی چل رہی ہے۔"

ارم اسے ڈانٹنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن پھر اس کے لہجے میں اسے کچھ ایسی پچھل محسوس ہوئی کہ وہ ڈانٹ نہ سکی۔
 اچھا ہاتھی اس کے پاس کوئی خبر تھی۔ وہ اچھا لہجہ بدل کر بولی۔

حاصل کرنا چاہتی تھی اور یہ تو ایسا موقع تھا کہ اگر حاصل ہو جاتا تو زندگی ہی بدل کر رہ جاتی۔ جلال جیسے باحیثیت
 بلند اقبال شخص کا التفات حاصل ہو جانا اور پھر اس کی زندگی میں آ جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اور اپنی باجی فوزیہ جی
 جی ظہیر دور دیگر لوگوں کی پروا کیے بغیر وہ دلجمعی سے اس کام میں لگی ہوئی تھی۔

جو کچھ بھی تھا، وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، عجب پچھلے ڈھائی تین سال سے اس گھر میں ہے۔
 اس گھر میں اس کی جڑیں ہیں اور کسی حد تک جلال کے دل میں بھی۔ ان جڑوں کا آٹا نا ختم ہو جانا ممکن نہیں تھا۔ ارم
 کی بڑی بہن فوزیہ جی جی ظہیر اور گھر کے نوکر عجب کام بھرتے تھے۔ اب ابارش والے واقعے کے بعد سے جلال
 عینے میں تھی۔ ارم کے لیے یہ صورت حال فائدہ مند تھی۔ وہ آج کل یونیورسٹی بھی جلال کے ساتھ اس کی گاڑی میں
 ہی جا رہی تھی۔

وہ سوچوں سے چونک گئی۔ جلال کی والدہ اچھا نام کی آواز آئی۔ "ارم بیٹا! ذرا شریاں کو دکھا کہ کھانا کھاتی ہے۔
 بیٹھے ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ جلال کی شیروائی پرپس ہونے والی ہے۔ اس نے گیارہ بجے فٹنشن میں پہنچنا ہے۔
 "اچھا امی جی۔" ارم نے شہد بھرے لہجے میں کہا۔ "میں دیکھتی ہوں اسے۔"

اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی وہ باہر نکلی اور گاڑی نیا کی باز پارکر کے چلتی کی طرف آگئی۔ دروازے پر کھڑے
 ہو کر اس نے آواز دی۔ "شرییاں۔۔۔ اور۔۔۔ شریاں۔"

اس کی دوسری تیسری آواز پر شریاں بوکھلائی ہوئی سی ایٹیکسی کے برآمدے میں آگئی۔ "جی بی بی جی۔"
 ارم کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی کو فون کر رہی تھی۔

"کہاں دفع ہو جاتی ہے تو بیٹھے بیٹھے۔ کس کو فون کر رہی تھی۔"
 "وہ جی۔۔۔ جی وہ۔۔۔ اپنی وڈی بھین کو کجرات میں۔ وہ تانی نی ہے نا پچھلے اتوار کو۔"

"پس ٹھیک ہے۔ جب تک وہ پڑناتی نہ بن جائے اس کو فون کرتی جاؤ۔ ہم وہاں بیٹھے تیری جان کو روکے
 رہیں گے۔ کچھ ہم پر بھی نظر کرم فرمایا کر۔"

"آپ حکم کریں بی بی جی۔"
 ارم اسے لے کر گھر میں آئی اور اسے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس کے بعد کیا کرنا ہے۔

وہ خود اپنے کمرے میں آگئی اور نیل پالش کے لیے کوئی مناسب سا شیڈ منتخب کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ابھی
 وہ اس انتخاب میں مصروف تھی کہ اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر مین گیٹ کی طرف آٹھ گئی۔ چونک کر اس نے دبا کر آٹھ
 گیٹ کھول رہا تھا اور جلال کی شاندار "بھڑ" جیب اندر داخل ہو رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر جلال وقت سے پہلے آیا
 کیا تھا ارم نے جلدی جلدی ڈریسنگ کی درازیں بند کیں۔ آئینے میں خود کو دیکھا۔ بال درست کیے۔ کچھ دیر سوچتی
 رہی پھر اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں شریاں جلال کی شیروائی پرپس کر رہی تھی۔

اس نے تنقید کی نظروں سے شریاں کے کام کو دیکھا اور بولی۔ "دیکھو کار کا ستیاناس نہ کرو۔ اچھا تم
 ادھر لیکن میں کلثوم کو دیکھو۔ میں یہ کر لیتی ہوں۔"

بادی بول واسکوڑے کے سینہ دکھو براہے آرام دہ کرے میں بیٹھا تھا۔ وال کلاک کی ٹپک ٹپک کے ساتھ اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ قباب آن پھر اس سے ملنے آ رہی تھی۔ انیس روم میں گھومنے پھرنے کے لیے دکھنا تھا۔ دو دن پہلے تک بادی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو گا لیکن اب ہو چکا تھا۔ وہ سیارانی لڑکی یہ سب کر کے دکھا رہی تھی۔ اس نے دو پہر بارو بیچ کا وعدہ کیا تھا اور بادی اب جان چکا تھا کہ وہ وقت کی پابند ہے۔ اس نے بول کی بالکونی سے دکھا۔ ٹھیک بارو بیچ دو سڑک کراس کر کے بول کے مین گیسٹ کی طرف آتی دکھائی دی۔ اس طرح ایک براؤن چادر میں لپٹی ہوئی چہرہ مکمل طور پر نقاب میں تھا۔ فقط آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ بادی نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ آج اس کا شوئزر بیک بنایا تھا۔ اور غالباً سینڈل بھی ٹی ہی تھی۔ چادر سے باہر کس دو چیزیں ہی دکھائی دیتی تھیں اور یہ

80

”ہاں نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن کے اندر ہی جائے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ جیسے ہی کچھ پتا چلے مجھے بتاؤ۔ اور تمہیں ہزار وفد کہا ہے کہ فون کرنے سے پہلے سچ کر

کہو۔ مجھے کسی خواستخواہ کی مصیبت میں نہ ڈالنا۔“

جہاں سے گئے۔

بادی نے گہری سانس لی۔ "تین چار دن تو میں روم سنٹر میں گھومتا رہا۔ پھر سوچا کہ اگر گھومنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ وہاں گھوما جائے جہاں آپ جتلب کے ملنے کا امکان ہو۔ لہذا کاسیا کے علاقے میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ وہاں سے بھی بالوں ہونے والا تھا جب آئس کریم بار میں آپ کی دوست ماریہ پر نظر پڑ گئی۔ باقی کا کام آپ کے دیور صاحب نے آسان فرما دیا۔ وہ میرے گیتوں کے پڑستا نکل آئے اور آپ کے گھر لے گئے۔"

"لیکن آپ ڈھونڈ کیوں رہے تھے مجھے؟" حجاب نے اچانک سوال کیا اور ہادی گڑبڑا گیا۔
 ذرا سنبھل کر بولا۔ "اس لیے ڈھونڈ رہا تھا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ ہمیں یہاں سمندر کے کنارے بیٹھ کر کئی دن کھانے تھے اور ضرور کھانے تھے۔ اس لیے میں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔"

"کئی دن دانے؟ یہ کہاں سے آگئے جی۔"

"وہ سامنے سے۔" ہادی نے بانیں جاتب اشارہ کیا۔ ایک جین شرٹ والا اسمارٹ سا خواجہ فروش گلے میں اپنی دکان "کانے" ان کی طرف آ رہا تھا۔ وہ بچنے اور ابلے ہوئے بھٹے بچ رہا تھا۔ ساتھ میں دو تین طرح کی چٹنی تھی۔
 انہوں نے بچنے لیے اور کھانے لگے۔ ہادی کو یہ اچھا لگا۔ کیونکہ بھنا کھانے کے لیے حجاب کو اپنا انتخاب تھوڑا سا پیچھے رکھنا پڑا۔ آہن کے ہونٹوں کے پیچھے اس کے خوشنماواتوں کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگی۔

وہ بھنا کر دی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے پاؤں کو حرکت دے رہی تھی۔ یہ ایک جنچل انداز تھا۔ اس کی عمر کے ہارے میں انہی بادی دوست انڈاز وہ نہیں لگا سکا تھا۔ تاہم وہ بیس بانکس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ جلال اپنے ذلیل دلوں کی وجہ سے بھی لڑنے پر نظر آتا تھا۔ یوں میاں بیوی کی عمروں میں فرق مزید نمایاں ہو جاتا تھا۔

حجاب کی نگاہ سامنے سے تڑپنے لگی۔ وہ ایک جوڑے پر پڑی۔ یہ اپنے لباس اور طیلے سے غلجی علاقے کا جواڑا تھا۔ شاید کویتی یا امارتی۔ مرد درمیانی شکل و صورت کی لیکن لڑکی خوبصورت تھی۔ حجاب کوئی کوئی آواز میں بولی۔
 "اے صاحب سنا ہے یہاں لوگ اکثر دو تین شادیاں کر لیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اپنی بیویوں سے انصاف کر لیتے ہیں؟"

"دیکھیں نا اپنی بیویوں کو ایک جیسے فرق یا ایل سی ڈی لے دینا ایک جیسے کپڑے سلوا دینا یا ایک جیسے نوکر رکھنا یہ تو انصاف یا مساوی سلوک نہیں کہلا سکتا نا۔ بلکہ....." وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

ہادی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا آگے سے بولی۔ "بلکہ ہادی صاحب اگر ایک شوہر ان تین بیویوں کو برابر دیتے بھی دیتا ہو یعنی ایک ایک ہفتہ ہر بیوی کے پاس رہتا ہو تو بھی یہ مساوی سلوک تو نہیں کہلا سکتا نا۔ عورت، فرق، الٹا کی ڈی یا ہفتہ تو نہیں مانتی نا۔ وہ تو محبت مانگتی ہے اور کویت کوئی کے اندر سے نکلتی ہے۔ جیب میں سے نہیں نکل سکتی۔ عورتوں میں سے نکال سکتی ہے چاہے وہ کتنا بھاری ہو۔ ہمارا اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟"

"اسلام یہی کہتا ہے حجاب کہ مرد جب ہی ایک سے زائد شادیاں کرے جب وہ بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے۔"

دونوں اس نے بدل دی تھیں۔ (براؤن چادر بھی آج پہلی دفعہ ہی اس کے جسم پر نظر آ رہی تھی)
 پروگرام کے مطابق حجاب کو نیچے ہونٹ کی لابی میں ہی رکنا تھا۔ ہادی نے لفٹ کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے سیزر حیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ وہ آج اپنے بہترین لباس میں تھا۔ وہ اس جذبے کو کیا نام دے؟ اس کی سمجھ میں نہ نہیں آ رہا تھا لیکن یہ جذبہ اپنی جگہ موجود تھا حجاب کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی تھیں۔ اسے اپنے قریب پا کر اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ دونوں باقی کمرے ہوئے ہونٹ واسکوڈ سے اٹکے اور فٹ پاتھ پر پیدل ہی چلتے ہوئے سیزر حیاں کے انٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ روم میں یہ ایک چمکیلا دن تھا ٹھنڈی ہوا نے موسم کو خوشنما بنا دیا رکھا تھا۔ "کیا خیال ہے۔" کوئیسیم چلیں؟ "ہادی نے پوچھا۔
 "نہیں..... آج سمندر دیکھنے کا موڑ ہو رہا ہے۔ خود جنچل انداز میں بولی۔

"تو پھر ویسٹ روم۔"

"نہیں..... ویسٹ روم۔"

وہ دونوں دو منزلہ سیزر حیاں اتر کر سیزر ڈرائنگ میں بیٹھے اور پھر سے روم چکے نیچے ہی نیچے طوفانی رفتار سے سفر کرتے مغربی روم میں پہنچ گئے۔ انہوں نے پندرہ بیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا اور کسٹل پلو کو جیسے منجانب علاقوں کے نیچے سے گزرے یہ سفر وہ سڑک کے ذریعے کرتے تو شاید گھنٹوں لگ جاتے۔

ادوب سمندر ان کے سامنے تھا۔ بحیرہ روم کا لہر لیتا ہوا نیلکوں پانی جس پر سینکڑوں آفریکی بھٹس رومل تھیں اور جس کے ساحل پر بغریب انکارے تاحید نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ قلعاریاں مارتے ہوئے تھیں، جیہاں جیہاں جہر مٹ جاتی پھرتی دکانیں اور رنگ برنگی چھتریاں جن کے نیچے نیم عریاں مردوڑن ایک دوسرے کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ دونوں اس گہما گہمی سے ذرا بہت کرکڑی کے ایک سیزر پر بیٹھ گئے۔ حجاب محویت سے سمندر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں کسی بچے کی سی خواہش چل رہی تھی۔ وہ جیسے چادر اتار کر اور سینڈل پینک کران کی طرح سمیت سمندر میں کود جانا چاہتی تھی اس کے پانیوں سے کھیلنا چاہتی تھی، اس کی لہروں سے بغل گیر ہونا چاہتی تھی۔

"گھر میں کیا بتایا آپ نے؟" ہادی نے پوچھا۔
 "بس کالج کی ایک دوست یہاں روم آئی ہوئی ہے۔ اس کے ہاں جا رہی ہوں۔ ویسے امی ابو مجھ سے زیادہ پوچھ چمچ نہیں کرتے۔ انہیں معلوم ہے ان کی جینی کس مزاج کی ہے۔"

"یعنی میں اس وقت آپ کے کالج کی دوست ہوں۔" ہادی نے کہا۔
 حجاب کی آنکھوں سے ہلکا کر وہ مسکرا رہی ہے۔ یقیناً اس کی پیشانی پر چاند چمک اٹھا تھا اور سچے موتیوں کی مانند بہاؤ رکھا رہے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ براؤن چادر کے نقاب کے پیچھے اوجھل تھا۔

وہ بولی۔ "ہاں جی..... دوست کی حد تک تو بات صحیح ہے لیکن آپ کالج کے نہیں ہیں بلکہ کالج کی نہیں ہیں۔ آپ مجھ سے سوال پوچھتے جا رہے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ آپ مجھ تک پہنچے کیسے؟ لیکن پہلے والی شورنی تھیں۔"

کیوں ان آنکھوں کو دیکھ کر ہادی کو لگا کہ یہ تانے قد کا شخص عورتوں کا زبردست رسیا ہے۔ صرف ایک لمبے کے لیے ہادی کی نظریں اس سے چار ہوئی تھیں۔ ہادی کو اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے اور ایک طرح کی بھوک دکھائی دی تھی۔ انا لین خاتون قد میں اس سے تھوڑی سی لمبی ہی ہوگی۔ وہ غالباً اس کے لباس اور اس کی خوبصورتی کی تعریف کرنے میں مصروف تھا۔ خاتون ہنسی جا رہی تھی۔

ہادی اشیائے خورد و نوش لے کر واپس آ گیا۔ دونوں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ حجاب بڑے لائٹ موڈ میں تھی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اپنے بچپن کی، لڑکپن کی، کالج کے دور کی۔ اس نے روم بنی کی ایک یونیورسٹی سے اے سی ایس کیا تھا۔ ماسٹرز کرنا چاہتی تھی اور بہ آسانی کر بھی سکتی تھی لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا کیونکہ اس کی منتہی ہو چکی تھی اور سسرال والوں کو شادی کی جلدی تھی۔ حجاب کی باتوں سے ہرگز اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ اس نے ہادی کے سامنے حلال کو ایک اچھا اور دیکھ بھال کرنے والا شوہر قرار دیا۔ باتوں باتوں میں ہادی کو اچانک ایک بات یاد آئی۔ اس نے حجاب سے پوچھا۔ ”آپ کے گھر کے ایک کمرے میں غالباً آپ کی کسی فرینڈ کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ نیچے لکھا ہوا ہے۔ میں تمہیں بھول نہ پاؤں گی۔“

ہادی نے دیکھا۔ حجاب کی آنکھوں میں ایک دم ایک سایہ سالہرا گیا۔ وہ جیسے ٹھک سی گئی تھی۔ شاید کوئی کہاں تھی اس تصویر کے پیچھے۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔

حجاب نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ بڑی پیاری دوست تھی میری۔ اب جا چکی ہے۔“

”جیسا سے کوئی داپس نہیں آتا۔ اس کی آواز میں درد لہریں لینے لگا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ آئی ایم سوری، کیا ہوا تھا؟“

”بس۔۔۔۔۔ ایک حادثہ، جس میں جان بلی گئی تھی۔ اپنے گھر کی سیزھیوں سے گری تھی۔ سر پر گہری چو نہیں لگی۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔“

”ذہنی سید۔ شادی شدہ تھی؟“

”ہاں۔“ حجاب نے مختصر جواب دیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔ ہادی بھی اس کا سوڈ برا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دو تین منٹ بعد ہادی نے بڑی صفائی سے موضوع بدل دیا۔ وہ دونوں پاکستان کی باتیں کرنے لگے۔ حجاب اپنے والدین کے ساتھ بہت مچھوٹی عمر میں آئی تھی لیکن اس کی مٹی کو پاکستان سے نسبت تھی۔ اسے پاکستان کے نام سے میں جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ کئی بار وہاں جا بھی چکی تھی۔ ہادی نے اسے پاکستان میں اپنی مصروفیات اور والدہ اور بھائی کے بارے میں بتایا۔

اس گفتگو کے دوران میں اس کا دھیان دھاری دار شرٹ والے شخص کی طرف بھی رہا۔ وہ مسلسل ان کے آس پاس نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے ایسے کاموں کا کافی تجربہ ہے۔ ہادی کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو شاید اس کی سرگرمی

”اور ہم نے مساوی سلوک سے مراد فریج کار اور ایل سی ڈی وغیرہ لے رکھے ہیں۔ اس حکم کی اصل روح تو محبت اور چاہت میں پوشیدہ ہے جس کو ہم بکسر فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ کام اللہ نے اتنا آسان نہیں بنایا ہے۔“

دو باتیں کر رہی تھی اور ہادی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں ہادی کی سمجھ میں آ رہی تھیں اور وہ وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی جس کے سبب وہ یہ باتیں کر رہی تھی شریاں نے جو کچھ فون پر ہادی کو بتایا تھا وہ ظاہر ہے کہ حجاب کے علم میں بھی تھا اور اس نے حجاب کی ہنسی کو اندر سے درہم برہم کر رکھا تھا۔ اس نے اس گھر میں بہت کچھ سنا تھا لیکن اب ایک سو کن کا اندازہ بننے کے لیے وہ خود کو تیار نہیں کر پا رہی تھی وہ جوان تھی۔ خوبصورت تھی۔ اس کے دل میں ایک باوقار شوہر اور ایک پھولوں بھر گئے بچپن کی بکواس تھیں۔ ان خواہشوں کو روکنا جابر ہاتھ شادی کے صرف ڈھائی تین سال بعد اس سے اس کی نصف ازدواجی زندگی چھیننے کے پروگرام بن رہے تھے۔ کیا کوئی ناقابل غلطی کر دی تھی اس نے؟

وہ باتیں کرتی رہی۔ ہادی نے بھی کہیں کہیں جواب دیا۔ وہ زیادہ ہنسنا ہی رہا۔ پھر لاہور سے شیخوئی کی آمد مگنی۔ ہادی سننے لگا۔ فون پر بات کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں حجاب کی طرف ہی تھیں۔ وہ سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ سمندر میں تلام تھا۔ موجیں اٹھ رہی تھیں۔ بلند ہو رہی تھیں اور ساحل سے ٹک رہی تھیں۔ شاید ایسا ہی کچھ حجاب کے اندر بھی تھا۔

فون پر بات کرتے ہوئے اور شیخوئی سے گیتوں کے لیے چند دنوں کی مزید مہلت مانگتے ہوئے ہادی کی حجاب کے عقب میں ایک سرخ چھتری کی طرف اٹھ گئی۔ گہرے سرخ رنگ کی یہ چھ سات فٹ اونچی تھی۔ اس کے قریب جو درمیانے قد کا بندہ کھڑا تھا اسے ہادی دوسری تیسری بار دیکھ رہا تھا۔ ہادی نے پہلی بار اسے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے میگزین میں دیکھا۔ پھر جب وہ خوانچہ فروش سے بھٹے لے رہے تھے۔ یہی شخص ان کے سامنے سے گزر کر پانی کی طرف گیا تھا۔ اب وہ چھتری کے قریب موجود تھا۔ چائیں کیوں یہ شخص ہادی کو مشکوک لگا۔ وہ مسلسل ان کے آس پاس تھا کیا وہ کسی چکر میں تھا؟ کوئی جیب کترا، افٹائی گیرا یا کوئی مزید خطرناک شخص۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں بھی وہ شخص ہادی اور حجاب کے آس پاس ہی رہا۔ ہادی کو یقین ہونے لگا کہ وہ کسی چکر میں ہے۔ بہر حال اس بار سے میں ہادی نے حجاب کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ خوفزدہ ہو جاتی اور یہ تفریحی ”ٹرپ“ شاید اسی جگہ ختم ہو جاتا۔

تھوڑی دیر بعد ہادی کو لڈ ڈرنگ لینے کے بہانے اس سرخ چھتری کی طرف گیا۔ چھتری کے ساتھ ہی ایک سائبان کے نیچے کو لڈ ڈرنگس اور اسٹیکس وغیرہ کا شال تھا۔ ہادی نے کچھ چپس لیے اور چارٹن پیک ڈرنگس۔ درمیانے قد کا دھاری دار شرٹ والا شخص اس سے فقط دس بارہ فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ اس کا جسم کسی گیندے کی طرح مضبوط اور کٹھا ہوا تھا۔ وہ بظاہر بڑے انتہا کے ساتھ ایک انا لین خاتون سے اطالوی میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوق اور ہوشیاری کی چمک تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں سمجھ اور بھی ظاہر کرتی تھیں۔ نہ جانے

سے آگاہ نہ ہو سکتا۔

حجاب نے کہا: "چلیں..... اب کوئیسٹم (قدیم اسٹڈیم) کی سیر ہو جائے۔"

کوئی اور موقع ہوتا تو ہادی اس پیشکش کو سر آنکھوں پر رکھتا لیکن اس وقت دھاری دار شرٹ والے کی وجہ سے صورت حال مختلف تھی۔ اس نے کہا: "کیوں نہ کل چلیں..... تازہ دم ہو کر۔"

"لیکن..... کل تو میں نہیں آسکوں گی..... بلکہ..... شاید دوبارہ آتی نہ سکوں۔"

ہادی کے سینے میں مایوسی کی گہری روزگاری تھی۔ "یہ تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔" وہ بولا۔

"کیا اتنا کافی نہیں ہے؟" اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

"آپ نے جتنا ستایا ہے، اس کی خاطر تو آپ کو کم از کم چھ سات دن مجھے کہنی دینی چاہیے۔"

ہادی نے مزید کرید نامناسب نہیں سمجھا۔ "اچھا تو پھر کل آ رہی ہیں نا آپ۔" ہادی نے یاد دہانی کے لیے اشارہ کیا۔

"جتنا قصور کیا ہے۔ اتنی ہی سزا دیجیے۔"

"یعنی یہ آپ سزا بھگت رہی ہیں۔"

وہ ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ لیکن یہ سرفی ہادی کو نقاب کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی وہ پیشانی جو حجاب کے چہرے کی سمت تھی اور چاندنی بن جاتی تھی۔ "مذاق کر رہی تھی یقین کریں۔ آپ کے ساتھ کھڑا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بیماری کے بعد کوئی تانک سال گیا ہے۔ ایک دو ہفتے تو سخت ڈپریشن میں رہی ہوں۔"

"تانک جب شروع کریں تو اسے چند دن تو استعمال کرنا چاہیے۔" اس نے نامحاند انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! لیکن اگلی ڈوز اگر پرسوں ہو جائے تو کوئی حرج تو نہیں؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔" ہادی نے کہا۔

اسی دوران میں حجاب کو ساحل کی ریت پر قلعاریاں مارتا ایک جاپانی بچہ نظر آیا اس نے اسے گود میں اٹھا کر چما

چاٹا۔ وہ اس کی بانہوں میں کھیلنے لگا۔ اس کی جاپانی ماں اور والد خوش ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ہادی اور حجاب ایک ساحل

رستورٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے کھانا کھایا۔ کولڈ کافی پی اور باتیں کرتے ہوئے واپس روانہ ہو گئے۔

میٹروٹرین میں بیٹھنے تک دھاری دار شرٹ والا شخص ہادی کو کہیں نظر نہیں آیا لیکن جب وہ ہوٹل واسکوڈے کے

قریب ٹرین سے اتر رہے تھے اس نے دوبارہ اپنی منجھکی جھٹک دکھادی۔ ابھی تک حجاب کو اس کے بارے میں کچھ

معلوم نہیں تھا۔ حجاب کو یہاں سے دوسری ٹرین پکڑنا تھی۔ جب تک حجاب ٹرین میں سوار نہیں ہو گئی۔ ہادی وہیں کھڑا

رہا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر دھاری دار شرٹ والا حجاب کے پیچھے گیا تو وہ خود بھی ٹرین میں سوار ہو جائے گا اور

اسے بھگتا گھر تک چھوڑ کر آئے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ شخص وہیں پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں موجود رہا۔

ہادی پیدل اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ شخص آس پاس موجود ہے۔ اس کی

موجودگی ہادی کے اندر ریش اور پریشانی کی لہر ابھار رہی تھی۔

حجاب کمر کے باغیچے میں ٹہل رہی تھی۔ پھر وہ آرام دو کرتی پر بیٹھ گئی۔ امی، فیصل کے ساتھ اپنے "چیک آپ" کے

لے ہسپتال گئی ہوئی تھیں۔ ابو کمرے میں سو رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی وہ س کے مطابق کل اسے ہادی کی

طرف جانا تھا۔ ان کا پروگرام حسب سابق روم میں گھومنے پھرنے کا تھا۔ وہ تاحال مذہب میں تھی، جائے کہ نہ

پہلے سے تھی۔ کیوں ہادی اس کو بہت اپنا سالک تھا۔ جیسے وہ اسے بہت پہلے سے جانتی ہو۔ اس کی ہر ادا پہچانتی ہو۔

اس کے لیے کی شائستگی سیدھی حجاب کے دل میں اترتی تھی۔ بہر حال اس جذبے میں کسی طرح کی رومانیت کو دخل

نہیں تھا۔ یہ کسی کی اہمیت تھی جیسی کسی قریبی عزیز یا گہری سہیلی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ لیکن حجاب نے بار بار یہ بھی سن

دکھا تھا کہ مرد اور عورت کے درمیان دوستی نام کی چیز تادیر قرار نہیں دیتی۔ یہ سمجھتے سمجھتے ختم ہو جاتی ہے یا بڑھتے

بڑھتے محبت بن جاتی ہے۔ بہر حال حجاب اس بات کی قائل نہیں تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ انسان اندر سے مضبوط ہوتا تو ہر

حکم کی صورت حال کو اپنی مرضی کے مطابق تو حال سکتا ہے۔ ہر طرح کی روایتی اور معاشرتی پیشین گوئیوں کو غلط ثابت

کرتا ہے۔

ایک بات غور طلب تھی اور یہ خود حجاب کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بے شمار زنجیروں میں بندھی ہوئی

تھی۔ انہیں تو نہیں سکتی تھی۔ پھر وہ انہیں کیوں پہچانتی تھی۔ اس نے اپنے سسرال میں بہت سی "ہیستس جھیلی

جھیلی" کی کڑی آزمائشوں سے گزری تھی۔ شادی کے چند دن بعد ہی اس کے والدین کی بے وجہ توہین شروع ہو گئی

تھی۔ شادی کے دو مہینے بعد ہی جلال نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس کی ناراضگی کی

تجربہ حجاب کی اس جرأت کے اندر نہیں تھا۔ حجاب نے شادی سے پہلے کی تھی۔ اس نے حجاب کرنے کی بات کی تھی۔

سب کچھ بعد میں اس نے حجاب کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جلال سے معافی بھی مانگ لی تھی لیکن جلال کے دل میں یہ

بات اٹک کر رہی تھی کہ شادی سے پہلے حجاب نے اپنے چاہ کرنے کو ایک شرط کے طور پر پیش کیا تھا۔

ماس آغا خانم کا رویہ پہلے روز سے ہی حجاب کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔ حجاب کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ

غراب سے غراب تر ہی ہوا تھا۔ وہ حجاب کے خلاف جلال کو پھڑکاتے ہیں۔ کڑی سیاب رہتی تھیں۔ یہ بات حجاب کے

معاہدہ کے سسرال اور سسکے میں کسی کو معلوم نہیں تھی کہ جلال اس پر ہاتھ بھی اٹھاتا تھا۔ یہ سلسلہ شادی کے ایک سال

پھر ہی شروع ہو گیا تھا۔ اب تو حجاب ان چھٹروں کی تعدد بھی بھول چکی تھی جو اس نے کاہے بکاہے کھائے تھے۔

دو چار ہفتوں کی مہمان ہے لیکن اس مہمان کے سائے دھیرے دھیرے اس گھر پر بڑھتے ہی گئے تھے۔ آخر ایک موقع پر حجاب نے جلال سے اس ضمن میں بڑ زور احتجاج کیا تھا۔ وہ کئی دن روتی رہی اور اس نے کھانا بھی شاذ و نادر ہی کھایا۔ جب جلال نے اسے تسلی دی تھی کہ ارم کا داخلہ ویش کی یونیورسٹی میں ہو گیا ہے اور وہ یہاں سے جاری ہے۔

یہ چند دن حجاب کے لیے قدرے سکھ کے تھے لیکن تب ایک بار پھر انڈیٹوشن کے دیو پٹنگھلاڑے ہوئے اس سے دل و دماغ میں گھس آئے تھے۔ وہ دن حجاب کے لیے بڑا اندوہناک تھا اور آج بھی اسے یاد تھا۔ گھر گریبستی کی ہزار ہا آہیں ایک طرف اور یہ جانکاہ انکشاف ایک طرف۔ اس رات اس نے جلال کو فون پر ارم سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ اتنے تیار ہوا تھا کہ وہ پوری کوشش کر رہا ہے۔ امید ہے کہ چند روز تک روم کی یونیورسٹی میں اس کا داخلہ ہو جائے گا۔ تب حجاب پر یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ ارم اس لیے ویش نہیں گئی تھی کہ جلال نے اپنی شریک حیات کے آنسوؤں کا خیال کرتے ہوئے اس کو ویش جانے کی صلاح دی تھی۔ بلکہ وہ اس لیے گئی تھی کہ اسے کوشش کے باوجود روم کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں مل رہا تھا۔ ویش والا انتظام عارضی تھا۔

اور یہ وہی رات تھی جب حجاب کے سینے میں پہلی بار ایک عجیب سی بے باکی کی چنگاری چمکی تھی۔ اس چنگاری کو اجاڑتے ہوئے حجاب نے جلال سے شہید بیزار کی کا نام ضرور دیا جاسکتا ہے۔ اگلے روز جلال اپنے کام سے پٹانہ چلا گیا تھا اور حجاب اس کی اجازت سے اپنی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے ویش چلی گئی تھی اور پھر ویش میں اس کے قدم ایک شب اس گلی میں پڑے تھے جہاں ایک راہزن ہادی کا بیگ اٹھا کر بھاگا تھا اور حجاب نے اسے روکنے کے لیے اس کے راتے میں ایک چمتری گرائی تھی۔ حجاب کے لیے وہ عجیب قہل پھل کے دن تھے اس نے اپنے مزاج سے بالکل ہٹ کر کام کیا تھا۔ خود کو سیرپائے اور موج مستی میں گم کرنے کی کوشش کی تھی۔

حجاب کو دوسرا بڑا جھٹکا کب لگا تھا۔ اسے دوسرا بڑا جھٹکا صرف تین چار دن پہلے لگا تھا۔ حجاب نے جلال کی ای (پہنائی) فون کر کے ان کی خیر خیریت پوچھنا چاہی تھی۔ وہ تو سو رہی تھیں (یا شاید ویسے ہی بات کرنا نہیں چاہتی تھیں) حجاب کی بات شریفان سے ہو گئی تھی۔ شریفان کی زبانی یہ اطلاع حجاب تک پہنچی تھی کہ ارم نے پیش قدمی کرتے ہوئے ایک اور بڑا قدم آگے بڑھایا ہے اور اب وہ سویرے جلال کے ساتھ اس کی کار میں یونیورسٹی جاتی ہے۔ حجاب ہنسی میں تھی۔ وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ جلال کے رائیڈ خاندان میں مردوں کے اندر دوسری شادی کا رجحان پایا جاتا تھا۔ یہ رجحان بہت زیادہ تو نہیں تھا مگر حال موجود تھا۔ اس روز شریفان سے بات کرنے کے بعد حجاب کے اندر دوسری چنگاری چمکی تھی۔ اس بار اس چنگاری کی چمک پہلے سے زیادہ تھی اور اس کی پیش بھی۔ پھر اس روز جلال نے حجاب کے ہادی سے فون پر بات کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے سابقہ رویے پر معذرت چاہتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ گھر سے بھرنے کے لیے جائے گی۔ بے شک ہادی سے اس کی بات ایک قلم دوست کی حیثیت سے ہوئی تھی مگر حجاب میں یہ جرأت کہاں سے آئی تھی کہ اس نے فون اٹھایا اور ایسی بات کر پائی۔ اسے خود اپنی سمجھ بھی نہیں آتی تھی کہ اس نے کیا کیا ہے۔ کل کئی گھنٹے تک وہ ہادی کے ساتھ رہی تھی اور انہوں نے سمندر دیکھا تھا اور اب وہ پھر سوچ رہی تھی۔ مگر بے تذبذب میں تھی۔ پتا نہیں

ہاں پہلا تھپڑ اسے آج تک نہیں بھولا تھا۔ حجاب کے ایک خالہ زاوی کی شادی تھی۔ جلال نے اسے وہاں جانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ مردوں اور عورتوں کے لیے بیٹنے کا علیحدہ انتظام نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں بیہودگی ہو گی۔ اس کے علاوہ ذہنک، مہندی کے گیت اور اس طرح کی دیگر رسوم بھی جلال کو بالکل پسند نہیں تھیں۔ وہ کسی شادیوں پر جانے سے گریز کرتا تھا۔ حجاب نے بہت کہا کہ وہ پردے میں رہے گی، کسی کو نہ دیکھی جائے گی۔ تیار ہوئی ہے تو نہیں مانا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت جب کسی شادی بیاہ میں جانے کے لیے کپڑے بناتی ہے۔ تیار ہوتی ہے تو پھر وہ اپنا آپ دکھانے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ کسی نہ کسی طور وہ خود نمائی کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ حجاب کا جرم یہ نہیں تھا کہ وہ خدا خواست پھر بھی شادی پر گئی تھی۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ نہ جانے کی وجہ سے چپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں رونے کے سبب لالی تھی۔ جلال نے اس روز کہا تھا کہ باہر کھانا کھائیں گے۔ عشاء کی نماز کے فوراً بعد حجاب تیار بھی ہو گئی تھی۔ جانے سے ذرا پہلے جلال کی نگاہ حجاب کے چہرے پر پڑ گئی اور اس کا مود ایک دم خراب ہو گیا۔

”تم کھانے پر جاری ہو یا کسی کے سوگ پر؟“

”کیا ہوا جلال؟“ وہ لرز کر پوئی۔

”کون مر گیا ہے تمہارا جو ایسی صورت بنائی ہوئی ہے۔“ وہ مزید بھڑک کر بولا۔

وہ دیکھتے میں رہ گئی۔ ”جلال! میں نے کیا کہا ہے۔ آپ کیوں بولتے ہیں اس طرح۔ ایسے تو لوگ لو کرانچل سے بھی.....“

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ جلال کا تھپڑ اس کے زخماں پر پڑا تھا۔ وہ جیسے چمکا کر بستر پر گر پڑی تھی۔ کار کی چابی فرش پر پھینچ ہوا باہر چلا گیا تھا۔ ہاں اس کے بعد بھی بند کمرے میں کئی تھپڑ حجاب کے حصے میں آئیں لیکن یہ تھپڑ آج بھی اسے یاد تھا۔

حجاب نے سب کچھ سہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سسرال والوں کے دل بیٹنے کی بھرپور کوشش بھی کی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو جلال کی مرضی میں فنا کر لیا تھا۔ وہ دن کو رات کہتا تھا تو وہ بھی بڑے خلوص سے اسے رات کہتے اور سمجھتے لگتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیا بات تھی۔ جلال کی چاہت کو حجاب کی خود پسندیوں اور عاجزیوں سے ہمیشہ جبر ہوا تھا۔ بہر حال حجاب کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اگر وہ کچھ جھیل رہی تھی تو اپنے گھر کے لیے جھیل رہی تھی۔ یہ اس کا آئینہ تھا۔ اسے ستوانے کے لیے وہ ہر آزمائش سے گزر سکتی تھی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کے دل میں عجیب اندیشے سر اٹھانے لگے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے آئینے میں کسی اور کے قدم بھی پڑنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ قدم بہت آہستہ آہستہ لیکن بتدریج آگے بڑھ رہے تھے۔ پہلے پہل ارم صرف چند روز کے لیے ان کے گھر چھٹی تھی۔ ان دنوں وہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کوشش کر رہی تھی۔ بعد ازاں اس نے اپنا قیام بڑھا دیا اور گھر میں اپنے لیے ایک الگ پورشن کھلوا لیا۔ اپنی بڑی بہن فوزیہ کی مخالفت کے باوجود وہ اس گھر میں رہ رہی تھی اور روز بروز جلال کے ساتھ بے تکلف بھی ہو رہی تھی۔ ان دنوں جلال نے حجاب کو طفل تسلیم کر دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ یہاں

”جی نہیں لیٹی ہوئی تھی۔“

شریفان ہنسنے دیر خاموشی رو کر بولی۔ ”باجی! آپ گھر واپس کیوں نہیں آ جاتیں۔ دل بڑا ادا اس ہے۔“

”خیر یہ تو ہے شریفان۔“

”ہاں ایسا ہر چہ کا نہیں ہو رہا۔ سچ سمجھو تو میرا دل رو رہا ہے اس ویلے۔“ وہ جیسے بے ساختہ کہہ گئی۔

”کیا ارم بی بی کی طرف سے کوئی بات ہوئی ہے؟ کوئی جھگڑا کیا ہے اس نے تم سے؟“

”مجھ سے کرتی تو کوئی گل نہیں تھی۔ وہ تو آپ سے کر رہی ہے۔ پورا دیر لے رہی ہے تہاڑے سے۔“

حجاب نال زور سے دھڑکا۔ ”شریفان کھل کر بتاؤ۔“

وہ غصہ بی آواز میں بولی۔ ”وہ اوپر والے کمرے وچ چلی گئی ہے جی۔ وہ بھائی جان کے نال والے کمرے

وچ۔ کبھی ہے کہ تخت (بیچے) والا کمرہ ہوا دار نہیں ہے۔ مینوں چٹکی طرح ہتا ہے کہ اس کو کس طرح کی ہوا چاہیے۔

میں سارا آج سمجھ رہی ہوں وہ ڈی باجی۔“

”مغور نے کچھ نہیں کہا اسے؟“

”میں کسی کی سختی ہی کب ہے جی۔ وہ کیا کہتے ہیں جی ساری خدائی ایک پاسے میرا ڈھولن باجی ایک پاسے۔ اسے

آج کل دوسرے بھائی جان کے سوا کسی کی پروا نہیں ہے جی۔“ شریفان کی آواز میں ڈکھلہریں لے رہا تھا۔

حجاب کے دل پر بھی اس خبر نے غیر معمولی اثر کیا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اس اوپر والے

کمرے میں ارم نے ایک بار پہلے بھی آنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت حجاب نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے

جلال سے کہا تھا۔ ان کی پرائیویسی متاثر ہوگی۔ جلال کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی لیکن اب ارم نے پھر وہ کمرہ منتخب

کیا اور جلال نے اس کی اجازت دے کر حجاب کو بتایا تھا کہ بات کتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یقیناً ارم کا

دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نام نہاد بھی عمل دخل تھا۔

حجاب کچھ سننے کو تیار تھی۔ جلال سے ہر طرح کی جسمانی اور ذہنی توجہ برداشت کر کے بھی اس کے آگے پیچھے

نہیں ہٹتی تھی۔ جی جی کر رہی تھی لیکن دوسری عورت سے بچنے کے لیے کسی کے سامنے کسی طرح کی عاجزی یا مستحضری کا

اظہار اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایسا کرے گی تو عورت کے درجے سے

نیچے گر جائے گی۔ ایک مفاد پرست جی جی کا حق مل جائے گی۔ کوئی ایسی جنس جو دامنے پانی اور زندگی کی دیگر سی باتوں

کی خاطر عورت اور بیوی کا روپ دھارے گی۔

شریفان سے بات کر کے وہ دیر تک بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر

بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر

بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر

بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر

بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ کر

کیوں اس کی چھٹی جس اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ بے شک حجاب انہی طرح جانتی تھی کہ یہ ایک بے خبر
مصرفیت ہے اور بادی ہر طرح سے ایک شریف انسان شخص ہے لیکن پھر بھی دل کے اندر خوف کے سائے لپکتے
رہے تھے۔

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے نیم وا آنکھوں سے سوچتی رہی۔ اس دوران میں اطالوی ملازمہ دودھ دیتی
صافائی کرتے ہوئے کاحن روم کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر بلب کی دو دھیر روشنی تھی۔ حجاب کی نظر
سب سے پہلے دیوار پر تصویر پڑی۔ یہ اس کی عزیز ترین دوست بینش کی تصویر تھی۔ شدید تذبذب کے ان لمحوں
میں یہ تصویر عجیب سا تاثر لگاتی تھی۔ حجاب کو لگا کہ یہ تصویر فیصلہ کرنے میں اس کی مدد کرنے والی ہے۔

حجاب کی رگوں میں سنسنائیت لگی چھل چھل گئی اس تصویر نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ”حب کیا مجھے بھول
گئی؟ میرے انجام کو بھول گئی۔ یہ مردوں کی دنیا ہے میری چاری حب! یہاں ہماری چھوٹی سی جراثیم کا
دیا جاتا ہے۔ ایک ذرا سی مرضی کو بغاوت کہہ کر قابلِ مزا ٹھہرایا جاتا ہے۔ نہیں حب! یہ ٹھیک نہیں۔ کیا
طرح ایک چھوٹے سے بچہ میں پھر پھڑکتے ہوئے جان دینا چاہتی ہو؟“

حجاب کو ایک جھرجھری سی آئی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسی لمحہ وہ بھائی جان کے چہرے اس کی نگاہوں میں
کھوے۔ وہ ایک نہیں ان گنت ذخیروں میں جکڑی ہوئی تھی اپنی چھوٹی سی خوشی پر ایک معمولی سی مرضی پر بھی اس کا
اختیار نہیں تھا اور شاید اس میں اتنی ہمت بھی نہیں سکتی تھی۔ دو سال پہلے والدہ کی بیماری پر بہت زیادہ اخراجات اٹھائے تھے۔
ان اخراجات نے اس فیملی کو قرضے کے بھاری بوجھ سے دبا رکھا تھا۔ یہ گھر بھی جس میں اس کے والدین کا
تھے۔ ایک طرح سے رکن تھا۔ کسی بھی وقت چھت ان کے سروں پر سے سرک سکتی تھی۔ کچھ قرضہ بھائی فیصل کی
سے بھی سرچڑھا تھا۔ فیصل نے اپنے کسی ڈاکٹر دوست کے ساتھ مل کر گھٹ شاپ کھولی تھی۔ وہاں ڈیکیتی کی واردات
ہوئی اور بہت زیادہ نقصان ہوا۔ شکر تھا کہ اللہ نے جانی نقصان سے بچالیا۔

اپنے حالات اور مجبوریوں کا سوچ کر ایک عجیب سی ناتوانی حجاب کے رگ و پے میں اتر گئی۔ وہ جو ہادی کو کال
کرنے کا سوچ رہی تھی۔ ارادہ بدل کر کمرے میں چلی گئی۔ اسے لگا اس کے ارد گرد پواریں اونچی ہوتی جا رہی ہیں۔
اس کا دم گھٹ رہا ہے، گھٹتا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد نقاہت کے سبب اسے نیند ہی آئی۔

ایک فون کی بیل ہوئی۔ وہ ٹھیک گئی۔ کہیں ہادی ہی کی کال نہ ہو۔ اس نے سکرین دیکھی اور اطمینان کی
سانس لی۔ یہ اس کی سسرال کی ملازمہ شریفان کا فون تھا۔

”ہیلو وہ ڈی باجی! میں شریفان بول رہی آں۔“

”ہاں شریفان! کیا حال چال ہے تیرا؟“ حجاب نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں باجی! تہی سناؤ، کی کر رہے ہو؟“

مٹی۔ ہادی پولیس آفیسر ہاشم امیرک کے پاس سے گزر رہا تھا اس نے قدم اٹھانے کے پاس پہنچ گیا۔
"ہیلو... اسلام علیکم۔" ہادی نے اس کے پاس جھک کر کہا۔

اس نے ہادی کو دیکھا اور اس کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ جلدی سے منہ جھک کر بولا۔ "وہیکل سلام۔"
"آپ پاکستانی ہیں؟" ہادی نے پوچھا۔

"نہیں۔ لیکن اردو بول سکتا ہوں۔ آپ فرمائیں کیا بات ہے؟"

"یہاں زبان کا بہت مسئلہ ہے۔ ہم زبان سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ میرا نام ہادی ہے۔ میں یہاں کمرہ نمبر 118 میں ٹھہرا ہوں۔ ویسے آپ اٹالوی پڑھ لیتے ہیں؟"

"کافی حد تک..... آپ فرمائیے۔"

"میرے کمرے میں دیوار پر روم کا ایک نقشہ لگا ہے لیکن جگہوں اور راستوں کے نام وغیرہ اٹالوی میں ہیں۔ کیا آپ اس کو سمجھتے ہیں میری مدد کر سکتے ہیں؟"

وہ جیت چند لمحوں کے لیے تذبذب میں رہا۔ پھر بولا۔ "جلیے..... میں دیکھ لیتا ہوں۔"

دونوں الٹی سے اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ ہادی نے دروازہ بند کر دیا لیکن لاک نہیں کیا۔ دیوار پر قریباً تین فٹ مربع چارٹ کا ایک اسٹائلش نقشہ موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ شخص مسکرانے لگا۔ "جی ہاں یہ نقشہ تو اٹالوی میں ہے لیکن اس کو نقش اور عربی وغیرہ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ دیکھیے۔"

اس نے نقشے کو ہاتھ لے کر حرکت دی وہ سلائیڈ کر کے ایک طرف چلا گیا۔ اس کے نیچے ویسایا ایک دوسرا نقشہ موجود تھا۔ یہ نقشہ میں تھا۔ "لاہور کی بات ہے۔" ہادی نے ہونٹ سکڑے۔

وہ صرف اداکاری کر رہا تھا۔ درختوں سے بھی معلوم تھا کہ نقشے کے نیچے دو تین اور نقشے بھی موجود ہیں۔

"کہاں کھانا چاہتے ہیں آپ؟" کو جیوان شخص نے قدرے باریک آواز میں پوچھا۔ مضبوط جسم کے مقابلے میں وہ نرم و پیار کا لگاؤ تھا۔

"روم نمبر 118۔" ہادی نے جواب دیا۔

وہ دونوں نقشے پر جھٹک گئے۔ وہ شخص ہادی کو انگلی کی مدد سے بتانے لگا کہ فلاں رستہ کہاں سے نکلتا ہے اور کدھر کوجاتا ہے۔ اسے ضرورتیں یا کچھ کہاں سے بآسانی مل سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے ہادی اس کے بائیں قریب آ گیا تھا۔ ہادی نے جان بوجھ کر اپنی بائیں کہنی کو اس کے جسم سے قریب تر کر دیا اور یوں اس کا شک لیٹن میں بدل گیا اس کی کہنی اس کا مقول شخص کی بیلٹ سے بچ ہوئی۔ یہاں ہادی کو کسی ابھری ہوئی سخت چیز کا احساس ہوا۔ یہ شخص بائیں یار یو لور وغیرہ کا دستہ ہی تھا۔ ہادی کے جسم میں دولتی ہوئی سنسنی بہت کچھ اور بڑھ گئی۔

اب وہ ہادی کو اندرونی گلیوں کے کچھ شارٹ کٹس بتا رہا تھا۔ وہ اس شہر کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ ہادی نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتائیں کہ اگر کوئی بندہ یہاں میٹرو کے اس اسٹیشن سے آپ

کا نمبر پوچھ لیا۔

"ہیلو کون؟" دوسری طرف سے ہادی کی شائستہ آواز ابھری۔

"حجاب بول رہی ہوں۔"

"جی جی بولیں۔ کب سے آپ کے بولنے کا شکر تھا۔"

"تو کیا پروگرام ہے کل کا؟"

"وہی جو آپ نے کہا تھا۔ ٹھیک دس بجے ہوٹل کی لابی میں۔ اگر اس میں کوئی ردوبدل ہوا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"

"ردوبدل کا امکان بھی ہے؟" ہادی نے کہا اور ہونٹ آہستہ سے دانتوں تلے دبایا۔

"نہیں..... ویسے ہی بات کر رہا تھا۔" ہادی نے گھبرا کر کہا۔

وہ مسکرائی۔ "اگر ردوبدل کا امکان ہے تو میں بھی شائینگ وغیرہ کی شکل میں کوئی سیکنڈ آپشن رکھ لوں گا۔"

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ میں کانوں کو ہاتھ لگا تا ہوں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

وہ ہنسنے لگی چند لمحوں کے بعد یہ ٹیلیفونک گفتگو اختتام پذیر ہو گئی۔

○.....○.....○

حجاب کے فون کے بعد ہادی بے چینی سے ہوٹل کے کمرے میں چلی گئی۔ پروگرام کے مطابق حجاب کو کل رات

سوا دس بجے آنا تھا اور یہاں صورت حال یہ تھی کہ وہ مخصوص شخص ابھی تک ہادی کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔

سیکنڈ فلوئر کی لابی میں موجود تھا اور صوفے پر آرام سے بیٹھا۔ سپر کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ کون تھا؟ کیا چاہ رہا تھا؟

ہادی کے ذہن میں ان گنت سوال منڈلا رہے تھے۔ ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے ہادی نے لاہور میں اپنے پروگرام پر

شیخو صاحب سے بات کی تھی اور صورت حال سے تھوڑا بہت آگاہ کیا تھا۔ شیخو صاحب نے تین نمبر لکھوائے تھے۔

ان میں سے ایک نمبر بڑا کارآمد تھا۔ یہ نمبر ایک ایسے پاکستانی نژاد اٹالوی کا تھا جو روم کی پولیس میں حاضر سرکاری

ڈپٹی انسپکٹر تھا۔ اس کا نام شیخو صاحب نے ہاشم امیرک بتایا تھا۔ امیرک کی سمجھ تو ہادی کو نہیں آتی تھی لیکن ہاشم کی اچھی

طرح آتی تھی۔ اب یہ ہاشم امیرک تھوڑی دیر میں ہوٹل پہنچنے والا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ سادہ لباس میں تھا۔

اس نے سرخ شرٹ پہن رکھی تھی ہادی نے بھی اسے اپنے لباس کا رنگ بتا دیا تھا اور سیل نمبر بھی دے دیا تھا۔

پروگرام کے مطابق ٹھیک پانچ بجے ہادی اٹھا اور ٹھہلا ہوا لابی میں پہنچ گیا۔ ایل سی ڈی پر ایک روناٹک کا میڈیا

فلم چل رہی تھی۔ آٹھ دس مرد و زن محو تماشا تھے۔ ان میں ہی وہ دھاری دار شرٹ والا تھا جس نے بھی تھا لیکن وہ فلم

دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

ہادی نے دیکھا گہری سرخ شرٹ والا دروازہ قد پولیس آفیسر لابی میں پہنچ چکا تھا اور اب سگریٹ سلک کر رہی تھی

دیکھنے میں مصروف تھا۔ دو لمبے کے لیے اس کے ساتھ ہادی کی نگاہیں ٹپیں اور آنکھوں آنکھوں میں ملیک

و شخص کرسی پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ہاشم اور ہادی کو دیکھنے لگا۔ ہاشم نے اس کی جیبوں سے نشے والی اشیاء دیکھیں۔ ان میں اس شخص کا کوئی شناختی کاغذ موجود نہیں تھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" ہاشم نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"گزارار... گزار احمد۔"

"یہ کرتے ہو؟"

"ذوق یونیورسٹی سے اکاؤنٹنگ کورس کیا ہے۔ اب چاہ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"رہائش کہاں ہے؟"

اس گزارار کی شخص نے اپنا انڈریس آفیسر کو لکھوا دیا۔

"مسٹر ہادی کا پچھا کیوں کر رہے ہو مسلسل؟" ہاشم نے پولیس والوں کے انداز میں اچانک سوال کیا۔

اس کا رنگ ہلکا اور پیکا پڑ گیا۔ "نہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم مسٹر ہادی کا پچھا کیوں کر رہے ہو پچھلے دو دن سے؟ یہ جہاں جاتے ہیں تم ان کے ساتھ جاتے ہو؟"

"گزارار! یہ تو میرے لیے حیران کن بات ہے۔ یہ ایک اتفاق ہی ہوگا۔"

"اگر تم نے اس شخص کو دیکھا ہے تو یہ بھی اتفاق ہی ہوگا۔ اور پھر میں اتفاقاً ہی تمہیں تھانے لے جا کر اتفاقاً تمہیں آزادی دے دوں گا۔ دیکھو مسٹر گزارار! تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ جو کچھ بھی ہے صاف صاف بتا دو۔ فرض حال تمہارے خلاف کیا کارروائی ہو چکی ہے؟" ہاشم نے اس کے لیے کافی ہے۔

"میں قسم کھاتا ہوں کہ..."

ابھی اس کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ہاشم کا ایک اور ڈھونڈ دار تھم گزار کے منہ پر پڑا۔ وہ کرسی سمیت اٹھتے اٹھتے ہادی کے پاس آئے۔ اس کے بال منہ میں جکڑے اور دانستہ چس کر کہا۔ "آسانی سے نہیں بتاؤ گے تو سخت مشکل میں پڑو گے۔ تمہارا اسٹے خلاف شہرت ہے۔"

پچھتاہی میں گزارار کی وحاری دار شرٹ کندھے پر سے پھٹ گئی تھی۔ وہاں ایک عورت کا ناز یا نیوٹا ہوا تھا۔ لہجے انگریزی میں ایک فقرہ لکھا تھا۔ مجھے ایک اچھا بستر اور ایک اچھی عورت دے دو۔ اس کے بعد مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ (یہ دراصل ایک یورپی دانشور کے منقولہ قول کی نقل تھی۔ اس نے کہا تھا۔ مجھے ایک اچھا بستر اور ایک اچھی کتاب دے دو اس کے بعد مجھے کچھ نہیں چاہیے۔)

گزارار بکا یا۔ "م... میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہوں گا۔"

"نہیں پھر اس سے پہلے تمہارے خلاف ایف آئی اور ریج ہو چکی ہے۔ ہاشم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ ذرا ڈھکیا پڑ گیا۔ ہاشم نے اس کی جیب میں سے تھکے والی چوڑی کی جاکٹ شروع کی۔ اس کے پرس میں سے 270 روپے نکلتے۔ کچھ رسیدیں تھیں۔ ایک نیم عریاں اطالوی سینہ کی تصویر تھی۔ ایک رسید سے اندازہ ہوا کہ اس

کے پیچھے لگ جاتا ہے اور آپ اس سے بچ کر یہاں اس معاملہ تک جانا چاہتے ہیں تو آپ کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

اس نے ذرا چونک کر ہادی کو دیکھا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

ہادی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ دوم ہے۔ یہاں ہر طرح کے نمے بھلے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی کسی غلط نیت سے آپ کے پیچھے لگ جائے تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ اب ہادی کے لب و لہجے سے ٹھنک گیا تھا۔ ذرا سنبھل کر بولا۔ "کیوں جناب! کہیں آپ کو کوئی نہ اتھر چکا ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لیجیے۔" ہادی نے کہا۔ اس دوران میں وہ چپکے سے اپنے سیل فون کا جین پش کر چکا تھا۔ اس جین کے پش ہوتے ہی ڈپٹی ہاشم ایک کو کال بھیجی گئی تھی۔ یہ کال اس بات کا اشارہ تھی کہ اب وہ ہادی کو کال کر کے کے اندر آ جائے۔ بمشکل آٹھ دس سیکنڈ بعد لہجہ چڑا ہاشم انہماک کرے کے اندر تھا۔ اس نے دروازہ اندر کھولا دیا اور سوالیہ نظروں سے ہادی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ نہیں لب لری طرح ٹھنکا ہوا تھا۔ اسے گڑ بڑ کا احساس ہوا۔ یا بس ہونے ہی والا تھا۔ ہادی نے جبکہ اس کے پستول نما گولیوں کے اوپر سے ہی دبوچ لیا۔ ہاشم بھی لپکے چند سیکنڈ بعد یہ ہتھیار اس شخص کی شرٹ کے نیچے سے نکل کر ہاشم کے چوڑے چپکے ہاتھ میں پھنسی چکا تھا۔ یہ چھوٹے سائز کا ایک بریٹا پستول تھا۔ ہاشم نے دھکا دے کر اس شخص کو صوفے پر گرادیا۔

"کون ہو تم؟ ایسا کیوں کر رہے ہو؟" نوجوان شخص لرزاں آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا آجڑا پن تھا۔

ہاشم نے اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ "پولیس ڈپٹی انسپکٹر ہاشم ایک" اس نے کہا۔ اس شخص کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ دو سیکنڈ کے لیے لکا کہ وہ انہماک کر بھاگنے کی کوشش کرے گا مگر پھر جہاں تھاں پڑا رہ گیا۔ "کھڑے ہو جاؤ اور دیوار کی طرف منہ کرو۔" ہاشم انگلی میں پھنکار کر بولا۔ "میرا جرم کیا ہے؟" وہ ہکلا یا۔

ہاشم کے تھمڑے کی گونج پورے کمرے میں سنائی دی۔ "اٹھو اور دیوار کی طرف منہ کرو۔" ہاشم نے سرسراہی آواز میں کہا۔

اس شخص کے دونوں سے اب خون رس رہا تھا۔ چارو چاروہ اٹھا اور اس نے منہ پھیر کر دونوں ہاتھ دلوایا۔ ایک دینے۔ ہاشم نے اچھی طرح اس کی تلاشی لی اور اس کی جیبوں میں موجود ساری اشیاء نکال کر میز پر ڈھیر کر دیں۔ ان میں سیل فون اور پرس وغیرہ بھی شامل تھے۔ "چلو اب سامنے اس کرسی پر بیٹھو۔" ہاشم نے حکم سے کہا۔

وہ نشوونما سے اپنے ہونٹ کا خون پونچھتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کوئی چالاکی دکھائی تو تیری طرح پچھتا تا پڑے گا۔" ہاشم نے کہا۔ "مجھے یقین ہے تمہارے پاس پستول کا لائسنس بھی نہیں ہوگا۔ ہا جاؤ اسلئے کے چارج میں ڈھکیا تین سال کی جیل تو کہیں بھی نہیں گئی تمہارے لیے۔"

اطلاوی کے اصرام میں کیس چل چکا ہے۔ تب یہ کافی ثبوت کی بنا پر صرف بیس دن جیل میں رو کر باہر آ گیا تھا۔ اب پوچھا کیس بن سکتا ہے اس پر لیکن یہ کس اصرام کون ہے؟

”یہی لڑکی سارا چکر چلا رہی ہے۔ یہ میری دوست کو سخت نقصان پہنچانا چاہ رہی ہے اور اس میں اس کا مفاد چھپا ہوا ہے۔“

ہادی نے مختصر الفاظ میں ہاشم ایرک کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ اس کی دوست کا نام حجاب ہے اور وہ صرف شخص دوست کی حیثیت سے ملتے جلتے ہیں۔ حجاب کے بارے میں اس سے پہلے بھی وہ ہاشم کو تھوڑا بہت بتا چکا تھا۔ (شخص صاحب نے بادی کو بتایا تھا کہ ہاشم ایرک پر ہر طرح کا مجرورہ کیا جاسکتا ہے۔)

ہاشم نے گھڑار کے پاس جا کر دونوں کے لیے میں بات کی اور اسے بتایا کہ اسے پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا اور اس کے خلاف تیس رجسٹرڈ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ بہت سخت طریقے سے چھیننے والا ہے۔

گھڑار اب بار بار خشک ہونٹوں پر زبان بھیر رہا تھا۔ وہ ہاشم کی سخت مزاحمت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ شخص خاں کے خوف سے سہاوا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے دس پندرہ منٹ کے اندر اندر ہاشم ایرک نے ہاشم کی شکل خنٹوں پر کر دیا۔ وہ وکیل دلیس والی ساری باتیں بھول کر منت سماجت پر اتر آیا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس کے پاس اس نے نہ نامہ مسل کا لائسنس نہیں ہے اور یہ پہلے اس نے کسی اعلیٰ کیرے سے 300 یورو میں خریدا تھا۔ ہاشم ایرک کے حوالے سے وہ کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس یہی کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی کلاس فوری ہے اور ان کا آپس میں بہن دین چلا رہا ہے۔

بہر حال ہاشم نے اس پر اپنا ہاتھ بڑھا کر رکھا۔ بلکہ اسے بڑھاتا چلا گیا۔ وہ اسے جھکڑی لگا کر پولیس اسٹیشن لے چلا اور ساتھ جھکڑی منگوانے اور اپنے عہدہ کی اہل کار کو بلانے کے لیے اس نے اپنا واک ٹاک ہاتھ میں لیا تو گھڑار نے اس کی برداشت بھی ختم ہو گئی۔ اس نے ڈپٹی انسپکٹر ہاشم کے واک ٹاک پر ہاتھ رکھ دیا اور سخت سماجت کرنے لگا۔

”اس وقت ہادی نے مداخلت کی اور ہاشم سے مخاطب ہو کر کہا۔“ آفسر اگر یہ تعاون کر رہا ہے تو پھر اسے جھکڑی نہ لگائی جائے اور کیا اس کے وکیل سے اس کی بات کرنا بھی ہمارے لیے ممکن ہوگا؟“

ہاشم ایرک نے ہادی کو کھنکھارایا۔ ”مسٹر ہادی! کیا آپ مجھے تسکین کے لیے مجھے اپنا کام کس طرح کرنا چاہیے؟“

”نہیں۔ یہ مطلب تھا کہ اگر۔“

”پلیز مسٹر ہادی! آپ خاموش رہیں۔ یہ بہت سیریس کیس ہو گیا ہے اور جناب! مجھے بھی اپنے بڑوں کو جواب دینا ہے۔“

وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا چلتا تھا کہ وہ یہ سب دکھاوے کے لیے کر رہا ہے اس کا مقصد گھڑار پر دباؤ بڑھانا تھا۔ اگر یہ بندہ پولیس اسٹیشن چلا جائے تو پھر ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہتا اور یہ مطلب حجاب اور اس کے اہل خانہ کی رسوائی کی طرف بڑھتا تھا۔ بادی نے آواز دے کر ہاشم کو روک لیا اور پھر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر دو بار اس سے کمر پھر شروع کر دی۔ کسی حد تک ہادی بھی جان چکا تھا کہ اب گھڑار عرف

نے اپنا انڈریس درست بتایا ہے۔ وہ ایون نیو کے علاقے میں ایک بلڈمک کے پارکمنٹ میں رہائش پذیر تھا۔ جسے چار گھنٹے پہلے اس نے ایک اے ٹی ایم مشین سے کیش اٹھوایا تھا۔ اسے ٹی ایم کی رسید پر اسی کے اکاؤنٹ کی تحصیل درج تھی۔ ہاشم نے اس کا سیل فون چیک کیا۔ اس فون سے آخری تین کالیں گھڑار نے آئی ایم ڈی کی فرو کو کی تھیں۔ آئی ایم کی اور کئی کالیں بھی فون کی کال ہسٹری میں موجود تھیں۔ ”یہ آئی ایم کون ہے؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”میرا دوست ہے اور میں آپ سے پھر گزارش کرتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔“

”اگر یہ غلط فہمی ہے تو ہم اس کو ابھی دور کر لیتے ہیں۔“ ہاشم نے غصے سے لہجہ میں کہا۔

سیل فون پر ایک نمبر پر کال کرنا ہوا ہاشم کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا۔ وہاں ایک کیمت پر بیٹھ کر وہ اطلاوی میں کسی ساتھی افسر سے باتیں کرنے لگا۔ دو چار منٹ بعد اس نے ایک اور نمبر ملایا اور وہاں بھی اطلاوی میں بات کی۔ اس گفتگو میں اس نے گھڑار کے بینک اکاؤنٹ کی تحصیل بھی دوسرے شخص کو بتائی۔ باہر کے ٹکڑی میں کچھ لوگ بارے میں معلومات حاصل کرنے کا انتظام کتنا منظم ہے اور اس تک رسائی کتنی تیزی سے ہوتی ہے اس کا اندازہ لگایا۔ اگلے چند منٹ میں ہوا۔

قریباً دس منٹ بعد ہاشم ایرک اپنے فون کی سکرین پر کچھ تلاش کرنا ہوا۔ ہادی کی طرف آیا اور پھر فون سے نکال کر بٹا کر بولا۔ ”مسٹر ہادی! یہ کس اصرام چودھری کون ہیں؟“

ہادی کے جسم میں سنسنیٹ دوڑ گئی۔ ظہیر کی سالی ارم چودھری کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما۔ ”کیوں کیا بات ہے ہاشم صاحب! بادی نے پوچھا۔“

”یہ جو آئی ایم لکھا ہوا ہے اس سے مراد کس اصرام ہے۔ اس فون سے کس اصرام کے ساتھ بار بار رابطہ کیا جاتا ہے۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ کس اصرام کے اکاؤنٹ سے گاہے بگاہے رقم بھی گھڑار کے اکاؤنٹ کی منتقلی ہو رہی ہے۔ آخری ٹرانزیکشن صرف دو دن پہلے ہوئی ہے۔“

ہادی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ارم ہی وہ لڑکی تھی جو حجاب کے گھر میں تیزی سے اپنا رستہ بنا رہی تھی۔ حجاب اور اس کے شوہر جلال میں دوریاں پیدا کرنے کے حوالے سے ارم کا اہم کردار تھا اور اب ثابت ہو رہا تھا کہ یہی ارم اس گھڑار نامی شخص کے ساتھ مستقل رابطے میں ہے۔ اسے کسی نامعلوم مد میں رقم دے رہی ہے اور یہ گھڑار ہادی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ یا شاید حجاب کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اگر وہ حجاب کے پیچھے لگا ہوا تھا تو یقیناً جان چکا تھا کہ ہادی اور حجاب روم میں اکٹھے گھوم پھر رہے ہیں۔ یہ خطرناک صورت حال تھی۔ حجاب جو پہلے ہی مشکلات کا شکار تھی شدید ترین مشکلات میں پھنس سکتی تھی۔ بادی کی تھیلیوں پر پینڈ آ گیا۔ وہ ہاشم کو ایک طرف گوشے میں لے گیا اور سرگوشیوں میں اس سے بات کرنے لگا۔ اس نے ہاشم کو بتایا کہ اس بندے سے کچھ نہ کچھ اٹھانا ضروری ہے۔ ورنہ اس کی دوست کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں ان دونوں نے اپنی نگاہ گھڑار کی طرف ہی رکھی تھی کہ وہ کہیں کوئی چالاک نہ دکھ جائے۔

ہاشم نے کہا۔ ”آپ گھبرا ئیں مت یہ ضرور کیے گا۔ میں نے اس کا ریکارڈ ڈھونڈ لیا ہے۔ اس پر پہلے ہی ناجائز

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

"دیکھو میں تم سے بچ بولنے کی توقع کر رہا ہوں۔ کیونکہ تمہارا جی ہی ہمارے تعلق کو آگے بڑھائے گا۔ جموٹ بولو۔ تو وہ چپا نہیں رہے گا اور تم اس مصیبت سے نکل نہیں سکو گے۔ میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب تک تم ارم چودھری کو کیا تاچکے ہو؟"

"اس بار سے میں؟"

"میرے اور حجاب کے بارے میں۔" ہادی نے صاف سیہھے الفاظ میں کہا۔

وڈرنگ کا گھونٹ لے کر بولا۔ "ابھی تک تو کچھ نہیں کیونکہ ابھی مجھے آپ کے پورے کوائف نہیں ملے تھے۔ لیکن آج رات کسی وقت میں نے اسے فون کرنا تھا۔"

ہادی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اسے اندازہ ہوا کہ اس بار گھزار شاید بچ بول رہا ہے۔ اس نے گھزار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کوائف سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

وڈرنگ بولا۔ "آپ کا نام تو مجھے معلوم ہو گیا تھا اور یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ آپ پاکستانی ہیں لیکن مجھے مزید تفصیل چاہیے تھی۔ لیکن اب جب کہ جس طرح آپ نے لابی میں آکر مجھ سے بات کی۔ میں بھی کوئی ایسی ہی کوشش کرتا۔"

ہادی نے اس سے دو چار سوالات مزید کیے اور اسے اندازہ ہوا کہ ابھی تک گھزار نے واقعی ارم کو اپنی کارکردگی سے آگاہ نہیں کیا۔ یہ خوش آئند تھا۔ گھزاری سے سووے بازی ہو سکتی تھی۔ اور ہادی سووے بازی کی بہترین پوزیشن میں تھی۔ گھزار ابھی طرح جانتا تھا کہ ڈینی ہاشم ایرک کمرے سے باہر موجود ہے اور ہادی کے ایک اشارے پر دوبارہ کمرے میں آجائے گا۔ اس کے بعد وہی جھگڑا ہٹ اور پولیس کار کا پکڑنا خطرناک ہے۔

ایک جیس پیس محنت میں ہادی اور گھزار کے درمیان کافی کچھ طے ہو گیا۔ گھزار نے ہادی کو یقین دلایا کہ وہ حجاب اور ہادی کے میل ملاقات کے مسئلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھے گا۔ دوسری طرف ہادی نے گھزار کو گارنٹی دی کہ ڈینی ہاشم اس کی جان چھوڑ کر چلا جائے گا اور ڈینی کا وعدہ ڈانی کو نہیں پر روک دے گا۔ اس کے علاوہ ہادی نے گھزار کو یقین دلایا کہ ارم کو یہاں اس ہوش والے واقعے کے بارے میں اور یہاں ہونے والی ذیل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ گھزار اپنا ہسپتال واپس حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن جب ہادی نے فون پر ہاشم سے رابطہ کیا تو اس نے سختی سے کہا۔ "گھزار کو ہسپتال کے حوالے سے کڑوا گھونٹ بھرنا پڑا۔"

ہادی اب تک یہ بات بڑی اچھی طرح جان چکا تھا کہ گھزار ہر لحاظ سے ایک حریف اور مطلب پرست شخص ہے۔ کرائے کا ایک ایسا نوجوان جو رقم کے عوض ہاشم کے پیچھے بھی ڈم بلا سکتا ہے۔ یقیناً وہ ایک عورت باز شخص تھا اور اپنی دلچسپ ضرورت بات کے لیے اسے دافتر میں ہی ضرورت رہتی تھی۔ ہادی نے اس کی اس ذہنی رگ پر بھی ہاتھ رکھا۔ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "گھزاری! میں یاد رکھتا ہوں۔ وہی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو فائدہ سے میں رہو گے۔"

دوسری ہونی آواز میں بولا۔ "ابھی تک تو نقصان ہی اٹھ رہا ہے ہادی صاحب۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! اگر ہسپتال نہیں تو وہ میرا فون اور کیش ہی ہاشم صاحب سے واپس لے دیں۔" وہ اپنے ان 270 یورو کی

گھزاری بے طرح پھنس چکا ہے اور اسے چند سال کی جیل آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی ہے۔ اس موقع پر اس نے گھزار کی جاکتی تھی۔ اب اس سے کوئی ایسا خطرہ بھی نہیں تھا اس کی مکمل تلاشی ہو چکی تھی اور اس کا ناجائز حاصل ہارنے کے قبضے میں تھا۔

ہادی نے یہی تاثر دیا جیسے اس نے سمجھا بھرا کسی طرح ہاشم کو قوی طور پر کمرے سے باہر بھیج دیا ہے۔

گھزار کے ہونٹ سے گاہے بگاہے خون رسنے لگا تھا۔ ہادی نے اسے جراثیم کش نشوونو دیا تاکہ وہ ہونٹ پر نہ لپکے۔ ایک کولڈ ڈرنک کھول کر اس کے پاس شیشے کی پیالی پر رکھا اور اس سے قدرے نرم لہجے میں ہاتھیں کھینچنے لگا۔

اس نے گھزار کو یاد کر لیا کہ وہ بڑی طرح گھر چکا ہے لیکن اگر وہ تعاون کرے تو ہاشم ایرک کو سخت ایکشن سے روکا جاسکتا ہے۔

اس نے گھزار سے کہا۔ "دیکھو نونے فیصلہ معلوم تو تمہارے بتائے بغیر ہی ہمیں مل بھی گیا ہاں باقی ہمارے دے دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس میں قانونی کارروائی والی مصیبت سے بچاؤں گا بلکہ ہوسکتا ہے کہ درمیان کوئی ایسا لٹک بھی بن جائے جس سے تم مالی فائدہ حاصل کر سکو۔"

"دیکھیں میرے پاس بتانے کو زیادہ کچھ نہیں ہے اور اگر میں آپ کو بتاتا بھی ہوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ مکر نہیں جائیں گے اور ڈینی کو منالیں گے؟" وہ دونوں اردو میں بات کر رہے تھے۔

ہادی نے ذرا روکھے لہجے میں کہا۔ "تمہارے پاس سووے بازی کے لیے کچھ نہیں ہے گھزار! میں بس تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں کہ ارم چودھری نے جمال کی وائف حجاب کو مشکل میں ڈالنے کے لیے تمہیں اس کے پیچھے رکھا ہے اور تم اس کے کہے پر عمل کر رہے ہو۔"

گھزار کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے گورے چہرے پر تذبذب کے گہرے سائے تھے یعنی ہولی ٹھوس سے بیہودہ ٹیو کا کچھ حصہ جھانک رہا تھا۔ آخر طویل سانس لے کر بولا۔ "تجربہ ایسا ہوا ہے لیکن مجھے کسی اندیشہ کہانی کا پتا نہیں۔ ارم نے بس اتنا کہا تھا کہ حجاب اس کی فیملی میرے اور میں اس کے آنے جانے پر ذرا متحرک نہ ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید سبز حجاب کو کسی کی طرف سے کوئی خطرہ ہے جس کی وجہ سے ارم یہ بات مجھ سے کر رہی ہے اور دیکھیں یہ بات بھی غلط ہے کہ میں ارم سے رقم لے کر یہ کام کر رہا ہوں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے اور میں۔"

گھزار کی آنکھوں میں عیاری تھی۔ اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا اور ہادی کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ آدھا بول رہا ہے بلکہ شاید چوتھائی سچ۔ وہ حجاب کو پھنسانے میں ارم کا ساتھ بنا ہوا تھا اور کرائے کے کارندے والا کو روک کر رہا تھا۔ بہر حال ہادی اس حوالے سے گھزار کے ساتھ کسی لفظی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا اولین مقصد یہی تھا کہ گھزار اپنا منہ بند رکھے اور حجاب کے خلاف کوئی ایسی ویسی بات ارم کے کانوں تک نہ پہنچائے۔ اس نے صاف ڈرنک کے دو گلاس بھرے ایک گھزار عرف گھزاری کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے

بات کر رہا تھا جو جانشی کے دوران میں شہادت اور ثبوت کے طور پر ذہنی ہاشم کے پاس گئے تھے۔

بادی نے کہا۔ ”موبائل فون تمہیں واپس کر دیتا ہوں لیکن ان 270 یوروں پر خاک ڈالو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر چند ٹریڈر چپک نکالے اور ان پر سناں کر کے گھڑا کے حوالے کر دیئے۔ اس نے ٹریڈر ہنگس دیکھے اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ تقریباً 1500 یورو کے تھے۔

”لیکن بادی صاحب“

”لیکن کچھ نہیں یاد رکھو! میں ملے رہو گے تو جیب فل گرم ہو جائے گی تمہاری۔“

گھڑا کے چہرے پر تشکر کے جذبات ابھرے لیکن اس تشکر میں ایک طرح کا کینہ بھی شامل تھا۔ اس نے بس تھوڑا سا تذبذب دکھانے کے بعد ہنگس اپنی جیب میں رکھ لیے۔ ان کے درمیان فون ٹریڈر کا حوالہ ہو گیا۔ بادی نے اسے بتایا کہ وہ اس ہونٹ میں حریفانہ انداز میں دس دن قیام کا ارادہ رکھتا ہے۔

بھاری رقم نے گھڑا کی پولیٹیکل بند کر دی تھی۔ وہ بادی کی باتوں کے جواب میں بس جی جی کہتا جا رہا تھا۔

مرحوبہ نظر آ رہا تھا۔ اس ملاقات کا اختتام بادی کی مرضی کے مطابق ہوا۔

.....

ارم بہت بے چین ہو رہی تھی۔ وعدے کے مطابق آج رات گھڑا اسے بہت خاص اطلاع دینے والا تھا۔ اس نے پرسوں بتایا تھا کہ حجاب ہونٹ واسکوڈے میں گئی تھی اور کافی دیر وہاں رہی تھی۔ پھر کل بھی گھڑا کی مختصر سی کال آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کارروائی خاصی آگے بڑھی ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے میں تفصیل اطلاع دے گا۔ اس کی قوت از میں دبا دبا جوش تھا۔ وہ بڑا لالچی تھا۔ اگر واقعی کوئی اہم اطلاع تھی تو اس نے اطلاع سے پہلے اپنی تنگ دستی کا رونا دھونا بھی بہر حال کوئی اچھی اطلاع ارم کے لیے نعمت غیر مرتبہ ثابت ہو سکتی تھی۔ شام ہی سے ارم بہت اکیسا بندھ تھی وہ پہلے گھڑا پر جلال کے ساتھ والے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی۔ ایسا کمرے کے اگے گونا گوں اطمینان ہوا تھا۔ اس اطمینان میں کسی حد تک جیت کا احساس بھی شامل تھا۔ اسے پتا تھا کہ حجاب کو جب اس صورت حال کا علم ہوا ہو گا تو اس کو شدید کڑھن ہوئی ہوگی۔ یہی کڑھن ارم کے اطمینان کا باعث تھی۔ اب یہ اطمینان ایک پائیدار خوشی میں ڈھل سکتا تھا۔ اگر گھڑا واقعی واقعی اچھی خبر سنا دیتا تو۔

گھڑا کا فون دس بجے کے لگ بھگ آیا۔ ارم ڈنر سے فارغ ہوئی ہی تھی۔ جلال کو آج کافی دیر سے لونا تھا۔ وہ فون سنتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

”ہیلو سسٹر! کیا حال ہے؟“ گھڑا کی آواز سنائی دی۔ ارم کو فوراً محسوس ہوا کہ اس کی آواز میں کوئی خاص

ترجمہ نہیں ہے۔

”میں ٹھیک ہوں گھڑا! کیا تھوڑے تھوڑے پاس؟ کافی انتظار کے بعد فون آیا ہے تمہارا؟“

”تھوڑے تو کوئی... بہت خاص نہیں سسٹر! لیکن جلد ہی کوئی نہ کوئی ملے گی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم تو کل بڑے جوش میں تھے۔ کیا پتا چلا حجاب کا؟“

گھڑا نے ایک لمبی سانس لی۔ ”وہ میں نے پوری معلومات لے لی ہیں۔ دراصل حجاب صاحبہ کی ایک پرانی منیجر جو پاکستان چلی گئی تھی سیر سپانے کے لیے روم آئی ہوئی ہے۔ ساتھ میں اس کا میاں اور دو بچے بھی ہیں۔ ہونٹ واسکوڈے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ حجاب پرسوں ان سے ہی ملنے گئی تھی۔ کل انہوں نے ٹیکسی پر تھوڑی سی سیر بھی کی ہے۔ میرے خیال میں کل تک وہ لوگ واپس چلے جائیں گے۔“

ارم نے مایوسی سے کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ عجیب واپس بات ہوئی۔ وہ کیا کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکالا جو؟ یا پھر تم چالاکي کھا رہے ہو۔ مجھ سے یورو اٹھانے کے لیے تم نے خواہ مخواہ سسٹمز کھڑا کیا۔“

”تمہارے سر کی قسم سسٹر! غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہی تمہیں بتایا تھا۔ جمعرات کے دن حجاب کوئی ذیادہ گھنٹہ ہونٹ کے کمرے میں رہی۔ اس وقت پتا نہ چلا کہ کمرہ کون سا ہے۔“

”اور تم اتنے بڑے کہنے ہو کہ خبر پوری ہونے سے پہلے ہی آدھے پیسے وصول کر لیے۔ تم کسی کام کے نہیں ہو گھڑا! خواہ مخواہ میرا وقت برباد کرتے ہو۔ اب دھیان سے سن لو۔ جب تک کوئی کام کی خبر نہ ہو میرے کان مت

کھنکھنا۔ کوئی ضرورت نہیں فون کرنے کی۔“

”لیکن سسٹر۔“

”جانتے ہو؟“ ارم نے کہا اور فون بند کر کے بستر پر پھینک دیا۔ یہی وقت تھا جب جلال کی والدہ آپا خانم اندر داخل ہوئیں۔ وہ چوبیس ڈیل ڈول کی قمیص ان کا چہرہ لال بھسکا ہو رہا تھا اور وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ ”خبیث کو اب زبان چلا نا بھی آگئی ہے۔ پتا نہیں کہ بڑوں سے کس طرح بات کرتے ہیں۔ بچا کہیں کی۔“

”کیا ہوا آپا خانم! اس کی بات کر رہی ہیں؟“ ارم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ابھی حجاب کا فون آیا تھا کہ کمرہ کون سا ہے کہ یہ کمرہ کیوں لیا ہے ارم نے کیا اتنے بڑے گھر میں کوئی اور کمرہ ہی نہیں تھا۔ مجھے اصرار دے رہی تھی کہ میں نے تمہیں یہ کمرہ دیا ہے میں نے بھی کھری کھری سنائی ہیں۔ بدلتا کہیں کی

آپا خانم غصے سے کانپ رہی تھیں۔ ارم نے جلدی سے انہیں پانی پیش کیا۔ ”لیس یہ پانی پیئیں۔ کول ڈاؤن ہو جائیں۔ آپ کا پی پی پیلے ہی آپ سیٹ ہے۔“

آپا خانم نے پانی پی لیا۔ پھر ذرا ٹھہری ہوئی آواز میں بولیں۔ ”میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ وہ باغیچے کی طرف والا کمرہ لے لو۔ بڑا اچھی ہے۔ تم مجھ اپنی بات پراڑی رہیں۔“

ارم نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ”آپا خانم! آپ اس طرح کیوں سوچ رہی ہیں۔ آپ مالکین ہیں اس گھر کی۔ آپ کا اختیار ہے اسے شرم آتی چاہیے کہ اتنی ہی بات کا جتنگر ہمارا ہے۔“

”اس کی جرأت بڑھتی جا رہی ہے۔ ابھی جلال آگیا ہے تو بات کرتی ہوں اس سے۔“ آپا خانم نے کہا۔

وہ بڑی چٹکیلی منہ تھی۔ چٹکیلی اور خوشگوار۔ روم اپنی تمام تر شان و شوکت اور تاریخی و بدبے کے ساتھ مدینہ کا

تک بادی کی نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا بادی ہوٹل کے دسویں فلور کی ایک بالکنی میں کھڑا تھا۔ وہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حجاب کا انتظار بھی کر رہا تھا۔

ایک جادو سا ہو گیا تھا اس پر وہیں کی وہ پہلی رات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکی تھی۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود اس لڑکی کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بادی کے لیے صرف دوستانہ جذبات رکھتی ہے۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے سراسر آگ سے کھینے کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود وہ خود کو اس بے سمت سفر سے روک نہیں پا رہا تھا۔ بس مسکراہٹ میں اپنے سفید موتیوں کی بے مثال نگاہوں کی آنکھوں میں چمکتی رہتی تھی اور ایک حسین پوشاکی جس پر چاند اور سورج اپنا نقش دکھاتے تھے اس نے ایک آہ بھری اور سوچنے لگا۔

کیا واقعی وہ محبت میں گرفتار ہو چکا ہے؟ اس کا جواب اشیاات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ غور کرتے رہا۔ یہ محبت بھی کیا چیز ہے۔ اپنے لیے مشکل ترین راستے ڈھونڈتی ہے۔ مستحکم کی مستحکم اور نا کامیابی اپنی آنکھوں کے سامنے صاف صاف دکھاتی ہے لیکن پھر بھی انسان کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ نئی دیواریں اور بند کھیاں اسے روک نہیں سکتیں۔ بادی کو آج تک محبت نہیں ہوئی تھی اور جب ہوئی تھی تو کہاں ہو گئی تھی۔ اسے اس بے ڈھنگے پن پر رونا آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔

بادی عام شاعروں کی طرح زرا پر اشاعرہ نہیں تھا۔ وہ ایک مضبوط شخص تھا۔ دنیا میں رہنا اور اس کی مشکلات سے عہدہ بردار ہونا جانتا تھا۔ کل شام اس نے بڑی ہمت سے حجاب کے راستے کا ایک کاغذ صاف کر دیا تھا۔ اس کا نئے کاغذ کاغذ تھا۔ وہ مزید کاغذ صاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ لیکن یہ پتا بھی تو چلا کہ مستقبل میں حجاب کے ارادے کیا تھے۔ وہ اس معاملے کو کہاں تک لے جانا چاہتی تھی۔ یا کہاں تک لے جاسکتی تھی۔

بادی صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے طور پر جو کچھ سوچ رہا ہے اور کر رہا ہے وہ غلط ہے۔ وہ میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے ایک تنازعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے ماحول کی شدید محنت کے نتیجے میں ایک لڑکی کے اندر مزاحمت کی ایک چنگاری پیدا ہوئی تھی۔ بادی اس چنگاری کی روشنی میں اپنا راستہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ کیا ایسا کرنا مناسب تھا یا پھر بادی کو کچھ اور کرنا چاہیے تھا۔ حجاب کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی کہ وہ اس چنگاری کو شعلہ نہ بنے دے۔ اپنے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرے۔

وہ مسکریٹ چھوٹکارا باور بیچے ہوئے کے پارکنگ لاٹ کی طرف دیکھتا رہا جہاں کے دائیں کنارے سے حجاب کو نمودار ہونا تھا۔ وہ وقت کی پابند تھی۔ آج بھی اس نے یہی ثابت کیا۔ بادی کے سینے میں خوشنود و حزنیں جاگ اٹھیں۔ وہ آ رہی تھی۔ دلکش چال، متوازن قدم جیسے کسی ساحل کی ہوا بڑے ہموار طریقے سے بہہ رہی ہو۔ وہ پہلے کی طرح براؤن چادر میں لپٹی لپٹائی ہوئی تھی۔ نقاب میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اس چادر میں خود کو محفوظ رکھتی تھی۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ اس کے گرد سازش کا ایک جال موجود ہے۔

بادی پہلے سے تیار تھا۔ وہ لپٹ سے نیچے آیا۔ دونوں ابلی میں ملے اور پھر مین روڈ کی طرف بڑھ گئے۔ "بس

جنگ آخری دن ہے۔" وہ بولی۔ "جی بھر کر گھوم پھر لیجیے۔"

"آپ شروع میں ہی مزہ کر کر رہی ہیں۔ کچھ اچھی اچھی باتیں بولیں۔" بادی نے کہا۔

"یہ اچھی بات ہی تو ہے کہ ہم آج سارا دن ساتھ رہیں گے۔"

"لیکن آپ یہ بھی تو کہہ رہی ہیں کہ پھر نہیں آئیں گی۔"

"آپ گلاس کو آدھا خالی کیوں کہہ رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہہ رہے کہ آدھا بھرا ہوا ہے۔"

"نہیں میں اس کو پورا بھرا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں اپنی اس گائیکہ کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا دیجیے گا۔"

"نہیں کریں ایسا کچھ نہیں ہوگا اور آپ گائیکہ نہیں ہیں۔ ہر ایسی ہیں۔ بہت بہتر اور مہربان ہر ایسی میں آپ کو

پارہ بھول نہیں پاؤں گا۔"

"میں بھی آپ کو یاد رکھوں گی۔ آپ کے ساتھ کچھ بہت اچھا وقت گزرا ہے۔"

"نہیں نہیں ہے۔ گزر رہا ہے۔ آپ الفاظ کے ہیر پھیر سے مجھے یہ نہ سمجھائیں کہ آج آخری ملاقات ہے۔"

وہ ہنستے تھے۔ وہ ہنسنے میں بیٹھے۔ بادی کی نگاہیں بار بار اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آج پھر کوئی ان کے پیچھے تو نہیں ہے۔ دونوں عظیم الشان تاریخی درختوں کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ آثار قدیمہ میں حجاب کو گہری دلچسپی تھی۔ وہ جیسے ان میں کھوی جاتی تھی۔ یہ بھی ان کے اندر کی لطیف شخصیت اور اس کے سینے میں چھپی رومانیت کی طرف اشارہ تھا۔ وہ بیچم میں چلتے کوئیسیم کے کٹ گھر کی طرف بڑھے۔ حجاب کے ساتھ ساتھ وہ چاند بادی کو اچھا لگتا تھا۔ گائیکہ کے شانہ حجاب کے شانے سے بھر جاتا تھا، یا پھر اسے حجاب کا بازو لپٹنے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہ مختصر سے لمس اس کے جسم میں ایک ایسی سنسناہٹ جگاتے تھے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

کوئیسیم سے باہر مقامی آرائشوں نے زمانہ قدیم کے لشکریوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ انہوں نے آہنی خود اور زرد بکتر وغیرہ پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں میں نیزے، ڈھالیں اور تلواریں تھیں۔ سیاح ان قدیم جنگجوؤں کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے۔ اس اسٹیج پر جتنی اگھاڑے کو دنیا کے سات عجوبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی ہیر دنی و ہمار کا جو حصہ تاریخی صدیوں کے لوگوں سے ملتا ہے وہ پکا تھا لیکن جو باقی تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ یقیناً حجاب پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکی ہوگی لیکن وہ اتنی ہی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جتنی دلچسپی سے بادی۔ اس کے پاس ایک سیاہ لائبریری تھی جس میں کبھی کبھار وہ کوئی نوٹ لے لیتی تھی۔ اس بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ مقامی آثار قدیمہ کے بارے میں ایک آرکیالوجک رہی ہے اور شوق قلم کار کی حیثیت سے ایک اخبار میں چھپوانا چاہتی ہے۔

نکت خریدنے کے بعد وہ ایک طویل مسرت گھبراہٹ سے گزرتی اور کوئیسیم کے اندر داخل ہو گئے۔ ایک ذور بانی کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا۔ گلیڈی ایٹر نگوار میں اور نیزے سے سوت کر ایک دوسرے پر جم پڑے تھے۔

”اس لڑکی کی طرف سے بہت چوس رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں بالکل اور طرح کارمک نظر آتا ہے۔“

”کیوں؟ کوئی خاص بات دیکھی آپ نے؟“

”نہیں حب! مگر یوں لگتا ہے کہ وہ لڑکی کچھ نہ کچھ خاص کرنے کی تاک میں رہتی ہے۔ میں نے ایک دو بار اسے جال سے بات کرتے دیکھا ہے۔ ان سے بات کرتے ہوئے اس کی آواز میں عجیب سی لگاوت آ جاتی ہے۔ کیا آپ نے بھی نوٹ کیا؟“

جب بارہ توقف سے بولی۔ ”نہیں.... میرے خیال میں بے تکلفی سے بات کرنا اس کی عادت ہے۔ وہ اپنے چچا ظہیر بھائی سے بھی ایسے ہی بات کرتی ہے۔ اکثر دیکھنے والوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ خیر چھوڑیے اس موضوع کو۔ اب بتائیے کیا پروگرام ہے؟“

”نہیں کھانا شام کھاتے ہیں۔“ ہادی نے کہا۔

”تو چلیے۔“ وہ بولی۔ وہ دونوں میز چیموں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باتیں کرتے ہوئے پیردنی دروازے کی طرف چل دیے۔ تاہم ہادی نے محسوس کیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے حجاب کو جو محسوس کرانے کی کوشش کی ہے اسے محسوس کیا ہے۔

”وہ باہر نکلے۔ یہاں چہل پہل تھی۔ ایک طرف ایک آرٹسٹ دیوار پر ”مرفانی“ کر رہا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی پوزیٹ بنانے میں مصروف تھا۔ کسی لڑکی کی تصویر تھی۔ دیواروں پر ایسی مصوری اور خطاطی یہاں کا رواج تھا۔ ہادی نے کہا۔ ”کیسے حب! لیکن ابھی ایک پوزیٹ آپ کے گھر میں بھی لگی ہوئی ہے نا؟“

حجاب کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جیسے ایک سایہ سا۔ اس نے پہلی دفعہ بھی جب پوزیٹ کا ذکر کیا تھا حجاب کے چہرے پر ایسا ہی تاثر آیا تھا۔ اس تاثر میں گہرا اندوہ تھا۔ جیسے کسی نے بے دھیانی میں اچانک کسی رزم کو چھلنے کی کوشش کی ہو۔ وہ بس ایک ”ہوں“ کر کے خاموش ہو گئی۔ ہادی کو افسوس ہوا کہ اس نے خواتین اور پوزیٹ کی بات کر

حجاب کا موڈ بحال کرنے میں ہادی کو کم و بیش آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پاکستان کی باتوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پیار سے پاکستان کا سہارا لیا۔ پاکستان کے بچے کو چوں کی باتیں، موسموں کی باتیں، تہذیبوں اور سیلوں، ٹیلیوین کی باتیں۔ حجاب سے اوپر اس کی آنکھوں میں پھر ایک خوشنما خوشی چمکنے لگی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ پہلے ہی چل دیں۔ اب تک ہادی کو یقین ہو چکا تھا کہ کوئی ان کے پیچھے نہیں ہے۔ دوسری طرف حجاب کے رویے سے بھی ظاہر تھا کہ اندرون خانہ کوئی لڑ بڑ نہیں ہوئی۔ مطلب یہ تھا کہ گھڑا رکھ ہونے والی ذیل پہن کر رہا ہے۔

وہ ایک آبی لڑکا کے کنارے ایک شاندار گرا آئیہاں میں جا بیٹھے۔ یہاں ہوا چل رہی تھی اور سہ پہر کا سورج اپنی منبری کریمیں بکھیر رہا تھا۔ حجاب کی چادر کے نقاب میں سے اس کے شہد رنگ بالوں کی ایک لٹ باہر نکل آئی تھی اور وہ اسے بار بار اندر کھسکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ دوسرے وسیع پھولوں کی طرح تھے۔ وہ سوچنے لگا،

ان کے جسموں سے خون کے نوارے پھوٹ رہے تھے۔ ہر دو گھنٹی ایگز کو ایک دوسرے سے لڑتا تھا یہاں تک کہ ایک ان میں سے مر جاتا۔ سینکڑوں تماشائی زندگی اور موت کی اس لڑائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اپنے شہرستان آسمان سر پر افکار ہے تھے اور یہ بھوکے شیروں کے مناظر تھے، جو بد قسمت غلاموں اور قیدیوں پر جھپٹ رہے تھے انہیں چیر پھاڑ رہے تھے۔ اور ان ہی جیسے انسان غارت سے کرسیوں پر بیٹھے یہ درندگی ملاحظہ کر رہے تھے۔ شہرستان شہزادیاں، حسینا بکلیں، رنگ برنگے لباس، شراب کے جام، نقاروں کی دھما دھم، مختلف درندوں کی چنگھاڑیں اور ان کے درمیان بے بسی سے مسکرتی دم توڑتی انسانیت، یہ تھا روم کا مشہور زمانہ جنگل اکھاڑا اور زندگی موت کے کھیل کی تلاش کا۔

”آپ کا کیا خیال ہے ہادی! ایسا کیوں ہوتا ہے۔ انسان ظلم کیوں کرتا ہے؟“

”اس لیے حب! کہ کوئی دوسرا انسان ظلم کرتا ہے۔“

ہادی نے پہلی بار اسے اس کے مختصر نام سے پکارا تھا وہ ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

”ہادی نے کچھ نہیں۔ ہادی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مظلوم کبھی بھی غمناک نہیں ہوتا۔ ظالم سے نکرانے کے لیے کچھ وقت چاہتا ہے، کچھ مہلت مانگتا ہے۔ مظلوم کو یہ مہلت اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ظلم ہونا مظلوم کی عادت بن جاتا ہے۔“

”اور یہ بھی تو ہوتا ہے ہادی! کہ ظالم اپنے ظلم کی کڑوی گولی کو مختلف طرح کی شکر میں لپیٹ دیتا ہے۔ کبھی اس پر رسم و رواج کی شکر چڑھاتا ہے کبھی مذہب کی اور کبھی معاشرے کی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ اس دن ہم یہی بات کر رہے تھے نا۔ اب دوسری یا تیسری شادی کی بات کی تھی کہ ظالم کو فوے کیسوں میں تو مرد کوئی عورت کی خواہش ہی ہوتی ہے نا تو کبھی پہلی عورت کی بے اولادی کا بہانہ بنایا جاتا ہے کبھی اس کی بیماری یا کم صورتی کا۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہی ہے اور زندگی میں اس کے قدم سے قدم ملا کر چل سکتی وغیرہ وغیرہ۔“

ہادی نے ایک گہری سانس لی اور جھکے جھکے انداز میں بولا۔ ”جلال صاحب سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں چل رہا آپ کا۔ میرا مطلب ہے کہ آج کل ہم مردوں کے خلاف بہت بول رہی ہیں۔“

”نہیں.... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میاں بیوی میں معمولی اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔“

ہادی نے موضوع بدلا۔ ”یہ ارم صاحب آپ کی دیورانی فوزیہ کی چھوٹی بہن ہے نا۔“

”ہاں.....“ حجاب ذرا چونک کر بولی۔

”میں گھر میں ایک دو بار ملا ہوں اس سے۔ کافی ہوشیار لڑکی ہے۔ اپنی بڑی بہن سے بالکل مختلف۔ یہ آپ کے ذاتی معاملات ہیں۔ ایک بات کہوں اگر بُرا نہ مانیں تو۔“

”جی کہیے۔“

”خود بخوبی نہیں آتی۔“

”ہاں نہیں جب اہلیز بتائیں مجھے کیا آپ کو اس وقت ذرا نہیں لگا تھا کہ آپ کو اس حال میں کسی نے دیکھ لیا تو

”وہ تو بچہ تھا مگر“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”ہاوی آپ جانتے ہی ہوں گے۔ اہل میں ہمارے کچھ معاملات کی جزیں ہمارے ماضی میں ہوتی ہیں۔ بچپن میں جب میں بہت ڈپریشن ہوتی تھی، بہت زیادہ تو میں ایک مزیدار کام کرتی تھی فیصل کی نیکر اور شرٹ وغیرہ پہن لیتی تھی اور گھر کے لان میں خوب اودھم مارتی تھی۔ فیصل مجھ سے ذرا بڑا تھا چھوٹا ہے مگر اس کے کپڑے مجھے پورے آ جاتے تھے۔ ہم دونوں لان میں لڑتے تھے، کھیل کر رہے تھے۔ سائیکل چلاتے اور پتا نہیں کیا کیا۔ دو چار گھنٹوں میں، میں باورل محسوس کرنے لگتی تھی۔ گیارہ بارہ سال کی عمر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی اب کو بھی پتا تھا کہ میں شدید ڈپریشن سے نکلنے کے لیے ایسا کرتی ہوں۔ یہ ایسا بہت سے لوگوں میں ہوتا ہے ہادی! سخت پریشانی یا مایوسی کے وقتوں میں وہ مختلف طریقوں سے اپنا رنج و غم دیتے ہیں۔ کوئی بہت زیادہ کھانا پینا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ لڑتے جھگڑتے ہیں یا برتن توڑتے ہیں، کچھ لڑتے ہیں۔ کوئی خودکشی اندھا دھند شاپنگ کرتے ہیں۔ یہ سب ڈپریشن سے نکلنے کے راستے ہی ہوتے ہیں۔“

”یعنی آپ میاں دہارہ سال کی عمر تک اسی طرح کپڑے بدل کر اور بھاگ دوڑ کر اپنی ڈپریشن دور کرتی رہیں۔ جن پر ظاہر ہے کہ آپ بڑی ہوشیار اور یہ ڈپریشن جھکاؤ سلسلہ ختم ہو گیا۔“

”ہاں“ چوہا ایسا ہی ہوا۔ ان کے بعد کبھی نہیں ہوا۔ آخری بار میں وہاں ونس میں تھا اور شاید یہ بالکل آخری تھا اس کے بعد پھر کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ مسکرائی۔

”اس کا مطلب ہے کہ ان دنوں آپ شدید ڈپریشن کا شکار نہیں۔ مایوسی کا کوئی زبردست دورہ تھا۔“ اس نے

”نہاں! بچہ ایسا ہی کچھ لیس۔ بس ایک گھریلو معاملہ تھا۔“ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اس کی زندگی کی بدترین گھڑاں تھیں۔ ایک بار تو ان کے جی میں آئی تھی کہ وہ خود کو ختم ہی کر لے۔ اسے ادم اور جلال کے رومانی تعلق کا پتا چلا تھا کہ کتنا تھا کہ وہ گھٹ کر گر جائے گی۔ اور جب واقعی اس کی کیفیت مرنے والی ہو گئی تھی تو وہ ساری مصلحتیں ایک طرف رکھ کر باہر نکلی تھی اور اس نے ایک دو دن کے لیے خود کو ونس کی گہما گہماؤں میں غرق کر دیا تھا۔

ہادی نے اس کے تاثرات دیکھ لیے تھے اور سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں مزید مداخلت نہیں چاہتی۔ لہذا اس نے بھی اسے مزید نہیں کر دیا۔

”اب بھی اب موصوع بدلنے کے لیے موسم کی صورت حال پر نگاہ ڈال رہی تھی۔ سورج کی کرنوں میں تمازت محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے ہوا کی تازگی کی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے جیسے کچھ پڑھنے کی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جلال کا نمبر تھا۔ وہ لپٹا تھا۔ تل فون نہیں دیکھی تھی۔ مگر جب سیکے میں ہوتی تھی تو کبھی کبھی جلال کی اجازت سے رکھ بھی لیتی تھی۔ وہ

محبت کیوں وہیں پر ہوتی ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ ان لمحوں میں اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس کی اس گواہی میں سورج کی سنہری کرنیں، ٹھنڈی ہوا، آبی گزرگاہ اور نیلا آسمان بھی شامل تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ان لمحوں میں اس وقت وہ حجاب پر آشکار کر دے کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے تو اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ شاید ایک بار پھر وہی تیز دھار، زہریلا فقرہ کہے کہ ”آپ سب مرد بس ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، عورت کو بس ایک ہی زاویے سے دیکھتے ہیں“ اور اٹھ کر دروم کی گلیوں میں کہیں گم ہو جائے اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

میں ان لمحوں میں گزری کے اس منظر پر بیٹھے بیٹھے حجاب بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے ہادی کے پاس راحت کی ملتی تھی۔ جیسے کوئی بہت اپنا اس کے ساتھ ہو۔ اس کے ذمہ درد میں شریک ہو۔ حجاب تنگ ذہن میں ایک شاعر کا تصور ایک دبلے پتلے شخص کا تھا۔ بکھرے بال، ہونٹوں پر پان کا رنگ، آنکھوں پر مونے شیشوں کی عینک، ہادی تو یکسر مختلف تھا۔ دراز قد، روشن آنکھیں، کشادہ سینہ، وہ ہر اعتبار سے ایک ذہین اور مضبوط شخص نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے پھرتے حجاب کو بھی بھی عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا۔ وہ کچھ دن پہلے ونس میں جس طرح اچانک ہادی کو حیران و پریشان چھوڑ کر دروم چلی آئی تھی اس پر وہ قلع محسوس کرتی تھی۔ اس کے جذباتوں پر اس نے ہادی سے جو بدتمیزہ بی کی تھی اس کا بھی اسے افسوس تھا۔ اب وہ اس کا ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ ایسا کرتی تھی تو اس کے اندر کی وہ شدید محسوس بھی کم ہوتی تھی جس کا تعلق اس کے گھریلو حالات سے تھا۔

ہادی محویت سے اخبار دیکھ رہا تھا۔ ایک ادبی صفحہ پڑھنے میں مشغول تھا۔ فیض احمد فیض کے دو شعرے میں ایک تفصیلی مضمون چھپا تھا۔ مضمون پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ کن آنکھوں سے حجاب کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ کچھ دیر تک اسے جیسے اپنے خیالوں میں گم ہو گئی تھی۔ نقاب تھوڑا سا نیچے سرکا ہوا تھا۔ ناک کی دائیں جانب ننھا سا تل بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ جب بات کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنا نچلا ہونٹ نرمی سے دانتوں میں دباتی تھی تو ایک نہایت دلکش ادا بین جاتی تھی۔ ہادی کو یاد آیا جب ونس میں وہ دونوں یکپ سے پانچ نمبر بس پر شہر کی طرف آ رہے تھے بس کی لینڈی ڈرائیو کو اچانک بریک لگانا پڑے تھے۔ اس واقعے کی مہربانی سے حجاب پوری کی پوری اس کے ساتھ پوسٹ ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی کھڑے کھڑے شدت سے بغلیں ہو جائے۔ وہ دل فراد جان لیوا بس ہادی آج تک بھول نہیں پایا تھا۔ اسے حسین گھراؤ کے بعد بھی حجاب نے سخت کے عالم میں اسی طرح بولے سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تھا۔ وہ منظر ناقابل فراموش تھا۔

ہادی نے انگلی اخبار ایک طرف رکھا اور اپنے قدموں سے لیے بالوں کو پریشانی سے بنا تے ہوئے بولا۔ ”ایک بات میرے ذہن میں کھٹکتی رہتی ہے جب! کبھی ایک سوال ہے۔ کیا آپ جواب دینا پسند کریں گی۔“

”جی نہیں۔“

”جب آپ علیز انھیں اور ونس میں مجھ سے ملی تھیں تو وہ ایک بڑا مختلف روپ تھا۔ اس کی کچھ مجھے آج تک نہیں آتی۔“

پیارے میری بات سنی ہے تم نے۔ آج ہی گھر واپس آؤ اور معافی مانگوا لی ہے۔ آج ہی۔۔۔
 وہ ہنس لگی کر بولی۔ "میں آجاتی ہوں جلال اور آپ کہتے ہیں تو معافی بھی مانگ لیتی ہوں لیکن پلیز ارم کے
 سامنے اس طرح میز پر تو جین نہ کریں۔ اسے کہیں کہ وہ نیچے والے کمرے میں واپس چلی جائے۔"
 ایک مختصر وقفے کے بعد جلال کنبیر آواز میں بولا۔ "تو تم آنے کے لیے یہ شرط رکھ رہی ہو؟"
 "نہیں جلال! ایسی بات نہیں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"
 "وہ جب تک وہاں ہوگی۔ مجھ سے نہیں آیا جائے گا۔" پتا نہیں وہ آخری الفاظ کیسے کہہ گئی۔ یہ وہی جرأت تھی
 جس کے اندر مجھ کے والی چنگاری نے اسے دی تھی۔ ورنہ وہ تو جلال کے سامنے ایسی بات کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی
 تھی۔

"تو یہ شرط ہے تمہاری؟" وہ ذرا سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔
 "نہیں ہے۔ منت کر رہی ہوں جلال! پلیز۔۔۔"
 "میں نے اس طرف چند سیکنڈ کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ حجاب کو لگا کہ شاید وہ فون بند کر دے گا لیکن ایسا نہیں
 ہوا۔ اس بار وہ بولا تو اس کی آواز میں طیش کا بیجان نہیں تھا۔ "اچھا میں دیکھتا ہوں اس معاملے کو تو تم کب آرہی ہو؟"
 "اگر آپ اجازت دیں تو صبح آ جاؤں۔"
 "چلو ٹھیک ہے۔ گاڑی بھیج دوں گا یا فیصل کے ساتھ آ جاؤ گی؟"
 "گاڑی بھیج دیجیے گا۔"

اسی کہات کے بعد یہ بات چیت ختم ہو گئی۔ تقریباً تین سال میں یہ پہلا موقع تھا جب اس طرح دو کسکی بات پر
 بات چیت ہوئی تھی۔ جلال نے مانی بھی تھی ورنہ تو اس سے بہت پہلے ہی ڈانٹ ڈپٹ اور سرخ انکارہ آنکھوں تک
 پہنچ چکی تھی۔

○ ○ ○ ○ ○
 ایک روز دوپہر تک وہ واپس اپنے سرسراہٹے چکی تھی۔ اس کا دل ابھی ای ابو کے پاس رہنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر
 چھوڑنا ہی ختم تھا اور ایسے احکامات سے سہارا لیتی جرات وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے یہی بڑی بات تھی کہ جلال
 نے اس کی بات مان لی تھی اور ارم کو کمرہ نوٹ کر رہنے کے بجائے واپس نیچے بھیج دیا تھا۔ آج صبح حجاب نے
 فون پر کوئی نہ کر کے معلوم کر لیا تھا کہ ارم واپس نیچے جا چکی ہے۔ اس کے بعد ہی اس نے آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جلال کو آنا ذرا دیر سے جاتا تھا۔ وہ ابھی گھر میں ہی تھا۔ وہ مارل طریقے سے حجاب سے ملا۔ اس کا حال احوال
 بالکل اچھا تھا۔ بارے میں دریافت کیا کہ وہ باقاعدگی سے لکھ رہی ہے یا نہیں۔ جلال کا مودتہ رے بہتر لگتا تھا اور
 یہ بھی دیکھ کر حجاب نے اطمینان کی سانس لی۔

"کتنے بچے آئیں گے؟"

فون سنتی ہوئی ذرا آگے چلی گئی۔

"ہیلو۔۔۔ جلال کی بھاری بھر کم آواز حجاب کے کانوں میں پڑی اور وہ کپکپاہی گئی۔

"جی میں بول رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"کہاں چ رہی؟"

"یہاں ذرا باہر آتی ہوئی تھی۔ تھوڑی سی شاپنگ کے لیے۔"

"ساتھ کون ہے؟"

"سنگ۔۔۔ کوئی نہیں۔ امی نے آتا تھا مگر ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ فیصل بھی آ نہیں سکا ہوا ہے۔"

"تو شام کو آ جاتیں۔" ناگوار سی سانس لگ گیا۔

"امی کی ایک دو دو آئیں بھی لینا نہیں۔"

"اچھا۔۔۔ یہ کل تم نے کیا بات کی ہے امی سے وہ سخت ناراض ہو گئی ہیں۔" جلال کی آواز میں

"مہم۔۔۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جلال۔"

"تو تمہارے فرشتوں نے کی ہے؟"

"میں نے تو بس کمرے کی تھوڑی سی بات کی تھی۔ اتنا کہا تھا کہ وہ کمرہ ارم کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ بلکہ اسے نو

ہی نہیں چاہیے تھا کہ اس کمرے میں آتی۔ اسے پتا بھی ہے کہ پچھلی دفعہ ہم کو یہ اچھا نہیں لگا تھا۔"

"لیکن امی کا اس میں کیا قصور ہے۔ تم نے ان کو کیوں اڑام دیا؟"

"جلال! آپ جانتے ہیں امی کی مرضی کے بغیر وہ اوپر نہیں آ سکتی تھی۔ امی کو بھی سب پتا تھا۔"

"اچھا۔۔۔ وہ آئی گئی ہے تو ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے تم پر۔" جلال گرجا۔

ایسے موقعوں پر حجاب سہم جایا کرتی تھی۔ منمنانے لگتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں جب بات ارم کی ہوتی تھی

کی کسی پیش قدمی کی ہوتی تھی تو حجاب کے اندر ایک عجیب سی جرات آ جاتی تھی۔ ایک دو بار وہ خود بھی ششدر رہا

تھی۔ کوئی نامعلوم ہی تو آتا ہی تھی جو اس کے اندر بھر جاتی تھی۔ ایک ایسی توانائی جس کا کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

خاص طور سے جلال کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ "جلال! آپ کتنا

ہے کہ اس کا یوں ہمارے قریب رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پلیز جلال! پلیز ایسا مت کریں۔ اسے مجھ پر ملاحظہ

کریں۔"

"مسلسلہ۔۔۔ کون مسلط کر رہا ہے۔ کون کر رہا ہے؟ تم خود اپنے اوپر مسلط کر رہی ہو چیزوں کو۔ تمہارے

نہکانے نہیں ہیں اور زبان بھی لگ گئی ہے تمہیں۔ بدتمیزی کی ہے تم نے امی جان سے۔ تمہیں ان سے معافی

پڑے گی۔ ورنہ پھر یہ بات بگڑ جائے گی۔ مجھ سے نہ کوئی نہ ہوگا۔"

ہاتھیں کرتے کرتے حجاب ایک درخت کی اوٹ میں چلی گئی تھی تاکہ ہادی اس کی آواز اور تاثرات سے

رہے۔ جلال کے طیش کے سامنے وہ تھر تھرا کا ہٹا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے بولنا چاہا مگر اس کا گلہ خشک ہو گیا تھا۔

جواب بیٹھ گئی۔ اس کا دل یکبارگی تیز دھڑکنے لگا تھا۔ جلال کچھ دیر تک الفاظ کا انتخاب کرتا رہا۔ پھر بھی لیکن گھبر آواز میں بولا۔ ”حب! بے شک ہم لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ کبھی کبھی مجھ سے کچھ زیادتی بھی ہو جاتی ہے لیکن میری اور تمہاری محبت ایسی ہے جس میں کوئی فرق آئی نہیں سکتا۔ نہ اب نہ آئندہ کبھی۔ میرے دل میں تمہارا جو مقام ہے وہ صرف تمہارا ہی ہے۔“

”م۔۔۔ مجھے پتا ہے جلال! لیکن آپ کوئی بات کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”ہاں حب!“ وہ عجیب ٹھہراؤ کے ساتھ بولا۔ ”میں..... ارم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ بیسے سن ہوئی۔ کتنی ہی دیر کھلی کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کان سانس سانس کر رہے تھے۔ پھر آواز بادل اس کے گلے سے نکل سکی۔

”میں..... کبھی..... نہیں جلال۔“

اس نے اپنا بھاری ہاتھ جواب کے کول ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”حب! مجھے یقین ہے میں تم دونوں کو بڑے اچھے طریقے سے رکھ سکتا ہوں۔ ہم تینوں خوش رہیں گے۔ اگر تم چاہو گی تو میں دونوں کو علیحدہ گھر لے دوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں کسی طرح کی بے انصافی نہیں ہونے دوں گا۔ دیکھو حب! میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔ جن کی زندگی میں ہر روز زحمتیں آتی ہیں لیکن بیوی بے چاری بے خبر رہتی ہے اگر میری زندگی میں کوئی آیا ہے تو میں نے پوری ساف ادا کی ہے۔ تمہیں بتا دیا ہے اور اب تم سے بھی امید رکھتا ہوں کہ تم حوصلے اور محاذ نہیں کا شوت دو گی۔“

ایک غلط فہمی کو دیکھ کر وہ بے وقوفانہ قہقہے کے بعد اب جواب کے جسم میں زندگی کو نشا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ جلال کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔ اس طرح کے کوئی اور عالم لمحے ہوتے تو جواب جلال کے سامنے سر ہٹا پا مجروح لگتا۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی، اپنے آنسوؤں سے اس کے پاؤں تر کر دیتی۔ کسی بھی طرح سے اسے نہ ہٹاتا۔ نہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرتی لیکن یہ اور معاملہ تھا۔ یہ اور کہانی تھی۔ یہاں جواب نہیں، جواب کے اندر کی محبت زور پھرتی۔ یہاں جواب کی پامالی کا نہیں اس احساس کی پامالی کا مسئلہ تھا جو عورت کو کسی کی بیوی اور شریک حیات ہونے کا فخر عطا کرتا ہے۔ آج یہ فخر اور احساس اس سے چھین رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک آنگن بھی خود سے دور جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے آج وہ جواب نہیں رہی تھی۔ ایک دلیر عورت بن گئی تھی۔

وہ نرزاں آواز میں بولی۔ ”میرا گناہ مجھے بتا دیجیے جلال! آپ کی خدمت اور اطاعت میں مجھ سے کہاں کی ہوئی ہے۔ یا میرے اندر کوئی کمی ہے تو بتا دیجیے۔ مجھے آپ کی بات سمجھنے میں مدد تو ملے۔“

”یہ تمہاری کمی کی بات نہیں حب! اگر کوئی کمی ہے تو پھر مجھ میں ہے۔ یہ سلسلہ کافی دیر سے موجود تھا حب اور کسی حد تک تم بھی جانتی ہو۔ اگر میں چاہتا تو خاموشی سے بھی یہ شادی کر سکتا تھا۔ ارم کو خوش یا میلانوں میں کوئی گھر لے دیتا۔ تم لوگوں کو برسوں تک اس کی خبر نہ ہوتی اور شاید کبھی بھی نہ ہوتی۔ لیکن میں نے تمہیں کہا ہے تا میں دوغلا نہیں ہوں اور میں تمہیں یہ بھی بتا رہا ہوں حب! میں بے انصافی نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔“

وہ کمزری ہو گئی۔ ”آپ کس انصاف اور بے انصافی کی بات کر رہے ہیں۔ بے انصافی تو آپ نے اس وقت

”دس تو بی بی جائیں گے۔ شاید زیادہ دیر ہو جائے۔ تم کھانا کھا لیں۔“

”نہیں! اسٹے ہی کھائیں گے۔“ جواب نے کہا۔

”اوکے۔۔۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“ جلال کے لہجے میں مفاہمت تھی۔

جلال کو آج چونکہ دیر سے جانا تھا اس لیے ارم خود ہی یونیورسٹی چلی گئی تھی۔ ارم کی بڑی بہن یعنی چھوٹی دیورانی فوزیہ جیسے کتنی ہوئی تھی۔ جلال کے جانے کے بعد آپا خانم گھر میں اکیلی تھیں۔ جواب نے سب سے پہلے سنا والا کام کیا۔ وہ آپا خانم کے پاس پہنچی جو بستر پر نیم دراز لی وی دیکھ رہی تھیں۔ پاؤں کبل میں تھے۔ جواب نے پاؤں دبانے لگی۔ وہ بدستوری وی دیکھتی رہیں۔ اگر وہ بہت زیادہ ناراض ہوتیں تو اپنے پاؤں کھینچ لیتیں۔ یا کولا سخت بات کہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ معافی بخانی کی گنجائش موجود ہے۔ جواب نے یہی کیا جو جلال نے کہا تھا۔ سے معافی مانگ لی۔ ان کا تہا ہوا چہرہ کچھ ڈھیل پڑ گیا۔ پولیس گھر کا نظام اور بڑوں کا احترام سمجھتا تھا۔ چونکہ وہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ تم اب آگے سے جواب دینے لگی ہو۔ اس عادت کو کسٹروال کرو۔ وہ بے اختیار جواب دینے لگی۔ ”تمہیں پتا ہی ہے بحث کرنے والے پر جلال کتنی جلدی فضا آ جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے امی! میں آئندہ احتیاط کروں گی۔“ وہ پاؤں دبانے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

میز حیاں چڑھتے ہوئے اس کی نگاہ اس کمرے پر پڑی جہاں ارم نے قبضہ کیا تھا۔ اسے خالی دیکھ کر جواب اپنی کامیابی اور جیت کا احساس ہوا۔ آخر کچھ نہ کچھ تو اہمیت تھی اس کی اس گھر میں۔ سہ پہر کو جلال کا کلاس آتا کہ مشق کینسل ہو گئی ہے وہ نو بجے تک آ جائے گا اور اگر اس کا سوڈ ہو تو وہ باہر کھانا کھالیں گے۔

جواب کیسے انکار کر سکتی تھی۔ شام کو وہ تیار ہو گئی۔ اس نے جلال کے پسندیدہ رنگوں والا سوٹ پہنا۔ اس نے اپنے لائی بی اور سیاہ کا کبھی نیشن ہلکے سے میک اپ نے اسے ایک دم نکھار دیا۔ پچھلی ساگرہ پر اس کی امی نے اپنے لائی بی خرقہ میں سے اسے بندے خوا کر دیئے تھے۔ وہ اس نے پہن لے۔ بیماری کے بعد یہ پہلی شام تھی جب وہ اس طرح تیار ہوئی تھی۔ ارم یونیورسٹی سے واپس آ چکی تھی مگر جواب کو نظر نہیں آئی۔ شاید اپنے کمرے میں تھی۔

جلال آ کر فریش ہوا۔ گھر سے کوٹ پہنا جو وہ ہمیشہ کریم کلر شلوار قمیص کے ساتھ پہنتا تھا۔ وہ شاندار ٹھہر گیا۔ پر نکل گئے۔ موسم اچھا تھا۔ کھانا بھی مزیدار تھا۔ وہ رات بارہ بجے کے قریب واپس آئے۔ وہ میاں بیوی کبھی کبھار باہر نکلتے تھے لیکن جب بھی نکلتے تھے جواب آپا خانم کے لیے کچھ نہ کچھ لانا نہیں بھولی تھی۔ اب بھی وہ آتے آتے ہا کے لیے شاہنگ سینئر سے سردیوں کا سوٹ خرید لائی۔

جب وہ بیڈ روم میں پہنچے تو جلال کا سوڈ کچھ عجیب تھا۔ جیسے وہ جواب سے کوئی خاص بات کہنا چاہ رہا ہو۔ لیکن کمرہ اور ہالوں کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھ کر بستر تک آئی تو وہ بستر کے بجائے صوفے پر بیٹھا تھا۔

”کیا بات ہے۔ آج سوئے کا پروگرام نہیں۔“ وہ مسکرائی اور اس کی حسین پیشانی دکھانسی۔

”ہاں بیٹھ جاؤ ٹھوڑی دیر۔“ جلال نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

دیکھنے لگی تھی۔ لیکن آج سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ اس نے کروت بدلی۔ جلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر عقب سے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس کا سینہ سکڑیوں سے دھل رہا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا لیکن بے حرکت لیٹا رہا۔ دور دینی رہی۔ پھر وہ بیتاب ہو کر اٹھی اور اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ وہ ہچکیاں لینے لگی۔

"ہائیز جلال! ہائیز....." وہ بس اتنا کہہ پائی۔

جلال نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھایا۔ گاؤں کیلئے کے سہارے بٹھایا اور ایک بار پھر اسے سمجھانے بچانے میں مصروف ہو گیا۔

اس کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ یہ سب کچھ اتنا تکلیف دہ نہیں ہوگا جتنا وہ سمجھ رہی ہے۔ وہ انصاف کرے گا۔ جواب دہی کوئی دکھ نہیں پہنچے دے گا۔ ارم کو ٹیبلٹ دے گا۔ مگر وہ جو فیصلہ کر چکا ہے۔ اس سے پیچھے ہٹنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

جواب خاموشی سے سن رہی۔ رورہ کر ہچکی اس کے جسم کو ہلا دیتی تھی۔ دھیرے دھیرے شدید غم اور صدمہ سے کیفیت اس کے اندر کچھ ماند پڑنے لگی اس کی جگہ ایک تش نے لیتی شروع کر دی۔ یہ تش کہاں سے آ رہی تھی۔ یہ تش ایک پنکھاری سے نکل رہی تھی۔ وہ پنکھاری جس نے کچھ عرصہ پہلے جواب کے سینے میں جگہ بنائی تھی اور اب دھیرے دھیرے اپنا حجم بڑھا رہی تھی۔

جلال ہاتھیں کر رہا تھا۔ مگر یہ باتیں صرف جواب کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان سے آگے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ جلال بار بار یہ بات کہہ رہا تھا اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ ہر راستہ تمہارے سامنے کھلا ہے۔ ہر راستے سے اس کی نیا سارا آتی، یہ بھی جواب اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ یہ دہلا دینے والی بات بتا رہا تھا کہ وہ جواب کو طلاق دینے کی باتیں کر رہا تھا۔

آخر میں جواب نے بس اتنا کہا۔ "میں کچھ طوطوں کے لیے ای کے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"کون؟"

"سوچنے سمجھنے کے لیے۔" جواب نے مختصر جواب دیا۔

"فیک ہے۔ لیکن اس طرح آنسو بہاتے ہوئے نہ جانا۔ ان لوگوں کو ابھی کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

دواہر کے گھر واپس آ گئی۔ وہ خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اپنے ماں باپ اور بھائی کو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔ خاص طور سے اب کو۔ لیکن ماں بھی عجیب شے ہوتی ہیں۔ اپنے بچے کے اندر جھانک لیتی ہیں۔ سو غلاموں میں جھپٹی ہوئی کیفیت کو بھی بھانپ لیتی ہیں۔ جواب کی امی بھی جان چکی تھیں کہ سسرال میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ اتنا تو انہیں پتا چلا تھا کہ ارم نے جواب کے ساتھ غلام بگڑا اپنے لیے کھلوا یا تھا جس کے بعد گھر میں کئی چیز اچھوٹی تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ جلال نے اپنی والدہ سے معافی منگوانے کے لیے جواب کو گھر بلا دیا ہے اور

شروع کر دی تھی جب ارم پر نظر رکھنی شروع کی تھی اور وہ غلامین اور کسے کہتے ہیں۔ آپ نے مجھے شریک حیات بنا دیا تھا۔ ہمیشہ ساتھ بھانے کا وعدہ کیا تھا۔" وہ سر تاپا کانپ رہی تھی لیکن یہ خوف کی نہیں غصے کی پکپکاہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں آتش آسو تھے۔

وہ غصہ لے لہجے میں بولا۔ "دیکھو صاحب! اس بات کو جتنا بڑھاؤ گی بڑھتی جائے گی۔ ہونا وہی ہے جو میں نے تم سے کہا ہے۔ اب یہ اچھے طریقے سے ہونا ہے۔ اس کا فیصلہ تم نے کرنا ہے۔"

وہ گرج کر کہنا چاہتی تھی کہ جب فیصلہ تم نے کر ہی لیا ہے تو پھر مجھے کیوں بلایا ہے۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔ "مجھے ابھی تک اپنے کانوں پر پھر دہرے نہیں ہو رہا جلال! مجھے صرف تم بتاؤ کہ یہ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ میرے اندر کیا کچھ دھمکی ہے آپ نے۔ کیا کوتاہی ہوئی ہے مجھ سے؟"

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے میری طرف سے ہوا ہے لیکن اب یہ ہو چکا ہے۔ ہم سب کا یہ فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ پھر مجھے جواب دینا۔" جلال نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جواب میں جا کر نوٹھ پیسٹ کی اور پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا اس کا چہرہ دھما دھما کی طرف تھا۔

جواب اپنی جگہ ساکت و جامہ بیٹھی رہی۔ اسے جیسے کسی نے دیوار میں چن دیا تھا۔ آنسو مسلسل اس کے رخساروں پر رینگ رہے تھے۔ ابھی اس نے اپنے جو رخساروں پر بندے اتار کر سائیز ٹیبلٹ پر رکھے تھے۔ وہ بھی اُداسی کی دنیا دھند میں اپنے ہوئے تھے جیسے دو اٹھکیاں کرتے خوش رنگ پرندے ایک دم مردہ ہو گئے ہوں۔ اس کی گلابی ٹانگی سے اٹھنے والی "پروٹسی" کی دھم خوشبو کسی بے نام سوگ میں ڈوب چکی تھی۔ کتنی ہی دیر بعد وہ کئی آنسو ہونچتے ہوئے

اٹھی اور بستر کے دوسرے کنارے پر جا کر لیٹ گئی۔ اس کی ہستی ایک طوفان کی زد میں آ چکی تھی۔ صرف اس کے ہونٹ پہلے وہ کتنی خوش محسوس کر رہی تھی۔ جلال کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ اس سے ملکی چٹکی باتیں کر رہی تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ جلال کی یہ مہربانی ایک مہیب صدمے کا پیش خیمہ ہے۔ اسے لگا کہ اس نے جوشیلک کھایا تھا وہ اس کے گلے کی طرف آ رہا ہے۔ گرم آنسو لگا تار رخساروں پر رینگ رہے تھے۔ جو کچھ آج سامنے آیا تھا اس کا خدشہ تو وہ

بہت پہلے سے محسوس کر رہی تھی لیکن یہ اتنی جلدی اور ایسے بے رحم طریقے سے سامنے آئے گا اس کا اس نے سوچا تھا تھا۔ شاید کل سہ پہر اس نے کمرے کے حوالے سے جو رسالت کی تھی اس کا خیال وہ اسے بھٹکتا پڑا تھا۔ جلال نے ایام کی صورت میں جو چھری اپنے لبا دے میں چھپائی ہوئی تھی وہ آغا نا اس پر چلا دی تھی۔

اپنے والدین کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومتے گئے۔ ان کی معاشی پریشانیوں، ان کے حالات، وہ جو وقت جواب کی طرف سے خندنی ہواؤں کی دعا کرتے تھے لیکن یہ کیسی جھلسا دینے والی زہریلی آندھی چل رہی تھی۔ اپنی بیمار والدہ کا تصور اس کی نگاہوں میں آیا۔ اس نے سوچا، وہ یہ سب کچھ کیسے جھیل سکیں گی۔

بستر کے کنارے پر لیٹنے لپٹنے اس کی برداشت جواب دینے لگی۔ وہ ہر معاملے میں جلال کے سامنے جھکی تھی لیکن ارم والے معاملے میں جھلنا اسے کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اسے کبھی یہ قبول ہوا تھا کہ وہ ارم کا راستہ روکنے کے لیے جلال کے پاؤں میں بیچھے۔ پتا نہیں، اس کی اتنا جو کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی اس معاملے میں کیوں اپنی جھلک

طرف آگئی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابو میز پر جھکے ہوئے تھے۔ سامنے سیاہ جلد والی ایک ڈائری تھی۔ یہ وہی ڈائری تھی جس میں انہوں نے دو ڈھائی سال پہلے کا حساب کتاب لکھ رکھا تھا۔ اس حساب کتاب میں بیشتر حصہ ان اخراجات کا تھا جو امی کی بیماری کی تشخیص اور علاج کے سلسلے میں آئے تھے اور جنہوں نے آٹا ناخواب کے والدین کو ایک بھاری قرضے کے بوجھ تلے دیا تھا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی ڈائری تھی لیکن اس کا وزن کتنا زیادہ ہے یہ کچھ ابوی جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس ڈائری کو دیکھتے ہوئے ان کے چہرے پر درجنوں ہلانی سلنس نظر آنے لگی تھیں۔ حجاب نے سوچا وہ اچھے وقت پر چائے الٹی ہے۔ حجاب کو دیکھتے ہی فیاض صاحب نے ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور چائے کو کچ کر خوشی کا اظہار کیا۔

دو دن چائے پینے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ پچھلے تین چار دن سے امی کی طرح ابو بھی حجاب کے موڈ سے کچھ ہنستے ہوئے تھے۔ انہوں نے حجاب کو اپنے ساتھ لگا لیا اور بڑی محبت سے اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھنے لگے۔ جب انہوں نے مخصوص انداز میں بار بار کہا کہ بیٹی بتاؤ۔ اس طرح تمہارا بوجھ ہلکا ہو گا۔ تو نہ جانے کیا کیا حجاب کے آنسو چھٹک پڑے۔ اس نے ابو کے کندھے سے سر لگایا اور جھکیوں سے رونے لگی۔ وہ اسے کہنے لگی۔ پکارنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ اس کے رونے کی وجہ بھی پوچھ رہے تھے۔

”جب اکسب جلال نے تم پر ہاتھ تو نہیں اٹھایا۔ تمہیں مارا تو نہیں؟“

”نہیں ابو!۔ اس سے بہت آگے کی بات ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”جال۔ جلال۔ اس کی آواز بیٹھ گئی۔“

”کو بیٹی بتاؤ مجھے۔“

”جال! دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں ابو! وہ کہتے کر کے کہہ گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔“

”باب بیٹی بہت دیر تک ساکت بیٹھ رہے۔ حجاب کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا تو فیاض صاحب نے اسے بہانہ کی ضرورت سمجھ کر کہا۔ ان کے کہنے پر حجاب انہیں اس سارے واقعے کی تفصیل بتانے میں مصروف ہو گئی۔ ارم والے معاملے کی جانکاری اس حد تک تو فیاض صاحب کو بھی تھی کہ وہ بن بلائے مہمان کی طرح حجاب کے گھر میں تھیں۔ انہیں اور جلال کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن بات یہاں تک پہنچ جائے گی اس کا اہمیل نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ان کے چہرے کی غماک سلونوں میں چند مزید سلونوں کا اضافہ ہو گیا۔ وہ جیسے ایک کچلے کے اندر سی مزید بوز سے نظر آنے لگے تھے۔“

”اگلی یہ سب کچھ اپنی ماں کو نہ بتانا حسب! تم جانتی ہو صدمہ اس کے لیے کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر اس پر دوبارہ بے ہوشی طاری ہوئے گی تو وہ خطرے کی علامت ہوگی۔ ابھی ہمیں کم از کم پانچ چھ ماہ کے احتیاط سے گزارنے ہیں۔“

”نہیں ابو! مجھ میں تو بتانے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ لیکن آخر تک چھوڑ رہے گی یہ بات؟“

”یا اللہ! اگر تم گھر ہم پر۔“ وہ بڑبڑائے اور ہاتھ کچڑ کر بیٹھ گئے۔

حجاب نے معافی مانگی ہے۔ اس کے بعد کی کوئی بات انہیں معلوم نہیں تھی۔ ان کے بہت پوچھنے پر بھی حجاب نے کچھ نہیں بتایا۔

وہ امی ابو سے ہنس بول رہی تھی۔ فیصل کے ساتھ بھی نارمل انداز میں ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی تھی لیکن اس کے اندر جوقیامت پاتھی وہ کچھ اسے ہی معلوم تھا۔ جلال انتہا کو چھو گیا تھا۔ اس نے اشاروں اشاروں میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ حجاب کو طلاق کی قیمت پر بھی ارم کو اپنائے گا۔ یہ بات اس نے کیوں کہی تھی۔ یہ اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ایک سال پہلے جب طلاق کے لفظ کی بازگشت حجاب کے ولید خاندان میں سنائی دی تھی تو کیا ہوا تھا یہ سب لوگ جانتے تھے۔ ایک طوفان تھا جو بہت کچھ بگاڑ گیا تھا۔ ایک لڑکی نے ذلت اور تکلیف کی انجیا کو چھوڑا تھا۔ پھر اس کی جان گئی تھی۔ اس کے شیر خوار بچے کی جان گئی تھی۔ اس واقعے کی یادگاروں میں سے ایک یادگار وہ پھرنٹ الٹی تھی۔ حجاب کے گھر کی ایک دیوار پر لگا تھا۔ وہ اس کی محراب میں نہیں اس کی گہری اور قریب ترین سبکی بھی تھی۔ صدمہ ایک آہستہ سیخ کی طرح حجاب کے سینے میں گڑا رہا تھا۔ اس میں سے خون رستا رہتا تھا۔ پیش کی موت کا غم گسل صدمہ صرف حجاب کے سینے میں ہی نہیں تھا۔ ولید جلی کے بہت سے لوگ اس کی بیسیں اب تک اپنے دلوں میں محسوس کرتے تھے۔ لہذا حجاب جانتی تھی کہ کل رات جلال کے منہ سے ادا ہوئے والے اس لفظ کا مطلب کیا ہے اور اگر یہ پیش والا واقعہ نہ ہو جاتا تو بھی حجاب کا گھرانہ ان گھرانوں میں سے تھا جہاں طلاق ہی کو نہیں طلاق کے لفظ کو بھی مہیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لیے فیصلہ اور علیحدگی جیسے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اگر پیش طلاق لینے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی تو شاید حجاب بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پیش کے لیے بچے کی صورت میں ایک جکڑ بندہ موجود تھا۔ حجاب بھی ایک اور طرح کے جکڑ بند میں جکڑی ہوئی تھی۔

حجاب سوچ رہی تھی اور اس کے سینے میں گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کسی نے اس کے منہ پر ایک بھاری تکیہ رکھ دیا ہے اور پورے وزن کے ساتھ اس پر بیٹھ گیا ہے۔ وہ سانس لینا چاہتی ہے، ترتیب رہی ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتی۔ جو سلسلہ ڈیڑھ دو سال پہلے شروع ہوا تھا اب وہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ کیا اب ولید فیملی میں ایک اور پیش وجود پاری تھی۔



وہ ہنسنے کی سہ پہر تھی۔ ہادی کو ملے آج چار روز ہو چکے تھے۔ اس دوران میں حجاب نے اپنا سیل فون بھی بالکل بند رکھا تھا۔ یقیناً ہادی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اچانک کیوں غائب ہو گئی ہے۔ پتا کچھ بتائے کیوں ایک بار پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ حجاب جانتی تھی کہ اس نے بار بار کال کی ہوگی اور سخت پریشان رہا ہوگا۔ مگر وہ خود اتنی پریشان تھی کہ ہادی کی پریشانی کا خیال اس کی اپنی پریشانی کے نیچے دب گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ وہ روم چھوڑ چکا ہو یا ایک دو دن میں چھوڑنے والا ہو۔

آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔ صرف ابو اسٹڈی میں موجود تھے۔ امی اور فیصل ہفتے بھر کارشن لینے کے لیے علی سینٹر گئے ہوئے تھے۔ ملازم ابو کا خط پوست کرنے گیا تھا۔ اس نے ابو کے لیے چائے بنائی اور لے کر اسٹڈی کی

وہ حجاب سے نظریں ہٹا کر بولا۔ "نہیں کوئی خاص بات تو نہیں لیکن میری جھنجھی جس نے اس کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔"

"پلیز ہادی! آپ میرے ذاتی معاملات میں دخل نہ دیں اور میری ایک گزارش ہے اگر آپ مان لیں تو۔۔۔"

غری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ مزید روکھا ہو گیا۔

"آپ نہ مان رہی ہیں۔"

وہ اس کے جملے کو نظر انداز کر کے بولی۔ "اب ہم اس سلسلے کو یہاں ختم کر دیں۔ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیں۔"

"مگر ہم نے تو طے کیا تھا کہ میرے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم دینی کن (مذہبی شہر) میں بیٹھیں گے اور سارا دن وہاں گزاریں گے۔"

حجاب نے جھنجھلاہٹ محسوس کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ اندرونی دروازے کی بیل پھر ہوئی۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ گھریلو ملازم تھا جو خط پوسٹ کر کے آیا تھا لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو ٹھٹک رہا تھا۔ اس کے سرال کے گھر کا ملازم مقصود کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اندین موتی چوڑے دو لوں کا ڈبہ تھا۔

"ہم! ہم! ہوئی باجی! اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔"

"یہ کیا ہے بھئی؟"

"منجانی ہے بی لارم منجانی نے بھجوائی ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" حجاب نے غصے سے پوچھا۔

"آپ کو نہیں ہمارا کل لی وی پران کی تصویر بھی آئی تھی۔ انہیں کافی بڑا انعام ملا ہے جی۔"

"کس بات کا؟"

"یہ تصویر منجانی سے ملا ہے بی کوئی مقابلہ تھا تقریروں کا۔۔۔"

حجاب کو یہ سنا دیا کہ کچھ دن پہلے کوئی ملک گیر کمیٹی نیشن ہوا تھا جس میں یونیورسٹیز کے مقررین نے حصہ لیا تھا۔ عائشہ اس میں ارم نے کوئی پوزیشن لی ہوگی۔ اب اس نے حجاب کو جتانے کے لیے یہ منجانی ارسال کی تھی۔ وہ ایسے کام کرتی رہتی تھی۔

مقصود شاید اس انتظار میں تھا کہ حجاب اسے اندر آنے کے لیے کہے گی۔ مگر حجاب کی توجہ جان پر مبنی ہوئی تھی۔ قند ہادی موجود تھا۔ مقصود اگر ہادی کو دیکھ لیتا تو غصہ ہو جاتا۔ وہ اسے حجاب کے سرال کی انٹیکس میں کئی دن تک دیکھا رہا تھا۔ مقصود شکی مزاج تھا اور گھر میں اکثر ارم کی ساری باتیں لیتا تھا۔ وہ کسی طرح کا شک نہ بھی کرتا اور گھر جا کر کسی کے آگے ذکر ہی کرتا کہ ہادی یہاں موجود تھا تو مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ حجاب کو ہادی کے حوالے سے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔

مقصود بدستور دروازے پر کھڑا تھا۔ حجاب نے کہا۔ "تمہیں کہیں اور بھی جانا ہے۔ منجانی دینے؟"

حجاب نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "وہ میری پریشانی تو بھانپ گئی ہیں مگر میں نے بتایا کچھ نہیں۔ اس صورت حال کے لیے پہلے ذہنی طور پر تیار کرنا ہو گا۔"

فیاض صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "اچھا میں ذرا مسجد تک جا رہا ہوں۔"

جب کہیں کوئی صورت حال گھیر ہوتی تھی وہ اپنا تناؤ کم کرنے کے لیے اسی طرح مسجد کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ وہ ابھی پر ہمیشہ بہتر نظر آتے تھے۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد اندرونی دروازے کی بیل ہوئی۔ حجاب نے پہلے ملازم کو آواز دی پھر اسے یاد آیا کہ وہ تو اب کا خط پوسٹ کرنے گیا ہوا ہے، اس نے خود ہی آنکھ کر دروازہ کھولا اور بھونچا کہ وہ کسی کے سامنے ہادی کمر تھا۔ ایک لپٹے کے لیے حجاب کا دل چاہا کہ وہ دروازہ بند کر دے۔ لیکن ایسا کر نہیں سکی۔ ہادی کے چہرے پر محبت آمیز خوشی تھی۔ جیسے اسے بھی پورا یقین نہیں تھا کہ حجاب سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔

"کیا بات ہے محترمہ! اب اندر آنے کا بھی نہیں نہیں گی۔"

"آ۔۔۔۔۔ جائیے۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آئے سامنے بیٹھے تھے۔ مگر میں اس وقت اور کوئی نہیں تھا اور نہ حجاب کو چادر کا نقاب کرنا پڑتا۔ "یہ آپ کو اس طرح اچانک من بتائے، غائب ہو جانے کی کوئی بیماری ہے؟" وہ بولا۔

"ہر بندے کے اپنے مسائل اور مجبوریاں ہوتی ہیں ہادی صاحب! وہ روکھی آواز میں بولی۔

اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ کچھ دیر پہلے روٹی رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی چاہا۔

چکا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس نے نقاب کیا ہوتا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"مختلف کاموں سے اٹکے ہوئے ہیں۔ آپ کیسے آئے؟"

"بس دو چار دن میں یہاں سے چل چلاؤں ہے اپنا۔ سوچا کہ ایک بار دل آؤں۔ یہ بھی امید تھی کہ شاید آپ سے ملاقات ہو جائے۔ ویسے میرے اندیشے کے عین مطابق آپ کافی پریشان ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے پانی نکل رہا ہے۔"

"بس کوئی مسئلہ تھا لیکن مجھے معاف کیجیے۔ میں آپ سے شیزر کرنا نہیں چاہتی۔"

"آپ شیزر کریں نہ کریں لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ آپ کے زیادہ تر مسئلوں کی بنیاد وہی مس اوم چھتری ہے۔"

حجاب کو ہادی کی یہ دخل اندازی ناگوار گزری تھی۔ وہ ذرا تلخ لہجے میں بولی۔ "آپ کیوں لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے آپ کو؟"

ہادی کا دل چاہا کہ کہہ دے۔ "ہاں خاص بات معلوم ہوئی ہے۔ لیکن پھر گزرا عرف گزاری سے کیا ہو گا۔"

اسے یاد آیا۔ اس نے گزرا کو گزرا دینی دی تھی کہ اپنی اور اس کی ذیل کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔

اس کے سوا اس کی آنکھوں کو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خود کو سمجھا، سنبھلتا، ملاہمت کرتا مگر کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ کہاں سے جڑتے ہیں یہ تاملے؟ کس ہواسے کھلتی ہیں دل کی کلیاں وہ کون سی پگھڑی ہوتی ہے جب دو اجنبی انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور پھر ان کو یا ان میں سے کسی ایک کو لگتا ہے کہ یہاں تو صدیوں کی جان پہچان ہے۔ وہ سوچتا رہتا تھا۔

اُس پہلی رات رستوران میں سے نکلنے کے بعد وہ اس گلی میں داخل نہ ہوتا ساتھ والی گلی سے نکل جاتا تو وہ ہمنوع نہائی گیرا کبھی اس کے راستے میں نہ آتا۔ نہ حجاب اسے روکنے کے لیے اس کے سامنے پھرتی گراتی۔ نہ وہ سب کچھ ہوتا جواب تک ہوا تھا اور جس نے ہادی کی زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ ہادی کے لیے یہ صدمہ ہی کم نہیں تھا کہ اسے چند دن بعد یا ایک دو ہفتے بعد اٹلی چھوڑ کر جانا ہے۔ اب اس میں یہ صدمہ بھی شامل ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے رویے سے حجاب کو بے طرح ناراض کر دیا ہے اور حجاب نے نہایت بے زنجی سے بلکہ تقریباً دھتکار کر اسے گھر سے نکالا ہے۔ وہ ایک تخلیق کار تھا۔ بے حد حساس اور زورورخ، اس طرح کی توہین سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اور اس نے کوئی ایسی سنگین غلطی بھی نہیں کی تھی۔ حجاب ایک بار پھر بغیر کچھ کہے یا بتائے غائب ہوئی تھی۔ چار دن میں اس نے سینکڑوں ہی بار اسے کال کی تھی لیکن رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک سوہوم سی امید کے سہارے وہ انکل فیاض سے بال چلا گیا۔ اس کی سوہوم امید پوری ہوئی تھی اور گھر کا اندرونی دروازہ خود حجاب ہی نے کھولا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی توقع ہادی کو ہرگز نہیں تھی۔ حجاب کا منھائی پھینکا اور لالہ بمبھو کے چہرے کے ساتھ شدید غصے میں ہونا اس کے لیے کبھی بھی تک ہادی کے دل پر آ رہے چار ہی تھی۔

وہ انکل نہیں لیتا تھا لیکن اندر کی حالت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ وہ پہلے بے تحاشہ سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر اس نے ہمنوعوں کے ذریعے بیئر کے دوٹن چھکوائے۔ پھر دو یا سیال اس نے کسی کڑوی دوا کی طرح گلے میں اٹھایا اور پھر کچھ سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ نہ جانے کب ایک روشن پیشانی کا بیچھا کرتے کرتے اسے نیند آ گئی۔

وہ دن پڑھے تک سوتا رہا۔ وال کلاک پر نظر ڈالی گیا رونج رہے تھے۔ جاگتے ساتھ ہی احساس کی پٹی پھر چل پڑی اور اس کے ذہنی پاٹ ہادی کے جسم و جان کو کپکنے لگے۔ لینے لینے اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ اس نے کمر کیوں سے باز نہ رکھا۔ وہ کبھی بلند ہمارتوں اور درختوں کے درمیان بھیڑے روم کا پانی اپنی چمک دکھا رہا تھا۔ جدت کا کھنکھارہا شہر اپنی معرکہ فیات میں گھن تھا۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ اب اس غافل شہر اور اس کے غافل کینوں کو چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ ایک گھڑی سا سانس لے کر اٹھا۔ کمرے میں گھرے ہوئے اپنے سامان پر ایک طائرانہ نظروں سے اور سائینڈ نیکل کی دراز میں سے اپنا پمیدرٹ اور کٹ نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

کئی وقت تھا جب دروازے پر ناک ہوئی۔ اس نے کٹ کا غرضت واپس دراز میں رکھے اور سوچنے لگا کون ہو سکتا ہے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ آہستہ سے بولا۔ ”کوئی؟“

جواب میں پھر ناک ہی سنائی دی۔ ایک مدھم اور شائستہ سی رینگ اس نے دروازہ کھولا اور بھونچکا رو گیا۔ ہانسنے وہ کھڑی تھی۔ براؤن چادر میں لپیٹ لیٹائی۔ نقاب میں سے بس آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔

”جی وڈی باجی! ارم بی بی کی دو تین سہیلیاں ہیں اور ایک ان کی کزن۔“
”تو ٹھیک ہے تمہیں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ ویسے بھی گھر میں اور کوئی نہیں۔“
”نٹھ۔ ٹھیک ہے باجی! اللہ حافظ۔“

اندر سے ہادی جب کھانسنے کی مدھم آواز آئی اور حجاب حزیہ تھلا گئی۔ ملازم مقصود کو دروازے سے ٹال کر وہ واپس آئی۔ ہادی سگریٹ نکال دیکھ رہا تھا۔ حجاب کے ہاتھ میں منھائی دیکھ کر بولا۔ ”کوئی اچھی خبر ہے؟“
حجاب نے منھائی کا ڈبہ تھلا کر پوچھا۔ وہ ایک گلاس کو لینا ہوا قالین پر جا کر۔ وہ طیش آمیز لہجے میں بولی۔
”ہادی صاحب! میں نے ابھی آپ سے ایک گزارش کی تھی۔ پلیز آپ اس طرح دخل اندازی نہ کریں۔ آپ کی ہوج سے میں کسی بڑی مصیبت میں پڑ سکتی ہوں۔ آپ کپلے جائیں یہاں سے۔ جی میرے اور گپ کے لیے بہتر ہے۔“
”اٹھک گیا۔ شاید اسے حجاب سے اپنے لہجے کی توقع نہیں تھی۔“ کوئی غلطی ہو گئی ہے مجھ سے؟“
”غلطی تو مجھ سے ہوئی تھی اس رات جو آپ کے ساتھ وہیں دیکھتے چل پڑی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ اس طرح پیچھے پڑ جانا ہے۔ مجھے دھوڑتے ہوئے یہاں آگے جیسے میں کوئی جرم کر کے بھاگی ہوں۔ میرے گھر پہنچ گئے۔ یہاں اسی کے گھر پہنچ گئے اور ایک دفعہ نہیں بار بار پہنچ رہے ہیں۔ آپ مجھے بتا دیجیے کہ میری غلطی کس طرح معاف کر سکتے ہیں آپ۔“ اس نے آخری الفاظ ادا کیے اور غصے سے تھر تھرا کھپنے لگی۔ اس کا چہرہ آنکھ کی طرح جھکا ہوا تھا۔

ہادی نے بغور اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”سس سوری!“ اس نے کہا۔
”میں بھی سوری کہتی ہوں۔ اور کہیں تو آپ کے پاؤں کو بھی ہاتھ لگا دیتی ہوں۔“ اس نے کہا اور پاؤں ہٹا دی۔
ہوئی ڈرائنگ روم سے اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں آنسو تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اسے پتا نہیں چلا ہادی کب ڈرائنگ روم سے نکلا۔ کب مین گیٹ تک پہنچا اور واپس گیا۔ ہاں اتنا اندازہ اسے ضرور ہو گیا کہ وہ چلا گیا ہے۔ چند منٹ بعد وہ اٹھی۔ قالین پر کھری ہوئی منھائی اٹھائی اور اسے ڈسٹ بن میں ڈالا۔



ہادی ہونٹ کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ظہیر کا فون بھی آیا تھا۔ وہ ہادی کے چند نہ ستاروں کو لے کر ہونٹ آ جا رہا تھا۔ لوگوں کا پروگرام تھا کہ وہ ہادی کو روم کے سب سے اچھے چائینیز رستوران میں ڈنر کرائیں مگر ہادی نے طبیعت کا خرابی کا بہانہ بنا کر منع کر دیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ چند ہفتوں کے اندر روم کی دکان اس لڑکی میں اتنا اتلا ہوا ہو جائے گا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہیں کی وہ پہلی شب اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گئی ہے اور وہ اس شب کے عمر سے کبھی نکل نہیں سکے گا۔ اس ایک روشن پیشانی اور ایک جادوئی مسکراہٹ

ہادی پہلے تو سکتہ زدہ کمزار باپھر اس نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ وہ اندر آگئی۔ ہادی نے دروازہ کھولا۔
حجاب نے اندر آنے کے بعد براؤن چادر کا نقاب تھوڑا سا نیچے کھسکا دیا۔ اب اس کے دلکش چہرے کا قریباً نصف
چوتھائی حصہ نظر آنے لگا تھا۔ "بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہیں گے؟" اس نے پوچھا۔
"بیٹھیں۔" ہادی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

وہ کچھ دیر تک اپنی حنائی انگلیوں کو سرور دیتی رہی پھر آزدہ آواز میں بولی۔ "ہادی کل جو کچھ ہوا میں اس پر بہت
شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یقین کریں میں ساری رات اس کی آواز بھرا مٹی اور آنکھوں میں مٹی
تیرنے لگی۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ سینے میں جلن کی محسوس ہو رہی تھی۔
وہ چند لمحوں کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر بولی۔ "مجھے حاف کر دیجیے۔ میں اپنے حواس میں ٹھیک نہیں
ہادی! میں نے آپ کو اس طرح گھر سے نکالا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ تو یہاں روم میں چند دن کے لیے
ہیں۔ پلیز آئی ایم ریلی ویری سو ری ہادی میں نے آپ کو ہائٹ کیا۔"
ہادی نے گہری سانس لی۔ "میں چند دن کا نہیں شاید ایک آٹھ دن کا یہاں ہوں۔ میں کل تک یہاں سے جا
رہا ہوں۔"

وہ نرم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ حنائی انگلیاں بے ساختہ ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ سرخ سپید
کلائیوں پر بری اور سرخ چوڑیوں کی کھن کھن تھی۔ آخر ہمت کر کے بولی۔ "آپ نے جانا ہے تو ضرور دعا لیں۔ لیکن
میں اس طرح نہیں جانتے دوں گی۔"
"کیا مطلب؟"

"آپ کو ٹھیک ہونا ہوگا۔ بالکل پہلے کی طرح۔ جب آپ جائیں تو مجھے جتنے ہوئے الوداع کہیں۔"
"بھنا آپ نے میرے لیے بہت مشکل کر دیا ہے حجاب! مجھے لگتا ہے کہ اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔"
"میں اپنے سارے الفاظ واپس لیتی ہوں ہادی! اس کے علاوہ بھی آپ جیسے کہیں Apologise کو چاہتے
ہوں۔"

"میں صرف کل کی بات نہیں کر رہا۔"
وہ اپنا نہایت سے بولی۔ "تو پھر بتا دیجیے نا کہ کس بات پر ناراض ہیں آپ؟"
"آپ خود جانتی ہیں حب! آپ نے کہاں کہاں دھکا دے کر مجھے پیچھے بنایا ہے۔ غیروں کی صف میں کھڑا کیا
ہے۔"

"میں کبھی نہیں۔" اس نے کہا اور اپنا ہنسا ہونٹ بولے سے دانتوں تلے دبایا۔
"ہم اتنے روز اکٹھے ایک ساتھ رہے ہیں۔ جگہ جگہ کھو۔ مے ہیں۔ ہر طرح کی باتیں کی ہیں۔ میں نے اس
بارے میں آپ کو تقریباً سب کچھ بتایا ہے۔ لیکن آپ کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا یہاں سے گزرنے والے

سہی راگیر کے بارے میں۔"

"اچھا تاہم۔ کیا جانا چاہتے ہیں آپ؟"

"وہی ایک سوال تو نہیں ہے۔ درجنوں ہیں جو میرے ذہن میں ابھرتے رہے، مجھے کچھ کے لگاتے رہے۔ یہ
سب سوال آپ ہی نے اپنی باتوں سے پیدا کیے لیکن ان کے جواب نہیں دینے اور نہ یہ سوچا کہ میں کس طرح شدید
انجمن میں رہوں گا یہاں بھی اور یہاں سے جانے کے بعد بھی۔"
"چلیں۔ خفیک ہے ہادی! آپ پوچھئے۔ میں آپ کو بتاؤں گی۔" اس کا انداز مغاہمت کا تھا۔
وہ اب بھی خاموش بیٹھا رہا۔

"اب کیا ہے؟" وہ ذرا ادا سے بول کر

"رہتے ہیں حجاب! بات تو وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کو مجبور کر رہا ہوں۔"
"یعنی اسوٹل بلیک میل۔ نہیں حجاب نہیں ہرگز نہیں۔ میں دل کی گہرائی سے سمجھتی ہوں کہ ایسی کوئی بات
بلکہ دوستا ہے کہ اس میں میرا ہی کوئی فائدہ نکل آئے۔ آپ مجھے کوئی اچھا مشورہ دے سکیں لیکن ایک بات
وہ مذہب سے بولی۔

وہ اپنے نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ گھر مناسب نہیں۔ یہاں کوئی آسکا ہے۔ ہم باہر چلتے ہیں۔ کہیں آرام سے بیٹھیں گے۔"
قریباً زینہ کھینچے بعد وہ لوگ وہی کن مٹی کی خوبصورت فضا میں تھے وہی کن کو ایک طرح سے عیسائیت کا سب
سے اہم شہنشاہ جاتا ہے۔ اسے سلیمہ ملک کا پردہ حاصل ہے۔ حالانکہ یہ ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ اس شہر میں سات
نظم ہو۔ قریب نہایت منتخب مذہبی پیروؤں کی گود بامش رکھنے کی اجازت ہے۔ ان میں اہم ترین پوپ ہوتا ہے۔
ان کی کن کا داخلی دروازہ عظیم الشان ہے اور اس کے سامنے ایک نہایت وسیع و عریض احاطہ ہے جس کی اطراف
میں آدھا فٹ بال کے لیے بے شمار مجسمے ایستادہ ہیں۔ یہ مجسمے زمانے قدیم کے مختلف پیٹروں اور بنروں کو ظاہر کرتے ہیں۔
احاطے کے برآمدے میں بلند و بالا دیو پیکل ستونوں کی قطاریں ہیں۔ حجاب بڑے اشتیاق سے ہادی کو یہاں گھماتی
رہا۔ ایک ایک چیز کے بارے میں بتاتی رہی۔ وہ ساتھ ساتھ اپنے آرٹیکل کے لیے نوٹس بھی لے رہی تھی۔ حجاب
کے شوہر جلال اور حجاب کے مزاج میں جو تھنڈا دات تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ جلال کو سیاست اور آثار قدیمہ وغیرہ
سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اسی دوران میں یورپین لڑکیوں کا ایک گروپ آدھرا نکلا۔ یہ سرخ و سپید لڑکیاں بڑے خوشگوار موڈ میں تھیں۔
ان میں سے ایک نے ہادی اور حجاب کو دیکھ کر گے ساتھ اپنا کمرہ ان کی طرف کر دیا۔ غالباً وہ ایک خوبصورت
خاندان کے طور پر ان کی تصویر اٹارنا چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ جوڑا نہیں تھے اور نہ ہی تصویر اتروانے کے موڈ میں تھے
حجاب تو بالکل بھی نہیں۔ اس نے اپنا نقاب درست کیا اور فوراً نہ پھیر کر گھبراہٹ ہو گئی۔ خوش باش لڑکیوں نے ہادی سے
انگنائی کی کہ اگر اس کی ساجھی نہیں تو وہ بھی تصویر اتروالے۔ ہادی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تصویر اتروانے لگا تو

چلتا ہوا اور پھر میری شادی کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ جب میری شادی جلال سے ہوئی اس وقت تک بینش کا کوئی بچہ نہیں تھا اور وہ نارمل زندگی بنی گزار رہی تھی۔ لیکن پھر بدلتی ماحول میں اختلاف بڑھنے لگا۔ پتا چلا کہ فیروز کو فتنی بھرتوں میں دلچسپی ہے۔ اس کی اکثر باتیں گھر سے باہر ٹائٹ کلبوں میں گزرتی تھیں اور وہ اٹلی سے باہر اپنے کاروباری دوروں پر بھی اکیلا نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال کسی بھی بیوی کے لیے قابل قبول نہیں ہوتی۔

بینش میری کزن ہی نہیں میری سب سے گہری سہیلی بھی تھی۔ ہم نے ہوش سنبھالنے ہی ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا اور زندگی کے سارے گرم سرد اکٹھے دیکھے تھے۔ جب بینش کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں آئیں تو اس کا سب سے زیادہ اثر مجھ پر ہی پڑا۔ یوں تو بینش میلانوس میں رہتی تھی اور میں روم میں لیکن ہمارے درمیان فون پر اکثر رابطہ رہتا تھا۔ جب وہ آنسو بہاتی تو وہ میرے دل پر گرتے۔ میں اسے سمجھاتی، بھجاتی اور بہتری کے لیے مشورے دیتی لیکن میں بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ فیروز کی پراپرٹی اور کاروبار اٹلی سے باہر بھی ہے۔ آؤ کئی کے ایک دو چیزوں پر بھی اس نے چھوٹی موٹی جائیدادیں خریدی تھیں۔ وہ اکثر گھر سے باہر رہتا تھا اور اس کے رہنے کا انداز بھی کسی سے مخفی نہ تھا۔ اس کا حوصلہ بھی بڑھ چکا تھا اور وہ بینش کے ساتھ برطانیہ اپنے انجینئر کا اہلکار بھی کرتا تھا۔ ایک روز فون پر فتنی نے بینش کو بڑی طرح چٹا اور وہ والدین کے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد چار پانچ ماہ میں نوبت طلاق تک پہنچی لیکن وہ طلاق بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔ بینش سنکڑوں میں ایک تھی اور فیروز الہ بن ان مردوں میں سے تھا جو گھر کی مرئی والی جوہر تو ضرور سمجھتے ہیں لیکن اسے دال کی طرح پھینکنا نہیں چاہتے۔ وہ ان کی مرغوب غذا ہوتی ہے اور وہ اپنے دست و پاؤں پر ان کی غذا کی خوش کو بھی براہ سجا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ شاید وہی جاگیردارانہ سوچ کا اثر۔ نوبت ایک ملکیت اور اس ملکیت میں انصاف۔ بینش نے برداشت کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد طلاق کا فیصلہ لیا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے خاندان میں کسی کو کوئی لڑکھائیاں نہیں تھیں۔

وہ انھوں میں انھیں دہائی گئیں۔ مگر حالات کا جائزہ لیتے والوں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ ناجائز مطالبہ نہیں ہے۔ بینش طلع حاصل کرنے میں حق بجانب ہے۔ دوسری طرف فیروز نے صاف کہہ دیا کہ وہ بینش کو طلاق نہیں دے گا۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ دوا سے اس باپ کے گھر سے مناکر لے گیا اور وعدہ کیا کہ اپنی روش بدلے گا لیکن حالات میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آئی۔ بلکہ کچھ گاڑی پیدا ہوا۔ وہ شراب میں دھت ہو کر بینش سے مار پیٹ بھی کرتا تھا۔ اسی دوران میں بینش ایک بچے کی ماں بھی بن گئی۔ اٹلی میں قانون کچھ سخت ہیں۔ بینش عدالت سے رجوع کرتی تو اسے بے آسانی طلاق مل جاتی لیکن فیروز ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بینش کو ہر طرح سے ڈرایا وحمکایا۔ چہرہ بگاڑنے کی دھمکیاں دیاں۔ آخر یہاں تک کہہ دیا کہ وہ سات ماہ تک بچے کو لے کر کہیں غائب ہو جائے گا اور وہ زندگی بھر اس کی صورت کو ترستی رہے گی اور اس سے یہ عید بھی نہیں تھا۔ وہ بیوقوفی سب کچھ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بینش نے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور ہر طرح کا جبر سہتے ہوئے فیروز کے ساتھ ہی رہنے لگی۔

ذرا توقف کر کے جواب نے اپنی آنکھوں کے نم کو شے پونچھے اور چاند کا نقاب درست کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ہادی نے پوچھا۔ "بینش کے گھر والوں کا اس معاملے میں کیا کردار رہا۔"

لڑکیاں ایک گروپ کی شکل میں اس کے ساتھ کھڑی ہوئیں اور بڑی خوش خلقی کا اظہار کیا۔ وہی کن کے دست و پاؤں اچالنے سے باہر ایک خوبصورت پارک بیٹھنے کے لیے بہت مناسب تھا۔ یہاں اشوکا کے کھنے درخت تھے اور گلاب کی خوشنما بازوں پر پھولوں کی بلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ایک تنہا فوارے کے پاس پتھر لیے بیچ پر جا بیٹھے۔

"پوچھئے ہادی! کیا پوچھتا چاہتے ہیں۔" وہ خود ہی بول اٹھی۔

"جس! یہ انسانی فطرت ہے کہ جس کے ساتھ اپنائیت اور لگاؤ ہوتا ہے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کے ذمہ کچھ میں شریک ہونے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے شروع سے اندازہ ہوا ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے انکل فیاض اور خالہ سو فیہ بھی بے حد غم میں ہیں۔ خاص طور سے خالہ سو فیہ جبکہ وہ بیمار بھی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق آپ اور جلال میں وہیں بڑھانے میں اس لڑکی ارم کا بھی اہم کردار ہے۔"

"آپ نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی۔ کیا آپ سنے سمجھ دیکھا ہے؟"

"ہاں کچھ دیکھا بھی ہے لیکن آپ کو بعد میں جواؤں گا۔ پہلے آپ مجھے کچھ بتائیں۔ آپ کی مشکلات نوعیت کی ہیں۔ بہت سے سوال کھلاتے رہتے ہیں میرے ذہن میں۔ میں سوچتا ہوں آپ سب کے بارے میں۔ خالہ سو فیہ کی اصل بنیادی کیا ہے؟ یہ ارم کیوں ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس معاملے میں آپ اور آپ کے گھر والے مناسب مزاحمت کیوں نہیں کرتے؟ اور وہ جو تصویر آپ کے گھر میں لگی ہوئی ہے اس کا کیا قصہ ہے؟ جب کبھی اس تصویر کا ذکر ہوا میں نے آپ کے چہرے پر گہرے دکھ کا سایہ دیکھا۔"

تصویر کے ذکر پر واقعی ایک بار پھر جواب کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی۔ وہ فتنی ہی دیر خاموش رہی۔

اندر کی کشش سے نبرد آزما ہو۔ شاید وہیں میں کشش کا یہی وہ لمحہ تھا جب ہادی اُنھ کو مندرل دائرے چلا گیا تھا۔

جواب اُنھ کو غائب ہو گئی تھی لیکن آج وہ اُنھ سے کارادہ نہیں رکھتا تھا۔ آج وہ جواب کی نیم آمادگی کے ان لمحوں کو گھٹا نہیں چاہتا تھا۔

وہ ایک تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر دی پھر دیر سے دیر سے پلٹا شروع کیا۔ "میرے سسرال خاندان کو رائے خاندان کہا جاتا ہے۔ ہمارا خاندان دہلی کہلاتا ہے۔ یہ ایک ہی برادری کی شاخیں ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی رشتے داری نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان میں نہ پاکستان سے باہر۔ کوئی ایسی دشمنی تھی لیکن بس ایک طرح کا کھچاؤ تھا جو شاید ماضی میں زمینوں کے معاملات کی وجہ سے پیدا ہوا ہوگا۔ مگر اب دہلی اور رائے خاندان کی زمینیں ساتھ ساتھ ہیں۔"

بہر حال یہاں روم میں ان دونوں گھرانوں میں پہلا تعلق بینش کی شادی کی صورت میں پیدا ہوا۔ یہ بینش میری وہی کزن ہے جس کی تصویر آپ نے میرے کمرے میں دیکھی ہے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو میرے شوہر جلال کا ایک بھائی فیروز بھی ہے۔ وہ میلانوس میں کارمنش کا کاروبار کرتا ہے۔ جلال کے برعکس وہ ایک آزاد خیال اور میلانی شخص ہے۔ بینش کی شادی قریباً پانچ سال پہلے اس سے ہوئی تھی۔ اس شادی کے بعد ہی دونوں گھرانوں کا آپس میں

پاس ایک سیل فون موجود تھا۔ فیروز آفس چلا گیا تو بینش نے والدہ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا۔ اسی دوران میں فیروز واپس آ گیا۔ وہ اپنا کوئی کاغذ بھول گیا تھا۔ غالباً کوئی نقشہ وغیرہ۔ ذرا مہجور بھی اس کے ساتھ تھا اور برآمد سے اس نے فون کیا۔ فیروز نے بینش کو فون کرتے دیکھا اور تنہا پا ہو گیا۔ اس نے بینش پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے لے کر میز میوں پر پڑ گیا اور چلا یا۔ "میں مار دوں گا تمہیں جان سے مار دوں گا تم دونوں کو ختم کر دوں گا۔" وہ دندنا تا ہوا میز میاں اتر گیا۔

دہشت زدہ بینش نے سمجھا شاید وہ اسٹڈی میں سے ہسپتال وغیرہ نکالنے گیا ہے۔ وہ روٹی بھرتی اس کے پیچھے لگی۔ انہوں نے اس کی ساڑھی کا پلو اس کے پاؤں کے نیچے آیا اور وہ انہیں بیس میز میوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آ کر لی۔ اس کی کمر اور سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ دوسری طرف فیروز آگ بگولا حالات میں باہر پورچ میں آ گیا اور رائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔ اس کے بعد بے ہوش ماں اور شیر خوار بچے کے لیے ایک دردناک صورت حال شروع ہو گئی۔ ایسا واقعہ جس نے سب کو لرز کر رکھا دیا۔ بینش میز میوں کے نیچے سر سے پر بے ہوش پڑی تھی۔ شیر خوار ارسلان پہلے تو بہت دیر قالمین پر بیٹھا رہا۔ پھر رونے لگا اور آنسوؤں کی زبان میں ماں کو پکارنے لگا۔ اس نے بھوک مچی تھی۔ یوں تو گھر میں ایک ملازم اور ملازمہ ہوتے تھے مگر کمر کس کی وجہ سے وہ بھی چھٹی پر تھے۔ گھر میں ماں بیٹے کے سوا اب اور کوئی نہیں تھا۔ انھا ارسلان بھوک سے بیتاب ہو گیا تو ہاتھ پاؤں پر رینگتا ہوا میز میوں کی طرف آ گیا۔ اس معصوم نے میز میوں کے آخری سرے پر اپنی ماں کی جھلک دیکھی ہوئی۔ وہ اس سے دور کیسے رو سکتا تھا۔ وہ تو اس کی ہر مصیبت کا دکھ اور ہر مسئلے کا حل تھی۔ وہ کچھ دیر میز میوں کے اوپر ہی سرے پر زکا سے دیکھتا رہا پھر اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا اس معصوم نے آگے بڑھنا چاہا اور لڑھکتا ہوا اپنی بے ہوش ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بھی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ میز میوں کے نیچے سرے پر تانبے کے گیلے میں ایک ان ڈور پودا رکھا تھا۔ چوکور گیلے کے نیچے انہوں نے گھس کر رو دیا تھا تو ماں کی بے ہوشی۔ نیم بے ہوشی میں بدل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ مکمل ہوش میں آ گئی۔ مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر ہو چکے تھے۔ ایک کھائی ٹوٹ گئی تھی اور ناک منہ سے خون دس رہا تھا۔ اپنے خونچکاں بچے کو دیکھ کر وہ روٹی پکارتی لیکن اس کی اور اس کے شیر خوار کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ باہر برف گر رہی تھی اور کھڑکیاں دھواڑے بند تھیں۔ باہر کے لوگوں سے رابطے کا واحد ذریعہ بس ایک سیل فون تھا اور یہ سیل فون فیروز میز میوں پر پڑ کر ناک کا گڑھ کر چکا تھا۔

مصیبت زدہ ماں کسی طرح رینگتی ہوئی اور اپنے پیچھے خون کے نشان چھوڑتی ہوئی سیل فون تک پہنچی لیکن وہ اس کی تقریر کی طرح اسے دھوکا دے چکا تھا۔ وہ پھر رینگتی ہوئی واپس اپنے بچے کے پاس آئی۔ ماں اور بچہ دونوں نازک حالت میں تھے۔ ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بینش کی کمر کے مہروں پر شدید ضرب آئی تھی، ان میں اوپر کے تین چار مہرے بھی شامل تھے۔ یہی مہرے سانس کی روانی برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی سانس اُکڑتی جا رہی تھی۔ وہ اب رونے چلانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی سانس اور آواز دونوں رک رہی تھیں۔ مگر وہ اپنے معصوم

عجاب بولی۔ "والدہ تو بینش کے تھے نہیں۔ والدہ اور دو بھائی تھے۔ ایک بڑا ایک چھوٹا۔ بڑے بھائی کے ساتھ بھی فیروز کا سخت جھگڑا ہوا تھا اور نویت ہسپتال نکالنے تک پہنچ گئی تھی۔ اس جھگڑے کے بعد فیروز نے بینش کا پیچھا کر میں آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ صرف اس کی ماں کو اجازت تھی وہ کبھی کبھار آ کر مل جاتی تھی۔ بہت کمسن حالات تھے وہ بینش کے لیے۔ اگر میری شادی سے پہلے اس طرح کے حالات کی کوئی جھلک نظر آتی ہوتی تو شاید اس جلی میں میری شادی کے بارے میں سوچا بھی نہ جاتا۔ بد قسمتی یہی تھی کہ میری شادی ہونے تک بینش اور فیروز کے معاملات میں بظاہر کوئی خرابی دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید اختلافات ابھی اس اسٹیج پر ہی نہیں پہنچے تھے کہ چار بھائی سے باہر نکلتے۔" عجب کی آنکھوں میں گہرا غم تھا۔ سب سے پہلے اس نے ستم ظریفی پر ہلکی گہرائیوں سے دھمکے محسوس کرتی ہو۔

"جب یہ معاملات بگڑے تو آپ کو اپنی گھر پر زندگی کے بارے میں بھی اندیشے پیدا ہوئے ہوں گے۔"

"بس مجھے اتنی تسلی تھی کہ جلال کا ذہن اور طرح کا ہے۔ ان کے گھر میں اور ان کے اپنے اندر مذہبی رنگ نمایاں تھا اور اب بھی ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔ "وہ ہنسنے لگی۔" وہ ہنسنے لگی۔ "وہ ہنسنے لگی۔"

"بہن بھائیوں کا رشتہ آسانی سے چھوٹنے والا نہیں ہوتا۔ لڑکی سسرال میں آ جاتی ہے مگر ان کی زندگی کے پچیس سال تو اس کے میکے میں ہی بکھرے ہوتے ہیں نا۔ اگر کوئی سخت دل شوہر یہ توقع رکھے کہ وہ چھ ماہ بعد اندر زندگی کے اس حصے سے ہر رابطہ توڑ لے گی اور اپنے دل و دماغ کو صرف اپنے سسرال اور وہاں سے رکتے رہے۔ یہ محض وہ دکر لے گی تو یہ اس کی بیوقوفی ہی ہے۔ یہ ہو بھی جاتا ہے لیکن اس میں کچھ وقت لگتا ہے۔ دوسری طرف یہ چاہتا تھا کہ سب کچھ آنا فنا ختم ہو جائے۔ بینش بھی کبھار ماں اور بھائیوں سے فون پر بات کر لیتی تھی، فیروز کو یہ بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے بینش کے فون کرنے پر بھی مکمل پابندی لگا دی۔ بینش نے فیروز کی سب پابندیاں قبول کی تھیں مگر یہ پابندی مکمل طور پر قبول کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ پہلی حکم عدولی تھی جو اس نے کی۔ وہ کبھی کبھار چوری چھپے ماں اور بھائیوں سے فون پر بات کرتی رہی۔ درحقیقت بینش کی یہی "جسارت" تھی جو ایک دن اس کی موت کا سبب بن گئی۔ وہ اپنی ماں اور بھائیوں کی آواز سننے کی خواہش میں موت کی ادائی میں اتر گئی۔ اس کے مرنے کی کوئی عمر نہیں تھی ہادی! وہ تو جیسے ابھی زندگی شروع کر رہی تھی۔ پھول سا بچہ تھا اس کا۔ اتنا پیارا کرتی تھی اس سے کہ میں کیا بتاؤں۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی چلے گئے۔ ایک دوسرے کی ہانپوں میں، ایک دوسرے کی سسکیاں سننے ہوئے اور ایک دوسرے کے خون میں لتھڑے ہوئے۔" عجب کی آواز زندہ گئی۔ وہ سسکنے لگی۔ آنسو عجب کے گہرے رینگنے لگے۔

کچھ دیر بعد ہادی نے پوچھا۔ "کس طرح ہوا یہ سب؟"

"وہ کمر کس کے دن تھے۔ دو تین روزہ گئے تھے۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بینش کی والدہ بیمار تھی۔ بینش

میں کوٹھیاں رکھتا تھا لیکن دونوں بھائیوں میں اس بے انتہا فرق کے باوجود کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یہ مطلب ہے۔۔۔۔۔

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے جیسے احساس ہوا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گئی ہے۔ ہلنے لگے اسے زیادہ مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جو کہنے والی تھی وہ کسی حد تک ہادی کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ دونوں بھائی زندگی سے وہ سب کچھ حاصل کر رہے تھے جو کر سکتے تھے۔ فرق صرف طریقہ کار کا تھا۔ ایک تو واقعی آزاد خیال اور زندگی سے ہر طرح کی لذتیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا مذہبی تھا لیکن ہر طرح کی آسائشوں کے حصول کے لیے اس نے بھی قربانییں دی ہیں۔

بیش و اے واقعے نے ہادی کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ واقعی یہ جھجھوڑ دینے والا حادثہ تھا (اگر اسے حادثہ کہا جائے تو) فیروز نے بڑی بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔ بیش کو اتنی سی بات یا جسارت کی خوفناک سزا ملی کہ وہ اپنے گھر والوں سے فون پر رابطہ رکھنا چاہتی تھی۔ حادثے سے چند لمحے قبل وہ بیش کا سیل فون توڑ کر چلا گیا اور یہ سیل فون بیش کے پاس ہی تھا۔ اگر وہ ایسی بے رحمی کر سکتی تو اس نے بیش کی جان بچا سکتی تھی۔ وہ خون کی لہر میں تھک چکا تھا۔

ہادی اور حجاب کتنی ہی دیر بالکل گم سم بیٹھے رہے۔ آخر ہادی نے اس خاموشی کو توڑا۔ "اب کہاں ہے یہ فیروز؟"

"آج کل نیپلز میں رہا کرتا ہے۔ وہی عیاشیاں چل رہی ہیں۔ بیش کی موت کے بمشکل دس ماہ بعد اس نے ہیری شاردن میں کر لی تھی۔ اس کے لیے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہوگا۔ کچھ مرد بڑے پتھر لیے دل والے ہوتے ہیں۔"

"میں سے ایک ہے۔"

"اور جلال؟"

"میں مطلب؟"

"یہ کس طرح کے مردوں میں سے ہے۔" ہادی نے بیباکی سے پوچھا۔

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ وہ تذبذب جو بیش والا واقعہ سنانے سے پہلے اس کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ ہادی نے اسے جس سے اس تذبذب کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ اسے یقین سا تھا کہ اب جب حجاب نے بتانا شروع کیا ہے تو وہ اور کبھی بتائے گی۔ اس کا اندازہ کافی حد تک درست نکلا۔ حجاب نے کہا۔ "جلال بھی سخت مزاج ہیں۔ ایک شکل کی حیثیت سے میں اپنا فرض جانتی ہوں کہ ان کی ہر طرح کی سختی کو برداشت کروں۔ مگر کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کہتی ہیں جو برداشت کے قابل نہیں ہوتیں۔ اس وقت میں سخت لائٹ میں آ جاتی ہوں۔"

"کبھی آپ کا اشارہ ادم کی طرف تو نہیں۔"

اس نے چونک کر ہادی کو دیکھا۔ "آپ بار بار ادم کی بات کیوں کرتے ہیں؟"

"میں آپ کو بتاتا ہوں پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔"

بچے کو بچانا چاہتی تھی۔ اس سوچنے سے جو ثبوت ملے ان سے ہٹا چا کر وہ آخر وقت تک اپنے بچے کو اپنے ساتھ لے کر رہی۔ اس کو اپنا دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے اپنے جسم سے بھی خون رس رہا تھا لیکن وہ بچے کے دم سے خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک ٹوٹی ہوئی تپائی کے پاس بہت سے خون آلود ٹشو پیپر پڑے تھے۔

حادثے کے قریب ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے اپنے جاں بلب بچے سمیت بیرونی دروازے کی طرف ریچھکی کوشش بھی کی لیکن چند لمحوں میں اس نے ہٹ کر رہ گئی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ریڑھ نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ ارسلان کا بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ سات ماہ کے معصوم میں خون ہوتا ہی کتنا ہے۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ ماں نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ کبھی کبھار سے گزری ہوئی۔ ہادی آپ تصور کریں۔ وہ سسکتی تھی۔

ہادی یکسر خاموش تھا۔ وہ بات جلدی (کھینچے ہوئے کربناک لہجے میں بولی۔ "وہ دونوں مر گئے ہادی! پہلے کوں مر اہو گا؟ پورے یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بیش کی بیٹی کے چہرے پر کرب اور ماتم کی جو کیفیت تھی اس کے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے شیر خوار ارسلان نے پہلے دم توڑا۔ فیروز کے اندازے کے مطابق بیش قریباً دو ماہ زندہ رہی۔ اس کی موت دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی۔"

حجاب کی آواز بیٹھ گئی۔ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا مگر سنبھال نہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "ہادی ہادی! وہ دونوں مر گئے سسک سسک کر۔۔۔۔۔ اور وہ دفتر میں بیٹھا اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ برائے کی نقشے دیکھتا رہا۔ اس واقعے کی نیوز میڈیا پر بھی آگئی۔ اخباروں میں بھی شور مچا۔ بہت لے دے ہوئی تھیں۔ اس دور ہنگام موت نے لوگوں کو دہلا کر رکھ دیا۔ فیروز گرفتار ہوا لیکن اگلے ہی روز ضمانت پر رہا ہو گیا۔ اس کے خلاف کوئی فتویٰ ثبوت نہیں تھا۔ اس پر زیادہ سے زیادہ بھرماتہ غفلت کا الزام لگ سکتا تھا۔ وکیل صفائی اسے سراسر حادثہ قرار دے دیا تھا۔ جس وقت فیروز اور بیش میں جھگڑا ہوا اور فیروز نے بیش کا سیل فون سیرکیوں پر پھینک کر توڑا۔ فیروز کا ڈراما

بچے برآمد سے کے ساتھ کامن روم میں کھڑا تھا۔ اس نے عدالت میں سارا واقعہ بیان کر دیا تھا۔ فیروز کو عدالت سے صرف چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ بیش اور ارسلان کی موت ہمارے دلوں پر گہرے زخم چھوڑ گئی۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ جسم روح سے خالی ہو گیا ہے اور میں بس کسی روبوٹ کی طرح چلتی پھرتی رہتی ہوں۔ وہ میرے بہت قریب تھی۔ اس کے بغیر میں نے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی۔ ان دنوں میں نے خود کو گھر میں قریب بند کر لیا تھا۔ میں گھر سے باہر اور روم میں جہاں کہیں نکلتی تھی مجھے بیش کی یادیں بکھری نظر آتی تھیں۔ ہمارا اسکول، ہمارا کالج وہ سڑکیں جن پر ہمارے قدم پڑے تھے دور دستور ان جہاں ہم نے کھانے کھائے تھے اور وہ تفریح کا ہیں جو ہماری بے مثال دوستی کی گواہ تھیں۔

کئی ماہ بعد اپنے گھر اور جلال کے لیے میں خود کو بمشکل سنبھال پائی تھی۔ فیروز، جلال کا بھائی تھا لیکن جلال سے بہت مختلف۔ وہ نت نئے فیشن کے لباس پہنتا تھا، شراب پیتا تھا، کلہوں میں جاتا تھا۔ دوسری طرف جلال ایک مذہبی شخص ہے۔ اس نے کسی بیزیا صاحب کی بیعت بھی کی ہوئی ہے۔ وہ بھی کافی دولت مند شخص ہیں۔ جلال ان کے ساتھ تبلیغی دوروں پر بھی جاتا ہے۔ غلابری طیسے سے لے کر لباس اور رہن سہن تک بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ مذہبی

قید نسبتاً کم قیمت پر بیچنا پڑا۔ یہ گھر بھی جس میں رہ رہے ہیں سمجھیں کہ گروہی پڑا ہوا ہے۔ ابو کو کافی رقم قرض بھی لینا پڑی۔ اس قرض کے بوجھ نے ابو اور بھائی کو کئی طرح دبا رکھا ہے۔

"خالد صوفیہ کی طبیعت اب کیسی رہتی ہے؟" ہادی نے پوچھا۔

"اتنے کا شکر ہے۔ اب ٹھیک ہیں۔" مہمول کی دو انیاں لے رہی ہیں۔ ایک قریبی ہسپتال میں ہفتہ وار علاج بھی کرتی ہیں۔

ہادی کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ ہسپتال کی انتظار گاہ میں بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئی تھیں اور انہوں نے ہادی سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی اس بے ہوشی کے بارے میں ان کے گھر میں کچھ نہ بتائے۔ اس کا مطلب تھا کہ خالد صوفیہ کی طبیعت اتنی اچھی بھی نہیں تھی جتنا جناب بتا رہی تھی۔

وہ کافی دیر ان موضوعات پر بات کرتے رہے۔ ہادی نے کہا۔ "حب! اس روز میں نے آپ سے کہا تھا کہ ارم کی طرف سے آپ کو بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر حد تک جا رہی ہے۔"

"اب ہادی! اس بات کا تو مجھے بھی علم تھا کہ وہ دن بہ دن کھلتی جا رہی ہے اور غرر بھی ہو رہی ہے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنے جتنوں پر اتر آئے گی۔"

ہادی نے اس کی تسلیں آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "حب! آپ نے مجھے ایک اچھے دوست کا درجہ دیا ہے میں اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔" آخر آپ کو اپنے معاملوں میں کسی بھی طرح کا مشورہ یا مدد دے گا تو وہ تو دل و جان سے حاضر ہوں۔ پورے اخلاص کے ساتھ۔"

"نہیں ہادی! آپ نے مجھے بتائے بغیر میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ خطرہ مول لیا ہے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔" میں آپ کو اپنی زندگی کے کانٹوں میں نہیں ٹھیک سکتی۔ یہ جو کچھ بھی ہے اس کا سامنا مجھے ہی کرنا ہے۔"

"کیا تب سمجھ رہی ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ زیادہ اچھا سمجھ رہی ہوں۔ جو زیادہ اچھا ہوتا ہے اس کی سلامتی کا اتنا ہی خیال رکھا جاتا ہے۔ آپ مجھ سے ذرا کم میں شریک ہو سکتے ہیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے اور ہادی! جو کچھ آپ نے بتایا ہے اس کے بعد تو ہمیں اور محتاط ہو جانا چاہیے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دوسرے سے اب نہ ملیں۔ جب تک آپ یہاں ہیں، ہم فون پر بات کر سکتے ہیں۔"

ہادی ایک دم کم سم ہو گیا۔ یہ وہی تاریکی والی کیفیت تھی جس کے بعد جناب ہوش بچتی تھی اور یہاں اس کے ساتھ وہی کم سن ہوئی تھی۔ وہ نظر نایک حساس لڑکی تھی۔ وہ فوراً ہادی کی طرف بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ اس واقعے کے مطابق پرسوں آؤں گی۔ شاید میں آپ کی مدد کروں گی۔ اس کے بعد ہم اس دن ملیں گے جس سے اس کے دن آپ نے جانا ہوگا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ "آپ کسی حد تک کہہ سکتے ہیں وہ ہماری زندگی میں دخل اندازی کر رہی ہے۔" میرے خیال میں دخل اندازی چھوٹا لفظ ہے جب اسے بہت کچھ کر رہی ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے وعدہ کرنا ہوگا کہ یہ بات اپنے تک رکھیں گی۔ ارم سے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کریں گی۔ مجھے کسی سے کشف کر رہی ہے کہ اس کا راز رکھوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں گہرا غم تھا۔ ہر حال اس نے ہادی سے وعدہ کیا کہ وہ یہ بات صرف اپنے ہی محدود ورکے گی۔ اس کی آنکھوں میں اس بات کی گواہی نظر آ رہی تھی کہ وہ بات بھانسنے والی لڑکی ہے۔ ہادی نے مناسب الفاظ میں اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو چند روز پہلے پیش آیا تھا۔ گزاری کا سلسلہ بیان کیا۔ پھر ہادی نے کمرے میں ہادی کا اسے گھیرنا۔ ڈپٹی ہاشم ایک کا آگاہ ہادی کا سب کچھ اٹھاتا اور پھر اس کے ساتھ ہادی کی ہادی نے سب کچھ جناب کے گوش گزار کر دیا۔ ہر حال گزاری کی شناخت اس نے چھپالی۔ وہ بکا بکا سنی ہوئی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت تھی۔

آخر میں وہ قدرے ہر اسان نظر آنے لگی۔ "ہادی! تمہیں اب بھی کوئی ہمارے پیچھے نہیں ہے۔" اس نے دائیں بائیں دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ میں پوری تسلی کر چکا ہوں۔ وہ بندہ بھی معاہدے کی مکمل پابندی کر رہا ہے۔" جناب کو مطمئن کرنے میں ہادی کو دس پندرہ منٹ لگے۔ ہادی نے جو تذکرہ کیا اس کا کاندہ یہ تھا کہ جناب کو اور مکمل مٹی۔ اب تک اس نے بے حد محتاط لہجے میں بات کی تھی مگر اب اس کا لہجہ دلچسپ و ہلکا ہو گیا۔ اس نے ہادی کو تسلیم کیا کہ اس ارم کی وجہ سے اس کی ازدواجی زندگی خطرے کا شکار ہے۔ اس کے ساتھ جلال کا رویہ دن بھر خراب تر ہو رہا ہے۔ اکثر اوقات وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کی سخت توہین بھی کر جاتا ہے۔ وہ حاملہ سے اپنی والدہ کی طرف سے پریشان ہو رہی ہے۔

وہ بولی۔ "والدہ بیمار ہیں اور ان پر یہ حالات بہت برا اثر ڈال سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں بیش والی بات بیٹھ گئی ہوگی۔ ان کے دل میں ہر وقت یہ وہم رہتا ہے کہ کہیں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی نہ ہو جائے۔" جلال بھائی ہے تا فیروز کا۔ میرے خیال میں امی کی تکلیف بڑھانے میں ان سوچوں کا بھی بڑا دخل ہے۔"

"والدہ کی بیماری کیا ہے حب؟" ہادی نے دریافت کیا۔

"ان کے برین میں رسوئی تھی۔ پہلے تو یہ خدشہ تھا کہ یہ کیفر کی کوئی قسم ہے۔ ان کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور بیٹھے بیٹھے ایک دم بے ہوش بھی طاری ہو جاتی تھی مرض کو ڈائیگنوز کرنے کے لیے بہت سے ٹیسٹ ہوئے تھے۔ کریں ہادی! یہ درجنوں ٹیسٹنگوں کے نتیجے میں اس سلسلے میں امی کو دوبارہ علاج بھی لے جانا پڑا۔ اس کے بعد آپریشن کا مرحلہ آیا۔ دو مہینے میں ان کے تین آپریشن ہوئے تھے۔ یہ سارے علاج پہلے کے واقعات ہیں۔ اس سارے علاج معاہدے میں بہت زیادہ خرچا ہوا ہے اب جان کو روم سینٹر میں ایک

چاہائی چلا تھا۔ بس دونوں کا انداز مختلف تھا۔ کیا اس حسین مسکراہٹ والی لڑکی کے ساتھ بھی کچھ ہونے والا ہے۔
 ہاں کی جیس کا چاند اماں کی کافی راتیں نگل لیں گی۔ دوسو چہتا تھا تو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خون رستے لگتا
 تھا۔ وہ اس کے شوق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ ہاں وہ ہو چکا تھا۔ کسی کافی کے بول اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ لیکن
 وہ بے لگن لائی۔

اس کے میل فون کی نکل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف قریب اندام طمبر کی خوش ہاش آواز تھی۔

”اہی بھئی! یہ تو کوئی بات نہیں تم روم میں ہو اور لگتا ہے کہ لاہور میں ہو۔ اور جب لاہور میں پہنچ جاؤ گے تو پھر تو ہم کسی دوسری دنیا کے باشندے کہلا سکیں گے۔ کوئی رابطہ ہی نہیں ہے ہم سے۔“

”نہیں... ایسی کوئی بات نہیں طہیر بھائی! آپ حکم کریں۔“

”ہم نے حکم کیا کرنا ہے حکم تو فساد کرتے ہیں۔ نہ سنا تو صرف التجائیں ہی کر سکتے ہیں۔ پلیز چند منٹ.....“

پلیز چند منٹ۔ ”آنو گراف۔“

”اب آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ اس دن ذرا مصروف تھا۔ اب بتائیے کیا کرنا ہے مجھے؟“

”پہلے بھی نہیں بھائی میرے دوستوں چاہنے والے ہیں تمہارے، بلکہ ایک چاہنے والی بھی ہے، گھبراؤ نہیں بڑی مرکی ہیں یہ تم سے ملنے کے قہقہے کی گپ شپ کریں گے کھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لیں گے۔“

”تو نہیں ہے شام کو آجائے۔“
 ”نہیں... کھانے کے تاہم آؤں گے۔ اور کھانا بھی ان کی طرف سے ہوگا بہر صورت۔“
 ”پہنیں جیسی آپ کی مرضی۔“ (۱۰)

"ایک شرط ہے۔ اپنی کوئی نئی چیز خانا پڑھنے کی قسمیں اور کوئی ڈراما نہیں پلے گا۔ وہ جو محترمہ ہیں انہوں نے کدو کے بیج سے تیر تک پڑھا ہوا ہے۔ جس ادبی نشست میں آپ نے شائقین کو اپنے پرانے کام پر رونا دھنا تھا اس میں یہ موجود نہیں۔"

"اور اگلے ظہیر بھائی کو شش کروں گا۔" ماری نے کہا۔

کہنے کو تو اس نے سچی چیز کا گمہ دیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے کچھ نیا لکھنا ممکن نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بہت کم شیخ صاحب کو ناراض نہ کرتا چلا آ رہا ہوتا۔ وہ بہت بڑے مہربان تھے اس کے۔ ہر نئے بھلے وقت میں کام لےنے والے۔ اس نے یونہی دراز میں سے ایک لاکھ پنڈ نکالا اور اس پر انھیں سے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔ وہ محسوس رہا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ شعر لکھنا نہیں جائے گا۔ لیکن پھر اچانک اس پر انکشاف ہوا۔ اسے لگا کہ وہ لکھ سکتا ہے۔ زیادہ نہیں تو تعویذ ابست کچھ لکھ سکتا ہے۔ وہ کیفیت جو اس نے بہت عرصے سے کھو رکھی تھی۔ آج پھر اس پر طاری ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لکڑی کے دیدہ زیب فرش پر بیٹھنے لگا۔ اس کی طبعی موزوں جو رہی تھی۔ اس نے پہلا شعر لکھا۔ ایک عرصے بعد ایک طویل وقفے کے بعد۔ اس شعر میں اس محبت کا ذکر تھا جو جنگل کا پتھر میں سے ایک شے کی طرح چھوٹی ہے اور تمام رکاوٹوں کے باوجود اپنے من چاہے راستے پر پہنچ سکتی ہے۔ اس کا تعلق جسم سے اتنا

”او کے.....“ ہادی لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

وہ جان چکا تھا کہ حجاب جو کچھ بتا رہی ہے حالات اس سے کہیں زیادہ بُرے ہیں۔ میاں بیوی میں بہت بڑی خلیج پیدا ہو چکی ہے اور اس خلیج میں چال باز ارم اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ سما گئی ہے یا سامنے کی کامیاب کوشش کر رہی ہے لیکن یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا بادی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ ہونا یا نہ ہونا۔ حجاب کے متعلق ادبی کے جذبات وہی رہتے تھے، اچھے یہ لڑکی کون تھی؟ اس کی ازدواجی حیثیت کیا تھی، اس کے مسائل اور اس کے قریب جو اکر کیا تھے؟ ان سب سے قطع نظر بادی کو یہی لگتا تھا کہ یہ صدیوں کا سفر طے کر کے اس تک پہنچی ہے اور کوئی بادی کے اندر صدیوں سے کسی راگبیر پر بیٹھا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنی تمام تر ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں اتر چکی تھی اس کی رگ و پھل میں سمیٹ کر چکی تھی۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہوا تھا کہ اتنے عرصے کے بعد اس وقت میں کوئی دیوانگی کا اتنا لمبا سفر بھی طے کر سکتا ہے۔ تو کیا پھر وہ صدیوں والی بات درست تھی۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ اسے جانتا تھا۔ اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اور تقدیر اسے اس سے ملانے کے لیے نہروں کے شہر و غس میں بھیجی اور اس حادثہ کی شب میں دونوں سر راہ ٹکرا گئے۔

اب سائے نیچے ہونے لگے تھے۔ دینی کن کے عظیم الشان دروازے پر دو گھنٹہ لگے تھے۔ ایک درست وقت بتا رہا تھا۔ یعنی سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ دونوں نے وہیں پارک میں بیٹھے جیسے ریڈی میو لگے کیا تھا۔ پچھن ڈیز اور ساتھ میں کوک کے ٹھنڈے ٹن۔ پلٹوں میں وقت کا کوئی احساس ہی نہیں، دور باتھا۔ میا جون کی ٹولیاں پارک میں چکرا رہی تھیں۔ رومانی جوڑے چہل قدمیاں کر رہے تھے اور ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ سارے جوڑے میں کھڑی میل نہیں تھے۔ آؤ یہ مغربی تہذیب کی اندھی پستی ہے۔

مدھم سی ہوا اٹھانے لگا، شروع ہو گئی تھی۔ اس میں موسسری اور گلاب کے پھولوں کی مہک تھی۔ دور دورے پر پتھروں پر سرد اور سفید کے بلند و بالا درخت لہلہاتے تھے اور ان سے اوپر گہرا نیلا آسمان تھا جس پر پرندے اٹھکھلایا کرتے تھے۔ حجاب بار بار کلائی کی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ ایک اور ملاقات ختم ہونے جا رہی تھی۔ اب انہیں پرسوں کی طرح تھا اور پھر شاید حار مانج دن بعد۔ چنانچہ کیوں باوی اس دن کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اور میز و مین بیٹھ کر واپس آئے۔ اپنے ہوٹل کے قریبی انٹرنیشنل ہادی اتر گیا، عجب بیٹھی رہی اور خدا حافظ کہہ کر آگے نکل گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر بھی ہادی کو بھین نہیں آیا۔ وہ کٹڑی کے فرش پر بے قرار رہی سے ہلکا رہا۔ یہ وہ پہلا اور راتھ خاندان کی کہانی تھی۔ وہ پہلا خاندان کی دولت کیوں کو یکے بعد دیگرے راتھ خاندان میں بدترین حالات پیش آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو جان کی بازی ہار چکی تھی اور دوسری شاید دھیرے دھیرے اس طرف بڑھ رہی تھی۔ آج ہادی نے عجب کی پُرکشش آنکھوں کے گرد حلقے سے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں کے اندر بھی بے قرار شب و روز کی گواہی موجود تھی۔ اس نے اب تک اس گھر میں بہت کچھ برداشت کیا تھا لیکن اب جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ اس کے لیے قابل برداشت نہیں تھا۔ وہ جیسے اندر سے ریڑھ ریڑھ ہو رہی تھی۔ چھوٹا بھائی بھی اسی راہ پر چل رہا تھا جس پر

”حق کو آدھا تو آپ نے خود ہی کر دیا ہے جلال! اس کو پورا کیسے کریں گے؟ اور کربھی دیں گے تو کیسے ہوگا۔“

علیہ مکرم، علیحدہ کار، علیحدہ نوکروں سے تو یہ حق پورا نہیں ہوتا۔“

”میں تم سے لمبی بحثوں میں الجھتا نہیں چاہتا حب! میں چاہتا ہوں کہ یہ کام تم اپنے ہاتھوں سے کرو۔ اس میں تمہاری مرضی نظر آئے۔ مجھے پتا ہے تمہارا یہ رویہ ارم پر بھی بہت اچھا اثر ڈالے گا۔ وہ ہمیشہ تمہاری عزت کرے گی۔ فرمانبردار رہے گی تمہاری۔“

”میں نے ہمیشہ ”آپ“ سے عزت پانے کی دعائیں کی تھیں، اپنی سوکن سے نہیں، آپ یہ سزا کیوں دے رہے ہیں جلال! اگر آپ نے کوئی ایسی سزا دینا ہی تھی تو کچھ برس انتظار کر لیتے۔ شاید کوئی مناسب بہانہ آپ کو مل جاتا۔ اولاد سے محرومی، نرینہ اولاد سے محرومی، میری بیماری موت یا پھر کچھ اور۔ آپ اتنی جلدی مجھ پر یہ ستم ڈھانے پر کیوں آمادہ ہو گئے ہیں۔ اب مجھ سے یہ توقع کر رہے ہیں کہ میں اپنی خوشی سے آدھا حق کسی اور کو سونپ دوں گی۔ صرف اس لیے۔۔۔ صرف اس لیے کہ ڈھائی تین سال میں آپ کا دل مجھ سے بھر گیا ہے اور آپ کو ایک نیا چہرہ اچھا لگنے لگا ہے۔ یہ تو کوئی جواز نہیں جلال! اور اگر ہے تو کیا پھر یہ رعایتیں صرف مردوں ہی کو حاصل ہیں۔ خدا کے واسطے جلال! اسے اپنی کوئی تو گناہ بتائیے۔“

”وہ توقف سے بولا۔ ”جو بات تو ڈھونڈنے سے کئی مل سکتی ہیں حب! ہماری شادی کو تین برس ہو چکے ہیں، ابھی تک تمہاری گود خالی ہے۔ مجھے جلد بچہ چاہیے مجھے مستقبل کے سہارے کی ضرورت ہے حب! تمہاری فیملی میں بے اولاد ہی کا اور دیر سے گولاد ڈھونڈنے کا رجحان ہے۔ تمہاری بڑی بہن کے ہاں شادی کے نو سال بعد اولاد ہوئی ہے اور وہ بھی دو بچیاں ہیں لیکن۔۔۔ لیکن میں ایسی باتوں کو جواز نہیں بنا رہا ہوں حب! اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے؟ کیا تمہاری گود خالی ہی بڑی ہو جائے گی۔ مگر صرف اور صرف بچہ بیان کر رہا ہوں حب! اور بچہ یہی ہے کہ میں اس سے منت کر چکا ہوں۔ ہمیں یہ شادی کرنی ہے۔“

”تو پھر تم یہ کیوں چاہ رہے ہیں کہ میں اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر چھری چلاؤں اور وہ بھی مسکرا مسکرا کر۔ آپ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیجیے۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑ دیجیے۔“

”ایک کام جو مجھے طے پانے سے ہو سکتا ہے اسے نہ منے طریقے سے کرتا کیوں چاہتی ہو۔ جبکہ میں تمہیں پوری کارنٹی دے رہا ہوں کہ میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ تمہاری زندگی پہلے سے بہتر بہتر ہوگی۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ مجھے یہ بہتر زندگی نہیں چاہیے اور اس بات پر بھی راضی ہو جاؤں کہ آپ جو تکلیفیں مجھے فہم دے رہے ہیں وہ دیتے رہیں۔ اس سے زیادہ کچھ دے رہے ہیں۔ پھر دوسری شادی کا ارادہ ختم کر دیں تو پھر؟“

”تم کچھ بحثی کر رہی ہو حب! ہمارا مذہب ہمیں ایک بہت فائدہ مند شیڈیوں کی اجازت دیتا ہے۔“

”اجازت دیتا ہے لیکن انصاف کی شرط کے ساتھ اور انصاف یہ نہیں ہے کہ ایک جیسی گاڑیاں اور ایک جیسی کھانا، انصاف میں سب سے اہم چیز ایک جیسی محبت اور چاہت ہے۔ کیا آپ مجھے اور ارم کو ایک جیسی محبت دے

نہیں ہوتا جتنا روح سے ہوتا ہے۔

اس شعر کو کاندھ پر اتارنے کا سہرا آیا تو نہ جانے کیوں ہادی کو اس قلم کا خیال آ گیا جو حجاب نے وہیں محسوس بطور تحفہ دیا تھا۔ اس نے اپنے انہی کی پاکٹ میں سے وہ قلم نکالا۔ اس کے لمس نے اس کی پوروں کو چھوا تو جیسے انگلیوں سے ایک راستہ چھو رہا اس کے دل تک پہنچ گیا۔ وہ خوش تھا اور حیران بھی۔ سوچنے لگا کیا تخلیق کے بندہ ہر اس پر داہور ہے ہیں؟ اس لڑکی کی بدولت جو کہانوں کے شہر دم کی انگوٹھی میں ایک بے مثال تھینے کی طرح تھی۔



ہادی کے بارے میں اپنے خیالات خود حجاب کی سمجھ میں بھی نہیں آتے تھے۔ وہ ایک بہت پیارے دوست کی حیثیت سے اس کے سامنے آیا تھا اور اس نے اپنی افادیت ثابت کی تھی بہر حال حجاب کی محسوسات میں کسی طرح کی رومانیت کو دخل نہیں تھا۔ وہ بس اسے ایک مخلص اور محبوب ساتھی کی حیثیت سے دیکھتی تھی۔ اس کی طبیعت سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ایک شاعر تھا لیکن ایک مضبوط اور چارہ گر شخص بھی تھا۔ نہ جانے کیوں اپنے ارد گرد ایک مضبوط مرد کی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہر لمحے ہونچے تھے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے بالکل اور طرح کے شخص تھے۔ اس کے ایک ماسوں جو کسی وقت دھبے ہو گئے تھے اب طویل عمر سے بیدار تھے۔ بھائی فیصل ایک دبلا پتلا لڑکا تھا۔ اپنے دفتر میں کام میں مگن رہے وہ لاوارفہ محبت کی ہنگامہ خیز لڑا سے گھبرانے والا۔ ہادی میں حجاب کو کچھ اور طرح کی جھلک نظر آتی تھی، مگر پھر بھی جو کچھ ہوتا تھا وہ بہت ڈرامے والا تھا۔ ارم کی خباثت اب بالکل ختم کر سامنے آ گئی تھی۔ وہ اوجھے جھٹکنڈوں پر اترتی ہوئی تھی۔ اس نے حجاب کے خلاف جو سازش کی وہ ہادی کی وجہ سے ناکام ہو گئی تھیں اس کے خطرات پوری طرح دور نہیں ہوئے تھے۔ حجاب کی طرح جلال تک یہ بات پہنچ جاتی کہ حجاب اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلی ہے، نہ صرف نکلی ہے بلکہ ایک مرد سے ملی ہے تو وہ اس کا بہت بڑا جھگڑا بنا تا اور حجاب کے لیے قیامت پکا کر دیتا۔ حجاب بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ پر سوں اگر ہادی سے ملی تو اسی ملاقات میں اسے الوداع بھی کہہ دے گی کوئی ایسا معقول غدر پیش کر دے گی کہ وہ دوسری ملاقات پر اصرار نہ کرے۔

اس کے فون کی بیل ہوئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ جلال کا نمبر تھا۔ امی کچن میں تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان پر کچھ بھی آکار ہو۔ وہ کال ریسیو کرتی ہوئی محبت پر چلی آئی۔ جلال کی آواز میں بھاری پن تھا اور وہی سنگ سنجیدگی جو حجاب کے دل کی کٹی کو کبھی کھٹے نہیں دیتی تھی۔ رکی کلمات کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا۔ ”تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے حب؟“

”میں فیصلہ کرنے والی کون ہوتی ہوں۔ فیصلے تو آپ ہی کے ہوتے ہیں۔“

”حب! میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہارے لیے میرے دل میں جو جگہ ہے وہاں کوئی اور نہیں آ سکتا۔“

”آپ کے دل میں پتا نہیں کتنی جگہ ہیں۔ میرے دل میں تو بس ایک ہی ہے۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں حب! ہم قیوں بہت خوش رہیں گے۔ میں تم دونوں کو پورا پورا حق دوں گا۔“

وہاں دے رہے ہیں آپ کو آپ انہیں دیکھ لیجئے میں ناشتہ بخواتی ہوں۔
"ناشتہ تو بس تیار ہی ہے۔" فوزیہ نے کہا۔

"چلیں جی! میں بھی تمہارا سا خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھوا لیتی ہوں۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔
فوزیہ نے اسے گھورا، جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو۔ "تمہاری ان چستوں اور پھرتیوں کی وجہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

اسی دوران میں ظہیر بھی فوزیہ کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ "بھئی! وہ میری سرخ ٹائی نہیں مل رہی کہیں بھی....."
ارم چپکی۔ "سرخ ٹائی لگا کر سویرے سویرے کہاں جائیے گا جیجی جی؟"

وہ بولا۔ "میری پیاری سالی صاحبہ! تم نے خود ہی جواب بھی دے دیا ہے۔ سویرے سویرے تو لوگ کام پر ہی جاتے ہیں۔ ہاں شام کے بعد سرخ ٹائی لگا کر کہیں جاتا تو آپ ٹیک کا انکھار فرما سکتی تھیں۔"

"شاموں کو بھی تو آپ جناب نکلے ہی ہوتے ہیں۔ پرسوں بھی آٹھ بجے کے بجائے رات بارہ بجے آئے تھے۔ میں اور باجی بی بی دی دیکھ دیکھ کر بلکان ہو گئی تھیں۔ پھر میں تو سو گئی تھی جا کر۔"

"ہاں اس دن..... اس دن تو ہادی صاحب کے ساتھ ایک نشست تھی۔ ہوٹل واسکوڈے گئے تھے۔ ان کے دو چار بچے سارے ساتھ تھے۔ خوب محفل جمی۔ غیر متوقع طور پر ہادی صاحب نے اپنی دونی نظمیں بھی سنا کیں۔ بالکل فریش، تازہ، تازہ۔"

ہوٹل واسکوڈے کے نام چارم چوکی۔ یہ نام چند دن پہلے بھی اس نے سنا تھا کس سے سنا تھا؟ ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ہوٹل واسکوڈے کا ذکر تو گھڑاری نے کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ جناب وہاں کسی سے ملنے گئی تھی۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

وہ بولی۔ "جیجی جی! یہ ہادی صاحب ہو گئے ہو؟ سنسناہٹ ملنے ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"ہاں۔ کہہ رہے تھے کہ ان کا ایک پاکستانی دوست وہاں ٹھہرا تھا اور اس نے تاکید کی تھی کہ روم میں جا کر ہوٹل واسکوڈے میں ضرور ٹھہرنا ہے ورنہ مجھ سے نہ کوئی نہ ہوگا۔"

ارم ذرا سنبھل کر بولی۔ "ہوٹل میں کہاں قیام ہے جناب کا؟"

"سینٹرل ٹورم روم نمبر 118۔ کچھ تین چار روز میں انہوں نے چلے جانا ہے۔ ملتا ہے تو مل لو۔"

ظہیر بات کرتا کرتا باہر نکل گیا۔ ارم اپنی جگہ گم سم کھڑی رہی۔ اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے ایک توانا فلک بردان چڑھ رہا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ تیار ہوئی اور چھوٹی گاڑی کے گرجوختی نکل گئی۔ ہوٹل واسکوڈے کا ایڈریس اسے ایک ٹورسٹ گائیڈ سے مل گیا تھا۔ مناسب رفتار سے ڈرائیو کرتی ہوئی وہ سڑک کے کنارے گئے کہ جگہ ہوٹل تک پہنچ گئی۔ گاڑی پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ استقبالیہ پر آ گئی۔ یہاں سے ڈرائیو لفٹ سینٹرل ٹورم پر پہنچی۔ کمر نمبر 118

مادھنگ دینے کا ارادہ تھا مگر پھر دروازے پر ڈسٹرب نہ کریں کا بورڈ دیکھ کر وہاں استقبالیہ پر آ گئی اور لابی میں بیٹھ

سکتے ہیں؟ اپنے دل میں جھانک کر دیکھنے کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس میں تمہوڑا بہت فرق آ جائے۔ انہیں جس کا فرق ناممکن نہیں ہوتا۔ لیکن اس صورت حال میں ایک بیوی دوسری کو تمہوڑی بہت رعایت دے سکتی ہے۔"

"لیکن اگر وہ یہ تمہوڑی بہت جی ہاں تمہوڑی بہت رعایت نہ دینا چاہیے تو؟" جناب کا لہجہ آتشیں تھا۔
وہ ذرا توقف لیے بولا۔ "تو پھر دیگر راستے کھلے ہیں۔ وہ علیحدہ ہو سکتی ہے۔"

"بہت خوب جلال! یعنی اگر آپ کو کسی بھی وقت کوئی حسین چہرہ پسند آ جاتا ہے تو آپ اپنی پہلی بیوی کو بھی کریں گے کہ وہ یا تو اپنے حق میں لگی کو تیار ہو جائے یا طلاق لے لے۔ کیونکہ انصاف کی انجمن تو بڑے شرط پوری کرنا اپنی ایک جیسی چاہت دینا آپ کے بس میں نہیں ہے۔"

"یہ سیدھی سیدھی بات ہے۔"

"یہ سیدھی سیدھی بات نہیں ہے۔ ہمارے مذہب میں مرد کو زیادہ شادیوں کی اجازت ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے درمیان انصاف نہیں کر سکو گے اور حالات میں خرابی کی نوبت آئے گی تو پھر دیکھو یہ بیوی کافی ہے۔"

"تم بات کو اور بحث کو بڑھا رہی ہو حسب! اور میں نے یہ وقت تمہیں اس لیے دیا تھا کہ تم بات کو اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔"

"میں کیا کوشش کروں۔ میں اپنے گھر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لٹا دیکھ رہی ہوں۔ وہ جڑ بٹھکتا ہے جلال! وہ نقب لگا رہی ہے ہمارے گھر میں اور آپ نقب لگوا رہے ہیں۔"

"دیکھو حسب! جلال کڑے لہجے میں بولا۔ "میں اس کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کروں گا۔"

"تو پھر مجھے کوئی مار دیجیے۔ ختم کر دیجیے مجھے۔" وہ قریباً چلا اٹھی۔
"اس وقت تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ پھر بات کروں گا۔" جلال نے کہا اور فون بند کر دیا۔
وہ اپنی جگہ بیٹھی لرزتی رہی۔

○.....○

ارم آج کل سارے گھر میں اڑتی پھر رہی تھی۔ ہر کام میں پیش پیش نظر آتی تھی۔ خاص طور سے آپا خانم کے سب کام تو وہ اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ یا اپنی گمرانی میں کرواتی تھی۔ صبح کے دس بجے تھے۔ آج اسے یونہی لگا

جانا تھا۔ سب سے پہلے تو ارم نے آپا خانم کے گھنٹوں پر زیتون کے تیل کی مائش کی۔ ملازمہ کلثوم پاس کھڑی تھی وہ کلثوم کو سمجھاتی رہی کہ مائش اور مساج کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ مائش سے فارغ ہونے کے بعد وہ آپا خانم کے لیے

پرہیزی ناشتہ بخواتی کے لیے کچن میں چلی گئی۔ یہاں اس کی بڑی بہن فوزیہ پہلے سے موجود تھی اور آپا خانم کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔

ارم نے کہا۔ "ہاجی! میرے خیال میں جیجی کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ ان کی کوئی ٹائی نہیں مل رہی۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

"ہوئل واسکوڈے۔۔۔ ہاں۔۔۔ زیادہ دور نہیں ہے لیکن کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"
 "جینے آپ یہاں آ جائیں۔ میں ہوئل کے سامنے موجود ہوں۔ آپ کے لیے ایک بہت ضروری اطلاع ہے۔"
 "نہیں۔۔۔"

"جینے جلال! اور جلدی آ جائیے۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔"

ارم وہاں فٹ پاتھ پر پہنچی رہی۔ اس کی یونیورسٹی کی ایک دوست روبی بھی ٹوڑتے ہوئے وہاں تک گئی۔
 دونوں باتیں کرنے لگیں۔ ارم نے اسے بتایا کہ اس کی باجی کے جینو جی اسے پک کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ
 ان کا انتظار کر رہی ہے۔ اسی دوران میں جلال کی ہرجاڑی دکھائی دے گئی۔ اس نے ارم کو دیکھ لیا تھا۔ ارم کی دوست
 نے خدا حافظ کہتے ہوئے آگے نکل گئی۔ جلال نے گاڑی پارکنگ لائن میں لٹائی اور سیدھا ارم کی طرف آیا۔ "کیا
 آپ کی جینے؟" اس کا لہجہ شیر تھا۔

"آپ کی جینے؟"

"جینے جی؟"

"دوکانی بھائی سے آپ کے شاعر مہمان کے ساتھ مل رہی ہے۔ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔" ارم نے دھماکہ
 خیز اُنکشاف کیا۔

"کیا اول فول بول رہی ہو؟" جلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سیاہ داڑھی کے بال جیسے کھڑت ہو گئے تھے۔

"پورا شہرت مل گیا ہے، اس کے بعد ہی آپ کو بتایا ہے۔ وہ سامنے کافی شاپ میں بیٹھے ہیں دونوں جا کر دیکھ
 سکتے ہیں۔" ارم نے کھڑی ہوں۔ بلکہ میں ہوئل کی الٹی جینے جی کو مطلع کرتی ہوں۔"

دھماکہ کے چہرے پر بیان کی کیفیت تھی۔ وہ غیر متوقع انداز سے ارم کو دیکھتا ہوا کافی شاپ کی طرف بڑھا۔ اس
 نے لمبے لمبے بھرتے ہوئے سڑک کر اس کی۔ پہلے تو اس کا کہ وہ دندنا ہوا اندھا دندنا داخل ہو جائے گا لیکن پھر اس
 نے خود کو راسخ لا۔ شیرانی کا کارڈ درست کیا اور متوازن قدموں سے کافی باؤس میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف
 کافی کی مہک تھی۔ ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ اس نے ہال میں نظر دوڑائی اور فوراً بادی اور حجاب کو پہچان لیا۔ وہ چوکور میز
 پر اسے سامنے بیٹھے تھے۔ بادی کی بات پر غصہ کر رہا تھا۔ جلال کی رگوں میں آگ سی بھڑکتی۔ بہر حال اس نے خود کو
 ہلکا رکھا۔ دھیمے قدموں سے وہ ان کی میز تک پہنچا۔ حجاب نے اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ہراس کی یلغار نظر
 آئی۔ دوسری طرف بادی بھی بھونچکا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پردہ ہٹا کر اٹھا۔

"آئیے۔۔۔ آئیے جلال صاحب بیٹھے۔"

دو خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بادی بولا۔ "دور۔۔۔ دراصل میں چلنے سے یہاں موجود تھا۔ حجاب صاحبہ
 ہلکے کرتی ہوئی آئی ہیں۔ ذرا فریٹش ہونے کے لیے یہاں آئیں۔ میں نے دیکھ لیا اور ان کو انوائسٹ کر لیا۔"

گئی۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل تھی۔ اس کی چمٹی جس تہہ رہی تھی کہ اس پر کوئی اہم انکشاف ہونے والا ہے۔
 ہادی کئی روز تک گھر کی انکسی میں قیام پذیر رہا تھا۔ اب وہ ہوئل میں شفٹ ہو چکا تھا اور اسی ہوئل میں حجاب بھی
 دیکھی گئی تھی۔ ارم کو بار بار نگہداری کا رویہ بھی یاد آ رہا تھا۔ ایک دن پہلے تک وہ اپنی کارکردگی کے بارے میں جلا
 پز جوش تھا مگر اگلے ہی روز اس نے مایوسی کا رنگ الاپ دیا تھا۔ کیا اس تبدیلی کے پیچھے کوئی وجہ تھی؟ وہ سوچتی رہی۔
 اس نے ایک میگزین اپنے سامنے کھول رکھا تھا۔ تاکہ اگر ہادی اپنے کمرے سے نکل کر اپنے آئے تو اس کی نظر فوراً ہی
 اس پر نہ پڑ سکے۔

اس کی یہ احتیاط کارگر رہی، کیونکہ چھائی کا درگزر ہی۔ اسے لابی میں بیٹھے چند روٹیں چھٹی ہی ہوئے تھے کہ ہادی
 لفٹ کے دروازے سے نکل دھمائی دیا۔ ارم نے ڈوڑا رنگ سے دیکھا۔ چوڑے شانے۔ سرد اور کشادہ پیشانی پر
 بالوں کی چند ٹیس جھلکتی ہوئی۔ وہ شاعر کم اور ہیر و پادہ نظر آتا تھا۔ تیار ہو کر نکلا تھا۔ اس نے ہال میں سیدھا سر
 کے ساتھ میز تک ٹائی نگہ رکھی تھی۔ پینٹ بالکل سفید تھی۔ ہاتھوں میں دھوپ کا چتر نظر آ رہا تھا۔ وہ رستہ
 ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا اور میز پر پارکنگ لائن میں پہنچ گیا۔ ارم بھی اُنھی اور دروازے کے
 قریب پہنچ کر اسے باہر جانا دیکھنے لگی۔ وہ پندرہ بیس قدم آگے کیا ہو گا جب ارم کو تہی طرف چونکنا پڑا۔ وہ سکتے زود ہی
 کھڑی رہ گئی۔ اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ وہ سر تا پا براؤن چادر میں لپیٹی تھی۔ نقیب میں سے چہرے کا بہت تھوڑا سا
 حصہ نظر آتا تھا اور اس حصے میں سے بھی کچھ حصے کو دھوپ کے چشے نے اوچھل کر رکھا تھا۔ بہر حال ارم کے لیے اسے
 پہچانا قطعی دشوار نہیں تھا۔ اسے ننانوے فیصد یقین ہو گیا کہ یہ حجاب ہے حجاب اور ہادی کے درمیان مسکراتے کا جلال
 ہوا اور چند الفاظ بولے گئے پھر وہ دونوں پیدل ہی مین روڈ کی طرف بڑھے۔ ارم کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔
 کے پیچھے جانا چاہتی تھی مگر یہ خدشہ بھی تھا کہ ان میں سے کوئی اسے دیکھ لے۔ بہر حال یہ ریسک تو لینا ہی تھا۔ اس نے
 میگزین واپس الٹی کی تپائی پر رکھا اور شوٹلڈریک اٹھا کر باہر نکل آئی۔ وہ دونوں پچاس ساٹھ میٹر تک سیدھے گئے پھر
 میٹرو کے اسٹیشن پر رُک گئے۔ یہاں زمین دوز میٹرو پر بہت بھڑکتی تھی۔ مسافروں کا اضافی جھوم نظر آ رہا تھا۔ لوگ
 یہاں وہاں بیٹھے اور کھڑے ہزاروں کا اٹھار کر رہے تھے۔ ارم نے ایک پولیس والے سے پوچھا اس نے بتایا۔ "کوئی
 ایمر جنسی ہے اس لیے سروس کچھ دیر کے لیے معطل ہے۔"

غالباً کوئی بم وغیرہ کی افواہ تھی۔ اس طرف کی افواہیں گردش کرتی ہی رہتی تھیں۔ یقیناً ہادی اور حجاب کو بھی بتا
 چل گیا کہ وہ ٹرین پر نہیں بیٹھ سکیں گے۔ وہ دس پندرہ میٹر حیاں چڑھ کر اوپر آئے اور سڑک کے ساتھ ساتھ پیدل ہی
 ایک طرف روانہ ہو گئے۔ سامنے ہی ایک کافی شاپ نظر آ رہی تھی۔ وہ اس میں گھس گئے۔ یہ صورت حال ارم کے
 لیے زیادہ موزوں تھی۔

اس نے اپنا فون نکالا۔ نمبر پر لیس کیا۔ "ہیلو جلال! کہاں ہیں آپ؟"

"سنور پر۔۔۔ کیا خیریت ہے؟"

"میرے خیال میں ہوئل واسکوڈے آپ کے سنور سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

”دی جو تم جیسے لالچی کتے سے امید تھی۔ تم نے ارم کو اور حجاب کے خاندان کو بتا دیا ہے سب کچھ۔ تم کسی انسان کی فحش پورہ کی اولاد نکلتے ہو مجھے۔“

”آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ سے جو کنسنٹ کی تھی اس پر قائم ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس سے بڑھ کر بھی آپ کے لیے کچھ کیا ہے۔ آپ اُننا مجھے ہی لگا رہے ہیں۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے کسی کو ایک لفظ نہیں بتایا۔“

”پھر یہ سب کیسے ہوا ہے ابھی ایک گھنٹہ پہلے حجاب کے شوہر نے ہمارا چہچہا کیا۔ ہم ایک کافی باؤس میں بیٹھے تھے وہ وہاں پہنچ گیا۔“

”میں اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں بادی صاحب! اگر کچھ ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔“

”ثبوت تو اب ڈپٹی ہاشم ہی حاصل کرے گا تم سے۔ میں سمجھ گیا ہوں تمہیں اچھی طرح۔ تم لاتوں کے بجوت ہو۔ مجھ سے رقم لے کر یہاں لڑکیوں سے عیاشی کر رہے ہو اور ساتھ ساتھ میری جڑیں بھی کھود رہے ہو۔“

کچھ دیر میں گزاری مت ساجت پر آتا آیا۔ اس نے بادی کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کے لیے کہا اور یقین دلایا کہ اس معاملے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ بادی کوئی ایسا چہرہ شناس تو نہیں تھا لیکن لہجے کے آثار چڑھاؤ اور تاثرات سے جی بھوت کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ دیر سے دیر سے اسے اندازہ ہونے لگا کہ گزاری کی کم از کم اس معاملے میں سچ ہی بول رہا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ جلال الدین کافی باؤس میں کیسے آدھکا۔ یہ بات تو ماننے والی نہیں تھی کہ ایسا اتفاق کے تحت ہوا۔ کیا کسی اور ذریعے سے خبر ہو گئی تھی کہ حجاب نقاب پہن کر ہوٹل واسکوڈے میں آتی جاتی ہے۔

بادی کے اندر شدید تلکرمی کیفیت تھی۔ اسے جلال کی سخت مزاحمتی اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی۔ وہ جس طرح حجاب کو کافی باؤس سے لے کر گیا تھا وہ بھی اندیشہ ہی کو اُنہار تھا۔ وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کو سینٹا حجاب کے لیے کس طرح ممکن ہو گا؟ ایسے اُن گت سوال بادی کے ذہن میں گلبلا رہے تھے۔

گزار نے اب پورا لہجہ میں پہن لیا تھا۔ اس نے بادی کو کولڈ ڈرنک پیش کیا۔ اس کی پیشانی پر بھی ٹیکریں تھیں اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ حجاب کے شوہر تک یہ بات کس طرح پہنچی ہے۔

بادی نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تم نے اپنی کنسنٹ سے بڑھ کر بھی کچھ کہا ہے۔ اس سے کیا مطلب ہے؟“

گزاری کی آنکھوں میں ایک بار پھر عیاری کی چمک نمودار ہوئی۔ دبا دبا جوش بھی تھا۔ بولا ”میں آج کسی وقت آپ کو فون کرنے والا تھا لیکن آپ خود ہی آگئے اور آگئے بھی اس طرح کہ دل ہی تو ڈر کر رکھ دیا۔“

”دل تو تمہارا پھر بھی جڑ جائے گا لیکن اگر حجاب کے ساتھ کوئی کوئی سچ ہو گئی تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا گا۔ اب تاؤ تم کیا بتانے جا رہے تھے؟“

”دیکھیں بادی صاحب! ہر بندے کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارم کی بھی ضرور ہوگی۔“

”شاپنگ ہو گئی حجاب؟“ جلال نے سرولہجے میں پوچھا۔

”جج..... جی..... تمہوڑی بہت..... ابھی امی کی دو انیاں لپٹی ہیں۔ ایک دو انی تو مل ہی نہیں رہی۔ گوشتیں اس کے ہاتھ لڑ رہے تھے۔“

”اگر تم یہاں پہنچنا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں میڈیسن اسٹریٹ کی طرف ہی جا رہا تھا۔ وہاں سے دو اگلے گلی اور کپڑے تو میں گھر بھی چھوڑ آؤں گا۔“

”ٹھنڈے..... ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہیں۔“

اسی دوران میں بادی کے اشارے پر بروڈر کولڈ کافی نے آیا تھا۔ کافی کاگ ختم کمنے میں جلال نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ یہ دوران یہ ایک گمبیر خاموشی میں گزرا۔ آخر میں جلال نے کافی کے لیے بادی کا شکریہ ادا کیا اور حجاب کو لے کر وہاں سے نکل آیا۔

بادی آگ بگولا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب گزاری کا کیا دھرا ہے۔ اس نے معاہدہ توڑا ہے۔ وہ دندناتا اس بلڈنگ میں داخل ہوا جہاں گزاری کا اپارٹمنٹ تھا۔ یہ جگہ حجاب کے سینکڑوں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اب دن کا ایک بج چکا تھا۔ بذریعہ لٹ ہادی مطلوبہ اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچا۔ اس نے کال بلی دی۔ تیسری چوٹی بلی، دروازہ کھلا اور ایک دہلی پتلی دروازہ لڑکی نظر آئی۔ وہ خاموشی میں عرصے میں مشکل سترہ انچہ سال کی دہلی ہو گئی۔ اس کے کندھے پر بیک تھا اور وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھی۔ ”گزار کہاں ہے؟“ بادی نے جیسے کچھ نہیں سمجھا۔

”وہ سو رہے ہیں۔ آپ کون؟“ اس نے بھی انگلیش میں پوچھا۔

اتنی دیر میں دوسری طرف والے کمرے میں روشنی ہوئی اور بادی کی نظر گزار پر پڑی۔ وہ بستر میں تھا۔ بالائی دھڑ عریاں تھا اور سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ بالکل جیسے کسی گوریلے کا جسم ہو۔ بادی کو دیکھ کر وہ بادی طرح چونکا۔ پھر اس نے چادر کے نیچے ہی نیچے اپنے ہاتھوں کو منکھوک حرکات دیں۔ ان سے اندازہ ہوا کہ وہ سرخا عریاں ہے اور چنڈی وغیرہ ممکن رہا ہے۔ تب وہ لپک کر بستر سے باہر آیا۔ اس نے شرٹ پہنی تھی۔ لڑکی نے سادھے نظروں سے گزار کی طرف دیکھا۔ گزار نے اطالوی میں اس سے کچھ کہا۔ یقیناً جانے کے لیے ہی کہا تھا۔ وہ مسکراتی اور ہاتھ ہلاتی باہر نکل گئی۔ چھوٹے قد کے گزاری کے مقابلے میں وہ کافی لمبی تھی۔

بادی کے تاثرات دیکھ کر گزاری کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ ”گزاری! تم نے کیوں کیا ایسا؟“ بادی نے پڑٹیش لہجے میں پوچھا۔

”م..... میں سمجھا نہیں۔“

بادی نے اس کا گلا پکڑ لیا اور دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے لیے اچھا نہیں

ہوگا..... میں نے کہا تھا۔“

”مگر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ کراہا۔

میں آج کل اسی کی کھونج میں لگا ہوا ہوں۔ ایک تھوڑا سا اشارہ تو ملتا ہے مجھے۔

”مثلاً کیا؟“

”یونیورسٹی کے جس کیمپس سے ارم نے ایف آئی اے کیا تھا وہاں کی تک شاپ کے مالک سے میری پہچان ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ارم تین چار بار ایک ایملین لڑکے کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی سرپرستی، جھگڑا چل رہا ہے۔ وہ بہت بولتے تھے ایک مرتبہ ارم فرش پر ایک پیٹ بچ کر باہر بھی بھاگی تھی۔ میں اسی معاملے کی فوٹو گاہک ہوں۔“

ہادی نے گلزار کی عیار آنکھوں میں دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ گلزار جو کچھ بتا رہا ہے اس سے زیادہ جاننا ہے۔ مگر وہ اپنے لفظوں کی قیمت لگانے والا بندھ تھا۔ ہادی کے لیے یہ لاپٹی شخص بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا مگر شرا بھی تھی کہ اس کی بیڑی چارج رکھنے کے لیے اسے پورا پورا دل دینا پڑے گا۔ پورے سے بھی زیادہ کرنٹ ملتا ہے۔ ہادی کی جیب میں کچھ رقم موجود تھی۔ اس نے کل اتنی قریب پانچ ہزار یورو شیو صاحب سے بذریعہ منگوائے تھے۔ اس نے بلا توقف قریباً دو ہزار یورو گلزاری کی جیب میں منتقل کر دیئے۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس سے پہلے وہ ارم سے ترے منت کے ساتھ دو سو تین سو یورو حاصل کرتا تھا۔

گلزاری کا چہرہ جوش سے ختم کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ صرف ایڈوانس ہے۔ کاروبار ابھی شروع دینے پر اسے تھوڑی سی لے گی اور وہ کافی بڑے اور گودے سے بھر پور ہوگی۔ اس نے ہادی سے کہا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ تک شاپ والے سے ایملین لڑکے کا اپنا تو مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے ایک دو دن میں آپ کو کوئی اہم اطلاع دے سکوں گا۔“

ہادی نے کہا۔ ”اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سارا معاملہ اب تیزی سے بگاڑ کی طرف ہے۔ مجھے حجاب کی طرف سے بہت زیادہ فکر ہے۔ وہ بے قصور ہے پھر بھی سخت مصیبت میں پھنس سکتی ہے۔“

○.....○

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ حب بے شکل کہہ پائی۔

”درس والے گھر۔“ جلال نے مختصر جواب دیا۔

درس والے گھر کا نام درس والا گھر بتائیں کیوں پڑ گیا تھا۔ روم ویسٹ کے نسبتاً کشادہ اور مضافاتی علاقے میں یہ دو خانہ تین کینال کی کوٹھی تھی۔ پرانی تعمیر تھی لیکن جگہ اندر سے بھی ستوری تھی۔ یورپ کی اکثر عمارتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ باہر سے ان کی قدامت کو برقرار رکھا جاتا ہے لیکن اندر سے جدید بنا دیا جاتا ہے۔ جب ابھی جلال الدین اور محمد الدین کا کاروبار پوری طرح چکا نہیں تھا وہ ایک بار پائش پڑے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے فیشن اسٹیل علاقے میں ٹھکانا گھر بنوایا تھا۔ اس پرانی کوٹھی میں کبھی کبھی جلال کے چہرے پر محفل جھلک جاتا کرتے تھے شاید اسی لیے اسے درس والی کوٹھی کہا جانے لگا تھا۔ اب یہ محفل والا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔

حجاب کو یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اسے درس والی کوٹھی کیوں لے جا رہا ہے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ کوٹھی

”میں جلال نہیں۔“ وہ کرب میں ڈوب کر بولی۔

دو ٹیکہ..... تم دنیا کی کوئی پہلی عورت نہیں ہو جس کا شوہر دوسری شادی کر رہا ہے۔ ایسا ہونا آیا ہے۔ ہمارے
 ماحول میں، تمہارے خاندان میں۔ ہمارے ارد گرد وائس بہت سی مثالیں ہیں جب دو بچے، تین بیویوں والی فیملی نے
 بھی بڑی خوشنوبر زندگی گزاری ہے۔“

”اگر ایسی چانچ مثالیں ہوں گی تو دوسری طرف چچاس مثالیں بہت بُری زندگی کی بھی ہوں گی لیکن مجھے کسی اور سے کیا لینا ہے جاؤ! میں تو اپنی اور آپ کی بات کر رہی ہوں۔ میں آپ کو تسلیم نہیں کر سکتی۔“

وہ ایک جان غسل و قفے کے بعد بولی۔ "اگر کوئی اور راستہ نہیں تو مجھے آزاد کر دیجیے۔"

ایک زوردار تھپھر حجاب کے گال پر پڑا اور اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے تاج گئے۔ کان میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر جلال کی طرف دیکھا۔ تب دوسرا تھپھر دوسرے رخسار پر پڑا۔ وہ چکرا کر کرسی سے گری۔ جلال نے اس کی پینہ پر ٹھوکریں رسید کیں۔ اسے لگا جیسے کرنچ کر رہ گئی ہے۔ "جلال..... جلال" وہ جیانی جباری تھی۔ اس نے خود کو ٹھنڈی سا بنا لیا اور اپنے جسم کے نازک حصوں کو اس کی ٹھوکروں سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے اسے ہالوں سے کچڑ کر نہایت بیدردی سے کھینچا اور اٹھا کر صوفے پر بیٹھ دیا۔ "اب بھی یہی بکواس کر کہ تم انیت میں کوئی نور نہیں۔ وہ عمیرا بھائی ہے جس کے ساتھ نقاب چڑھا کر گھومتی پھرتی ہے۔" ٹو نے سچ نہیں بولا لیکن تیرے ارادوں نے سچ بول دیا ہے۔ تجھے آزادی چاہیے۔ طلاق چاہیے تاکہ ٹو کوئی نیا سفر شروع کر سکے۔ میں تجھے ہر لمحہ ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔"

"خدا کے لیے جلال! خدا کے لیے..... مجھ پر ایسا اصرار نہ کرنا۔" وہ صوفے سے اٹھ کر اس کے پاؤں پر گر پڑا۔

اس! ایک غصیلے بھٹکے سے اپنے پاؤں پیچھے بنائے اور دو تین قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دبے ٹھکی رہی۔ جگہیوں سے روٹی رہی۔

وہ فیملی کن، پات وار آواز میں بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر تو آزادی چاہتی ہے تو میں تجھے آزادی دینے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے یہی چاہیے، قیدی یا سزائے موت۔“ میرے لیے سارے دروازے کھلے ہیں اور راستے بھی۔“ وہ مڑا اور باؤں پختہ ہوا ہر نکل گیا۔

تھوڑی سی دیر بعد وہ اس کی ہمرکازی اشارت پر ہونے کی آواز سن رہی تھی۔ وہ جا رہا تھا۔ وہ اس کے لیے مکلف سے دروازے کھلے چھوڑ گیا تھا اور سارے راستے بھی لیکن وہ جانچی تھی کہ جو نظر آ رہا ہے وہ ہے نہیں۔ سارے علاقے کھلے تھے اور نہ سارے راستے۔ وہ آٹن دیکھیں زنجیروں میں بندھی ہوئی تھی۔ اور یہ معاشرتی نہیں، معاشی زنجیریں تھیں۔ خواب کے ابواب کے پورے قرضے کے پوچھنے دے تھے۔ عماما اندازے کے مطابق قریب ایک لاکھ

میں تھے۔ کوٹھی رہائش کے لیے بروقت تیار رہتی تھی۔ جلال اور ظہیر کے کاروباری مہمان بھی یہاں آ کر ٹھہر جاتے۔ چوکیدار، خانسامان، کام کاج والی ملازم سب کچھ یہاں موجود تھا۔ پچھلے سال جب نئے گھر کے رنگ اور فن رے رہے تھے جلال اور نجاب چند روز یہاں رہے تھے۔ لہذا تعجب کو کچھ اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔

انہوں نے بیڈ روم میں چائے پی۔ چائے کے فوراً بعد جلال اصل موضوع پر آگیا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" حسب کے دل میں چونکہ کوئی چور نہیں تھا لہذا اس کے لہجہ میں توانائی آگئی۔ اس نے کہا۔ "جلال! اصل آپ کے سامنے زیادہ وضاحتیں پیش کروں گی۔ ایک مرتبہ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ اگر مورت پر سے پردے میں ہو اور اس کا دل بھی پردے میں ہو تو کچھ کسی کے ساتھ ملنے جلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ مجھ پر پورا بھروسہ رکھیں۔ میں پردے میں تھی اور میرا دل آپ سے بھی زیادہ پردے میں تھا۔"

”کیسے ملاقات ہوئی؟“

"بس اتفاقاتی سمجھ لیجئے۔ سر راہ" وہ بولی۔ "بادمی صاحب روم میں گھومنا پھرنا چاہ رہے تھے۔ مگر کچھ دیر نہ کرنا چاہا رہے تھے۔ میں بھی آرنیکل لکھ رہی ہوں۔ ہم دو تین جگہوں پر اکٹھے گئے۔ میں یڑی سے یڑی دمکتی ہوئی یہ ایسے ہی تھا جیسے میں ماریہ کے ساتھ گھومنے انگوٹیاں یا نعلین کے ساتھ نکلوں گا۔"

"لیکن..... تمہیں مجھ سے اجازت تو لیننی چاہیے تھی۔"

”یہ میری غلطی ہے۔ میں اس کے لیے سوری کہتی ہوں۔ دراصل آپ کا دُعا اتنا عمدہ تھا کہ...“

”اچھا... چلو چھوڑو ان باتوں کو۔“ جلال نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

جب وہ اس طرح بات کرتے کرتے اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اپنے ہاتھ کمر کے پیچے باندھ لیتا تھا تو اس کی یہی ہوتا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کہنے جارہا ہے۔ وہ گنبد سر پہنچے جس بولا۔ "تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے جب؟" وہ تو وقف سے ہوئی۔ "مم..... میں نے کیا فیصلہ کرنا سے جلال؟"

”حسب! مجھے ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔ تم ہنسی خوشی یہ کام کر رہی ہو یا نہیں؟“

حجاب کا سارا جسم پسینے میں نہما گیا۔ وہ بالکل بے رحم ہو گئی تھی۔ وہ خشک لیوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”جہاں آج آپ مجھے اس طرح فیملی کے سولی پر کیوں لٹکا رہے ہیں مجھ پر ترس کھا ہے۔“

”بچوں جیسی باتیں نہ کرو جب! تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کام ہونا ہے اور ہر صورت ہونا ہے۔ مگر کام کا ایک شیڈول ہوتا ہے۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ تم نے ہاں یا نہ میں جواب دے کر جانا ہے کہ یہ کام ہنسی خوشی ہو گا یا رو پیٹ کر۔“

خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا۔ وہ یوں سانس لے رہی تھی جیسے کوئی اس کا کما و پارا ہوا ہو۔ آخر وہ ہلکی ہو کر بولی۔
 ”جہاں! میں اپنے دل کا کیا کروں۔ یہ آپ کو کسی کے ساتھ بانٹنے کے لیے تیار نہیں۔ میں آپ کا ہر دم سہہ سکتی ہوں۔
 پریشان نہیں..... یہ نہیں جہاں!“

”میں تمہیں برصغیر دے کر کو تیار ہوں۔ تمہاری من چاہی برابر تیری تمہارے نام کر سکتا ہوں۔ یا جو تم چاہو۔“

مہ شاید یہ کافی باؤس والا واقعہ نہ ہوتا تو جلال اسے کچھ مزید مہلت دے دیتا۔ یوں اس سے ہاں یا نہ میں فوری جواب نہ مانگتا۔

لیکن ایسا تو بھی جاتا تو کیا ہوتا؟ کیا وہ اس صورت حال سے بچ جاتی؟ نہیں یہ تو ممکن نہیں تھا۔ آج نہیں تو کل یہ ہوتا ہی تھا۔ وہ طریقہ کار طے کرنے لگی کہ امی ابو اور بھائی کو کس طرح اس صورت حال سے آگاہ کرے۔ اب کچھ بھی چھپاؤ ممکن نہیں رہا تھا۔

شام سے پہلے ہی وہ امی کے گھر پہنچ گئی۔ فیصل کا چہرہ دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ "کیا ہوا فیصل؟"

فیصل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جواب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سر گھٹی میں بولا۔ "امی کی طبیعت خراب ہے۔ ابھی آئینشن لگایا ہے۔ سو رہی ہیں۔"

جواب نے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا اور اس کا دل ہول گیا۔ وہ سیدھی لپٹی تھی۔ رنگ ہلکی ہو رہا تھا۔ غور سے اس کا کھلا ہوا تھا۔ اس نے بولے سے دروازہ بند کر دیا۔ فیصل اسے اسٹڈی کی طرف لے آیا۔ خلاف توقع وہاں موجود نہیں تھے۔ چائے کے تین چار خالی کپ پڑے تھے۔ الٹش ٹرے میں سگریٹ کے بہت سے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ "اب کہاں ہیں؟" جواب نے پوچھا۔

"دو پہر سے نکلے ہوئے ہیں مگر نہیں گئے۔"

"تم نے پوچھا نہیں؟"

"وہ بتاتے ہی کب ہیں باقی ایسا تو اس طرح کے مسئلے بھی نہ ہوں۔ ہر بات بس اپنے پر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"کیا مطلب فیصل؟"

"چھوڑیں آپ بھی پریشان ہوں گی۔ پہلے ہی لگ رہی ہیں۔"

جواب نے اسے گندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھمیا۔ "فیصل اچھے صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟"

وہ ذرا توقف سے بولا۔ "صبح نو دس بجے ایک فون آیا تھا۔ اس کے بعد بالکل گم سم ہو گئے۔ مسلسل سگریٹ پیتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد غالباً وہی فون دوبارہ آیا۔ اس بار دو چار باتیں میں نے بھی سنیں۔ یہ جلال بھائی کے لکچر کا صاحب کا فون تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ انہوں نے اپنے سے قطع کے بارے میں کہا ہے اور زور دے کر کہا ہے۔"

جواب کی ریزہ کی ہڈی میں سر دلہر دوڑ گئی۔ کیا اندیشہ تھے جو جواب کے لیے سوہان روح بنے رہتے تھے۔ پھر ماہ پہلے قرض کی ادائیگی کے لیے جواب کے ابو اور جلال میں کچھ طے ہوا تھا۔ اس کے مطابق جلال نے قرض کی ادائیگی قسطوں میں کر دی تھی۔ وہ اسے آسان قسطیں کہتا تھا لیکن وہ انہی آسان قسطیں بھی نہیں تھیں ایک تہائی رقم جواب کے گھر والوں کو چار ماہ بعد ادا کرنا تھی۔ باقی چار قسطا میں۔ کجرات میں ابونکی ٹھکانے کی ورثاتی زمین موجود تھی۔ وہ اسے بیچ کر قرض کی کوشش کر رہے تھے۔ امید تھی کہ وہ دو تین ماہ میں بک جائے گی مگر ایسا ہو نہیں سکا تھا۔ سنا بیچنے کی کوشش بھی

نوں ہزار یورو اور قرض خواہ کون تھا؟ قرض خواہ ان کا داماد تھا۔ جلال الدین تھا۔ وہ سکتا زدہ بیٹھی تھی۔

وہ ساری رات جواب نے سوتے جاگتے میں گزار دی۔ توقع کے عین مطابق جلال واپس نہیں آیا تھا۔ جلال کا ہمد اس کی ضروریات کے لیے اس کے ارد گرد موجود رہی۔ جواب کے ذہن میں رو رہا یہ خیال آ رہا تھا کہ جلال کو وہاں کافی باؤس میں پہنچانے والا کون تھا؟ ہادی نے تو بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ اہم والی سازش اس نے کام بنادی ہے۔ یہ بات بھی ہرگز ماننے والی نہیں تھی کہ یہ ایک اتفاق تھا۔

جواب کا دل بالکل صاف تھا اس لیے اسے کوئی شرمندگی نہیں تھی لیکن جلال نے جو رد عمل دکھایا تھا اس نے اس کی روح تک کو شرمسار کر دیا تھا۔ اس نے وہ طرح کا رد عمل دکھایا تھا۔ ایک تو اسے مارا پچا تھا دوسرے فوری طور پر اس سے ہاں یا نہ میں جواب مانگ لیا تھا۔ یہ تو ایک آف نورٹن والی بات تھی۔ جواب کو ستر پکڑ کر لے لینے سے تکلیف ہو رہی تھی۔ جلال کی بے رحم ٹھوکروں کے نتیجے میں اس کی پوری کمرہ ڈھکی تھی۔ شادی سے پہلے ہی اسے اور یہی جسم تھا۔ جس کی تعریفوں کے بل باندھے جاتے تھے۔ تھی جندی ختم ہوا تھا یہ سب کچھ۔ حالانکہ وہ وہاں تھی بلکہ شاید جسم کی سوزنیت پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور اس کے سینے میں دھواں بھرتا رہا۔ گاڑھا دھواں۔ اس دھوئیں میں چنگاری تھی۔ بلکہ اب یہ ایک نہیں کئی چنگاریاں تھیں۔ آگ نے جب شعلے کا روپ دھارنا ہوتا ہے تو چنگاریاں بڑھ جاتی ہیں۔ زیادہ ہر حرارت ہو جاتی ہیں۔ وہ پامال ہو رہی تھی۔ بالکل دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا جا رہا تھا۔ اب ایک ہی راستہ تھا غیبت کی کاٹھن کیا وہ اسے یہ راستہ اختیار کرنے دے گا؟

وہ اپنے ماں باپ کو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی مگر اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اسے صاف ہلا کر رکھا تھا کہ اگر وہ اسی طرح جیتی رہی جس طرح جلال چاہ رہا ہے تو وہ مر جائے گی۔ بہت جلد اور بڑی اذیت سے۔ اس نے شام کو ہی پر گرام بنا لیا تھا کہ گھر چلی جائے۔ امی ابو کے پاس۔ لیکن پھر اس نے آئینہ دیکھا۔ قلم چہرے پر طمانچوں کے سرخ نشان تھے۔ وہ ہمیشہ ان نشانوں کو چھپاتی رہی تھی۔ اب بھی چھپانا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے رات میں یہیں درس والی گھٹی میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

صبح سویرے وہ کرائی ہوئی انٹھی۔ ایک بار پھر آئینے میں چہرے کا معائنہ کیا۔ کئی بار زخموں پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ابھی اسے کچھ اور انتظار کرنا تھا۔ اسے پتا تھا کہ امی ابو پریشان ہوں گے۔ جلال جس طرح آگاہ اسے یہاں لے آیا تھا وہ ضرور چوڑے ہوئے ہوں گے۔ اس نے سوچا انہیں کال کر لے۔ اس نے ٹھنڈے بیک میں سے فون نکالا۔ مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ اسے پتا تھا کہ وہ فون کر کے انہیں ابھی سے پریشان کر دے گی۔ پھر اسے ان کا خیال آیا جو ہادی اور اس کے درمیان ہوتی رہی تھیں۔ اس نے ان کا ٹر کاریکارڈ Delete کیا۔ ایسا کرنے ہوئے وہ ہادی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ کیوں جندی واپس نہیں چلا گیا تھا۔ کیوں اس کے ارد گرد منفذ لگتا رہا تھا۔ وہ جانتا بھی تھا کہ اس کے حالات کتنے خراب ہیں پھر بھی اس سے بچ کر اصرار کرتا رہا اور وہ بھی اس کے اصرار کی مزامت نہ کر سکی۔ اسے ہادی پر غصہ آنے لگا۔ اور اس سے زیادہ اپنے آپ پر

کچھ بتاؤ۔ کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہو گئیں؟

فیصل کے دلے پتلے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ پہلے تو چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے تم جھکوں کے ساتھ بتایا کہ ایسا ہوا ہے۔ وہ چار پانچ منٹ کے لیے Sence Less ہو گئی تھیں۔

جواب کا دل ڈوبنے لگا۔ آپریشنز کے بعد ڈاکٹرز نے یہی کہا تھا کہ ان پر پھر سے بے ہوشی کا طاری ہونا اچھی بات نہیں ہوگی۔ اور اگر ایسا ہوا تو انہیں فوری طور پر ہسپتال سے رجوع کرنا چاہیے۔

فیصل نے جواب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”باجی! آپ ٹینشن نہ لیں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر انکل کہہ رہے تھے کہ میڈیکیشن سے ہی صورت حال بہتر ہو جائے گی۔ بس ان کو خوش رہنا چاہیے اور ہوشی و باؤنٹس لینا چاہیے۔“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے فیصل۔“

”باجی! آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ مجھے زیادہ ڈر اسی بات کا تھا کہ کہیں جلال بھائی اور آپ کے درمیان پھر کئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔ آپ بس کوشش کر کے ادھر کے حالات بہتر رکھیں۔ کوئی اچھا موقع دیکھ کر جلال بھائی سے مل کر لیں۔ تین چار ماہ اوپر جاؤ تو مجھے یقین ہے کہ گجرات والی زمین کا سودا ہو جائے گا صرف بیچنا ہی ہو گا تو کس کی بات ہوگی۔ جلال بھائی کو اطمینان ہو جائے گا کہ قسط مل جائے گی۔“

جواب صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ فیصل کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کے اندر سسٹکے دلی عزامت کی چنگاریاں مالا مال ہو رہی تھیں۔ توانائی کی جگہ ایک عجیب سی نقابت رگ و پے میں اتر رہی تھی۔ شاید وہی نقابت جو ازل سے عورت کا اندر رہی ہے۔

فیصل نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں باجی! ہاں جلال بھائی کے ہاں حالات آپ کے لیے اتنے زیادہ اچھے بھی نہیں ہیں۔ بس یہ ایسا موقع ہے کہ ہم کسی طرح کا کوئی ریفٹ نکال لے سکتے۔ میں جانتا ہوں آپ کی پیشانی پر دھک کی ایک لکیر آتی ہے تو اسی کے دل پر پتا نہیں کتنی شکلیں آ جاتی ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو فیصل! ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔“

”آپ کچھ چھپا تو نہیں رہیں باجی؟“

”نہیں فیصل! سب ٹھیک ہے۔ تم غلطی نہ رہتی ہے تمہیں پتا ہے۔ تم غلط نہ کرو۔ بس اسی لمحہ کا دھیان رکھو۔“

اسے اگا کہ فیصل اسے حریہ کھو جانا نہیں چاہتا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ مزید کھو جانے سے کوئی پریشان کن بات سامنے آجائے گی۔

شام سے پہلے جواب درس والی کو بھی یعنی پرانے گھر واپس آ گئی۔ اس نے ابو کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ ابو کے سامنے جانے کی تو اس کے خاموش رہنے کے باوجود وہ بہت کچھ محسوس کر لیں گے۔ جیسے

ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اب تقریباً تین ماہ اوپر ہو چکے تھے۔

صورت حال جتنی گھبراتی تھی اتنی ہی سادہ تھی۔ کل دو پہر جلال اور جواب میں جھگڑا ہوا تھا اور آج فجر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سب کچھ واضح تھا۔

جواب بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ فیصل بھی کرسی تھیں کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آزدہ لہجہ میں بولا۔ ”مجھے پتا ہے کہ ابو ایک قرضہ چکانے کے لیے مزید قرضہ اٹھانے کی فکر میں ہیں۔ میں نے انہیں منع بھی کیا تھا۔ کچھ بھی ہے۔ کچھ بھی ہے۔ جلال بھائی پھر بھی اپنے تو ہیں کہ سن کر ان سے مزید مہلت لی جاسکتی ہے۔ یہ بیٹھوں مانے اور دوسرے سو خور تو اللہ معاف کرے جھگڑیاں لے کر بچتا جاتا ہے۔“

فیصل کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہے جلال بھائی اپنے تو ہیں وہ اسے کیا بتاتی۔ وہ کہتے اپنے ہیں۔ قرضہ تو یہاں بھی موجود تھا۔ جھگڑیاں تو یہاں بھی کھڑ کھڑائی جا رہی تھیں۔ اس کے آنسو جیسے اندر ہی اندر گرنے لگے۔

فیصل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جلال بھائی سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے آج کل؟“

”نہیں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔“

”جلال بھائی سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے آج کل؟“

”نہیں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔“

”نہیں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔“

”نہیں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔“

چوٹ اور طلب کی بڑھت ہوئی تھی۔ بہر حال ہمیشہ کی طرح طلب کی اس شدت نے حجاب کی روح کو نہیں بچھوڑا۔ جس اس کے جسم تک محدود رہی۔ اس کے بالوں کی نرمی تک۔ اس کے ہونٹوں اور رخساروں کی گرمی تک، اس کے پیکر کی رعنائی تک۔

جلال کی فحلی میں ناشتہ کافی پیوی ہوتا تھا۔ بالکل کسی بونے کی طرح۔ کئی ڈشز ہوتی تھیں۔ حجاب نے بس چند تھے لینے پر ہی اکتفا کیا۔ جلال کھاتا رہا اور اس سے بھی کھانے کے لیے اصرار کرتا رہا۔ اس نے حجاب کو اس دوا کے بارے میں بھی یاد کرایا جو وہ روزانہ ناشتے سے قبل لیتی تھی۔ اس طرح کی یاد دہانیوں سے وہ حجاب کو ہار کرایا کرتا تھا کہ وہ اس کا دھیان رکھتا ہے۔

چائے کا آخری ٹھونٹ لینے کے بعد وہ بولا۔ ”حجاب! میں چاہتا ہوں کہ میں سارے پیسے تمہارے ہاتھ میں دوں۔ تم از کم جیولری اور کپڑوں کی شاپنگ تم خود کرو۔ ارم کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ بلکہ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے نام سے ایک اکاؤنٹ کھلوادوں۔ بعد میں بھی گھر کے مابین اخراجات تم خود کرو۔ ارم آئے تو گھر میں تمہیں ملنا کی حیثیت حاصل ہو۔“

وہ باتیں کرتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ دل کے اندر آنسوؤں کا آبشار سا گر رہا تھا۔ ایسی باتیں جلال نے عام حالات میں کہیں نہ کہیں تو حجاب خود کو آسان پر آڑتا ہوا محسوس کرتی لیکن اب یہ باتیں اسے بس زخمی ہی کر رہی تھیں۔

آخر میں وہ بولا۔ ”میں تمہاری دیر میں ڈرائیور کو بھیجوں گا تم اس کے ساتھ گھر چلی جانا۔ امی بھی کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے دو چار دن درس والی کونسل میں رہنا چاہ رہی ہیں۔“

”میں اب بھی یہی چاہ رہی ہوں جلال! ابھی میرا دل دہاں جانے کو نہیں چاہ رہا کچھ وقت لگے گا مجھے سنبھلنے میں۔“

”لیکن کم از کم امی اور فوزیہ سے قول آؤ۔ وہاں سے اپنا کچھ سامان وغیرہ بھی لانا ہے تو لے آؤ۔“

”چلیں ایک دو دن بھی چکر لگا لوں گی اگر ہو سکے تو آپ شریقاں کو یہاں بھجوا دیجیے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے آسانی رہتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اسے بھجوا دیتا ہوں۔ بلکہ تمہارا کچھ سامان بھی بھجوا دیتا ہوں۔ آج تو میلانو جانا ہے دو دن کے لیے۔ پرسوں سے شام کے بعد یہیں آ چلیا کروں گا۔“

بانی حجاب کی طرف سے بہت پریشان تھا۔ کوشش کے باوجود حجاب سے کسی طرح کا رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے گھر پر ملازمہ شریقاں کو بھی فون کیا تھا اس سے بھی اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ حجاب سسرال میں واپس آئی ہے۔ شریقاں کی زبانی یہ بتا چلا تھا کہ وہ کسی دوسرے گھر میں ہے جسے پرانا گھر یا درس والا گھر کہا جاتا ہے۔

فیصل نے محسوس کیا تھا۔ گھر واپس آتے ہی اس نے ملازمہ نامید سے جلال کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتا دیا کہ وہ تو نہیں آئے۔ ملازم اور ڈرائیور آئے تھے اور کچن کا بہت سا سامان دے گئے ہیں۔ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیا جائے۔

جب حجاب ملازمہ نامید سے بات کر رہی تھی۔ اس کے فون کی بیل بونے لگی۔ اسکرین پر دبی ہادی کا نمبر تھا۔ اس نمبر سے اور ہادی سے اس کی بیزاری عروج پر پہنچ گئی۔ وہ کیوں چٹ گیا تھا اس کی جان سے؟ کیوں اس کی زندگی کو مزید زہر آلود کر رہا تھا۔ اس نے فون بند کر دیا اور پھر اس کی سم نکال کر کوڑے دان میں پھینک دی۔

رات دس گیارہ بجے اس نے فون میں نئی سم ڈالی اور جلال کو فون کیا۔ بیل بونے لگی۔ لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا (جلال کو پتا تھا کہ یہ اس کا نمبر ہے) اس نے فون منوٹے پر پھینک دیا اور کچھ

میں سردے کر آنسو بہانے لگی۔ وہ اپنے حالات پر فوج کھیں تھی اور خود کو بھی ملامت کر رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچا۔ ایسا؟ جب اس میں حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی تو کیوں اپنے اندر جینے والی چنگاریوں کو بجھانے کی بجائے مزاحمت کو سراہنے کا موقع دیا۔ بے شک ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیا رد عمل تھا کہ وہ اپنی صورت سے آگے نکل گئی۔ اس نے خود کو ایک آزاد ماڈرن لڑکی کا روپ دیا اور کئی نعنائیں میں بھی بھر کر سانس لینے کا سہارا بنایا۔ کیا۔ اور صرف یہی نہیں اسی رد عمل کے نتیجے میں وہ ہادی سے بھی ملتی رہی۔ بے شک یہ ایک صاف ستھرا تعلق تھا۔ رومانیت سے پاک مگر تھا تو غلط اور اس کی بنیاد بھی غلط تھی۔ اس بنیاد میں ماحول سے بغاوت کی کوہاں تھی۔

اچانک فون کی بیل بونے ہوئی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف جلال ہی تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ جلال کی بھاری بوجھل آواز آئی۔ ”کیا بات ہے تم نے فون کیا تھا؟“

”اور آپ نے ریسیو نہیں کیا۔“

”میں..... واش روم میں تھا۔ کیا بات تھی؟“

”مجھے دوسری رات ہے یہاں۔ آپ پلٹ کر آئے ہی نہیں۔ کوئی خبر ہی نہیں لی کہ کس حالت میں ہوں۔“

”میرے آنے سے تمہاری حالت میں کیا سدھار آ سکا ہے؟“

”اور آپ کے نہ آنے سے کیا سدھار آئے گا؟“

”جو باتیں ہمارے درمیان ہوتی ہیں وہ کئی بار ہو چکی ہیں۔ ان کا جھگڑنا ہوتا ہے اور مجھے بھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب ہمارے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوگی۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولا۔“ ٹھیک ہے۔ میں ابھی آدھ پون گھنٹے میں آتا ہوں۔“ اس کی آواز میں ایک

فاتحانہ آہنگ کی جھلک تھی۔ بین السطور وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور یقیناً حجاب بھی۔

اس رات وہ آیا۔ دونوں نے ٹیرس میں اکٹھے چائے پی۔ باغیچے میں تموڑی دیر چہل قدمی بھی کی۔ بہر حال کئی

بازک موضوع پر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ بڑے روم میں بھی جلال کا سوڈا بہتری رہا۔ دونوں نے اپنے اپنے کپڑے اتار دیے۔ وہ رات بھر اس کے بہت قریب رہا۔ اس کی محبت میں ہونا

”پر ذرا ہاتھ چڑھا کے یار! تجھ پر سرمایہ کاری ہوئی ہوئی ہے میرے بچوں کی۔“
 ”آپ کا سرمایہ میرے عشق کرنے سے نہیں ڈوبے گا! شو بھائی! عشق نہ کرنے سے ڈوبے گا۔“
 ”کیا مطلب؟“

وہ مسکرایا۔ ”عشق ختم..... تو گیت ختم۔“

”اچھا اچھا! تو کر عشق۔ پر گیتوں کو بریک نہیں لگنی چاہیے۔ اور اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ ڈپٹی ہاشم سے رابطہ ہے نا تیرا؟“
 ”ہاں کبھی کبھی بات ہوتی ہے؟“

”تو بس ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بار پھر کہوں گا کہ ذرا ہاتھ چڑھا کے۔ اپنا لا بور ہوتا تو اور بات تھی۔ مگر یہ پردیس ہے۔“

”عشق نہ پیچھے ذات..... تے عشق نہ دیکھے دیس پردیس۔“ ہادی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”یار! کہیں صوفی ہی نہ بن جانا۔ یہ کافیاں شافیاں ہٹ نہیں ہوتیں آج کل۔“

ہادی نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اس دوران میں اسے گلزار کا خیال آ گیا۔ دو تین روز سے اس سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ہادی نے اس کا نمبر ملا یا۔
 ”شاید کسی نام نہان کلب میں تھا۔ ڈرم کی دھما دھم تھی اور نرکی قہقہے گونج رہے تھے۔ گلزار نے قدر سے پتہ سکون جگہ پر جا کر ہادی کا فون سنا۔“ گھٹن ٹھک کر بیٹھا تھا کہ کام؟“ ہادی نے پوچھا۔

”بس اسی کے پیچھے لگا ہوا ہوں گا۔ وہ بولا۔“

”اسی کے پیچھے لگے ہوئے ہو یا کبھی کبھی لڑکی کے پیچھے لگے ہوئے ہو۔ اسے بیڈروم تک لے جانے کے لیے۔“

”نہیں ہادی صاحب! آپ کے سر کی قسم۔ اگر آپ کے پورے خرقہ بور ہے جس تو کام بھی آپ کا بور ہا ہے۔ بس آپ دو چار دن کا وقت دیں۔ بڑی کڑا کے دار خبر دوں گا آپ کو۔“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وقت زیادہ نہیں ہے۔“ ہادی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”ان دنوں میں ارم سے رابطہ ہوا ہے تمہارا؟“

”نہیں جی! ان دنوں تو نہیں ہوا۔ وہ فون ہی نہیں اٹھا رہی آج کل۔“

”چلو اگر رابطہ ہو تو اس سے جاننے کی کوشش کرو کہ حجاب کہاں اور کس حال میں ہے۔“

اس نے فون بند کیا اور صوفی کی نشست سے ٹھک لگا کر بیٹھا گیا۔ وہ گلزاری سے کہہ رہا تھا کہ وہ ارم سے رابطہ کرے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ارم خود یہاں ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کے پاس آگے والی ہے اور یہ ملاقات اس کے لیے کچھ زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہونے والی۔ اس ملاقات سے وہ ایک نقصان اٹھائے گا۔



اور شاید دو چار روز تک یہاں آ جائے گی۔ شریاں کے مطابق گھر میں چکے چکے ارم کی شادی کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ جلال نے ارم اور اس کی بڑی بہن فوزیہ میں بھی صلح صفائی کرادی تھی۔ آپا نام پہلے ہی اس شادی کی اطلاع نہیں تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے بیٹے نے جلد یا بدیر دوسری شادی کرنا ہی ہے۔ تو پھر وہ کیوں ایسی لڑکی نہ لے آئیں جو ہر طرح ان کی فرمانبرداری اور اطاعت گزار تھی۔

ہادی کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ چکی ہے اور جلال نے دوسری شادی کی تیاری شروع کر دی ہے۔ حجاب کا مصیبت زدہ چہرہ وہ گھر اس کی نگاہ میں آتا اور وہ جیسے پوری جان سے تڑپ جاتا تھا۔ وہ اسے خوش دیکھ جانتا تھا ہر حال میں اور اس خواہش میں اتنی شدت تھی کہ کسی وقت وہ خود حیران ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی جان کے بدلے میں بھی اس کی پیشانی کی چمک پر قرار دیکھتا تھا اور یہ صرف لفظوں کی بات نہیں تھی۔ وقت پرانے پر وہ یقیناً ایسا کر بھی سکتا تھا۔ وہ عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ سرٹاپا اس میں ڈوب گیا تھا۔ اسے اپنے جسم سے حجاب کی خیر خواہی تھی۔ تنہا ہوتے ہوئے بھی اپنے ارد گرد اس کی سانسوں کی مہک اور چھوڑوں کی کھنک محسوس کرتا تھا۔

بچپن میں چار روز میں اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ چڑ ”ایون میو“ جائے اور انکل فیض کے گھر کا چکر لگائے۔ پھر اچھا تجربہ اسے ابھی بھولا نہیں تھا۔ حجاب بہت سچا ہوئی تھی۔ اپنے مزاج کے برخلاف وہ ہادی سے بہت سچ ہوئی تھی اور اب تو حالات اور بھی خراب تھے۔ شروع میں اسے اندیشہ تھا کہ شاید جلال اس سے رابطہ کرے اور ان کے درمیان کوئی تخی ترشی ہو۔ یا وہ خود نہ آئے اور ظہیر وغیرہ کے ذریعے اسے کوئی سخت قسم کی وارننگ دی جائے لیکن ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ مستقبل قریب کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ بہر حال ہادی ایسے خدشات سے بچھڑانے والے نہیں تھا۔ وہ ہوٹل واسکوڈے میں ہی تھا اور یہاں اپنا قیام بڑھانے کے بارے میں بھی غور کر رہا تھا۔ اس کے سہیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے بے تاب نظروں سے اسکرین دیکھی یہ حجاب کا فون نہیں تھا۔ شنڈی سانس اس نے ریسیور کا ٹھن دیا۔ دوسری طرف لاہور سے شیخو صاحب تھے۔ وہ ذرا جوشیلی آواز میں بولے۔ ”تمہارا اتفاق مل گیا ہے ہادی! ہمیں زبردست خیریتیں کمال کے ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ کہیں تمہاری گردن میں سر پانے آ جائے ہیں۔ سچ یہی ہے کہ تینوں گیت دھوم مچانے والے ہیں۔ لگتا ہے کہ تمہارے دماغ کی پائپ لائن میں جو رکاوٹ تھی وہ دور ہو گئی ہے۔ اب اگلا نفاذ کب مل رہا ہے؟“

”جلد ہی۔“ ہادی نے مختصر جواب دیا۔

”لیکن یہ چھڑا ہوا کیسے ہے؟ کہیں کوئی عشق و شوق تو نہیں ہو گیا اس دیس والی کڑی سے۔“

”ایسا ہی سمجھ لیں شو بھائی؟“

”اوتے تیرا ہیڑا ترے۔ وہ تو شادی شدہ ہے نا۔“

”تو عشق کیا پوچھ کے ہوتا ہے شو بھائی۔“

”پڑوئے بتایا تھا کہ اس کے گھر والے بھی بڑے ڈھاڑے ہیں۔ اس کی گھرانی شکرانی کا چکر بھی تھا۔“

”گھر والے ڈھاڑے ہیں پر عشق بھی تو ڈھاڑا ہی ہوتا ہے نا یہ کسی کی کب سنتا ہے۔“

مکہ وادرم اگر اس کی وجہ سے بات پھیلے تو اس کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ باقی میں نے ساری پوچھ گچھ کر لی ہے۔ چاہے وہ دونوں صرف گھوڑے پھرنے کی حد تک ساتھ رہے ہیں۔ جس میں بھی پتا ہے کہ وہ کوئی آرٹیکل لکھ رہی ہے سو وہ جس پر.....

"ہاں پتا ہے جلال! وہ لکھ رہی ہے آرٹیکل۔" وہ ذرا چپا کر بولی۔

جلال کے فون کی بیل ہوئی۔ وہ سنا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ارم منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ "پتا نہیں ابھی کیا کیا آرٹیکل لکھنے ہیں آپ کی پیغم صاحبہ نے۔"

دو گھنٹے بعد جلال میلا نور وادہ ہو چکا تھا۔ جلال کی موجودگی میں گھر کا ماحول ذرا گھٹا گھٹا رہتا تھا مگر اس کے بعد فضا ذرا بجلی چلتی ہو جاتی تھی۔ اہل خانہ کے ساتھ ساتھ ملازم اور ملازماں بھی ایڑی محسوس کرتے تھے۔ گا ہے باجے تہہ بھی سنائی دے جاتے تھے۔ فوزیہ اور ارم کھانے کی میز پر تھیں۔ ارم کی دو کزنیں آئی ہوئی تھیں۔ ظہیر کی ایک چھوٹی زاد بھی تھی۔ گپ شپ ہو رہی تھی۔ کھانے کی فنی ڈشز، کپڑوں کے نئے فیشن، فنی دنی اور فلم کی تازہ خبریں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی گفتگو جلال کی موجودگی میں تو نہیں ہو سکتی تھی۔

اس دوران میں ظہیر جموستا ہوا اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ "یہ کون سی کتاب ہے ظہیر بھائی!" اس کی بھینچا زان آصفہ نے چپک کر پوچھا۔

"اس کا عنوان ہے شوہر کی خدمت کیسے کی جائے۔"

"تو یہ آپ کیوں پڑھ رہے ہیں۔ کیا آپ کا بیوی بننے کا ارادہ ہے؟" آصفہ نے کہا اور توجہ مارا۔

"نہیں بھئی۔ یہ میں اپنی معلومات کے لیے پڑھ رہا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ فوزیہ میری خدمت خفیک سے کر رہی ہے یا نہیں۔"

"بس سب کچھ کتابوں سے ہی ڈھونڈا کریں۔ اپنی عقل سے کچھ نہ سوچیں۔" فوزیہ نے کہا۔

"بھئی کتابیں عقل مند لوگ ہی لکھتے ہیں اور پڑھتے بھی عقلمند لوگ ہی ہیں۔ ویسے بھی ہم ادبی بندے ہیں۔"

"لوہب پڑھنا سوچا کہ ہم ہی دیکھا ہے ہم نے۔" فوزیہ نے شوہر پر چوٹ کی۔ سب ہنسنے لگے۔

آصفہ بولی۔ "ہاں ظہیر بھائی! ادب سے یاد آیا، آپ کے وہ شاعر دوست چلے گئے کہ نہیں ہیں۔"

"بھئی آخری خبریں آئے تھیں تو یہیں ہے۔ میں نے ارم سے کہا بھی ہے کہ اگر ملتا ہے تو جا کر مل لو۔ بہت

ہمیں آدمی ہیں۔ اور نام ہے بھئی ان کا نام ہے فیروزے سے تو ملتے ہی نہیں۔"

آصفہ نے ارم کی طرف دیکھا۔ "تو کیا خیالی ہے ارم! ایک نشست ہو جائے شاعر صاحب کے ساتھ؟"

ارم سے پہلے ہی اس کی کزن ماہرہ بول اٹھی۔ "ٹھیک ہے چلتے ہیں بھئی۔ بلکہ ابھی چلتے ہیں۔ کون سا اتنا

لڑاؤ وقت ہوا ہے۔ نوی تو بچے ہیں۔"

ارم ذرا سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح جانے سے جلال ناراض بھی ہو سکتا تھا مگر ایک جواز تو تھا وہ کہہ سکتی تھی کہ

آصفہ وغیرہ کا پروگرام بن گیا اس لیے وہ بھی ساتھ چلی گئی۔ تاکہ کچھ سن سکن لے سکے۔ یہ حضرت یہاں کیوں گئے

ارم کا ستارہ آج کل عروج پر تھا۔ سب کچھ اس کے حق میں جا رہا تھا۔ جلال نے بڑی بہن فوزیہ سے اس کی شادی کرادی تھی۔ آپا خانم ویسے ہی اس کی شادی کے راستے میں بظاہر اب کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ رہی سہی کسر خود حجاب کی اپنی غلطی سے پوری ہو گئی تھی۔ اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں تھی۔ ارم جانتی تھی جلال اسے اس کی سے معاف نہیں کرے گا۔ وہ آج کل پرانے گھر میں تھی اور یقیناً جلال اس سے کڑی باز پرس کر رہا تھا۔ بہر حال یہ سب کچھ بھی ارم کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ بھی ہے جلال، حجاب کو مکمل طور پر کھوٹا نہیں چاہے گا۔ اسے طلاق نہیں دے گا۔ یعنی ارم کو دوسری بیوی بن کر رہنا پڑے گا۔ ارم کے نزدیک یہ اور دوسری طرح تھی۔ مکمل طور پر وقت ہوتی جب جلال اسے اپنا زندگی سے بیکر نکال دیتا۔

کافی ہاؤس والا واقعہ ارم کے لیے بڑا اہم موڑ ثابت ہوا۔ بعد ازاں جلال نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کوئی ہاؤس تک کیسے پہنچی۔ ارم بگڑا دی کا نام تو لے لیں سکتی تھی۔ اس نے یہی بتایا تھا کہ اس کی ایک کھال لکھ رہی تھی حجاب کو دو بار ہونٹل واسکوڑے سے نکلتے دیکھا۔ وہ مکمل پردے میں تھی پھر بھی روٹی کو شک ہو گیا کہ یہ حجاب یہ بھی جانتی تھی کہ ہادی اسی ہونٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ روٹی نے اسے بتایا اور پھر وہ خود ہی وہاں پہنچی تھی۔

بہر حال آج شام کو جلال دو روز کے لیے میلا نور جا رہا تھا۔ واپسی پر کھانے وغیرہ کی تاریخ کے بارے میں فیصلہ ہونا تھا (ارم کے والدین سے ابتدائی بات چیت ہو چکی تھی۔ وہ بھی اتنا یا حبیثیت وادہ کوٹا نہیں چاہتے تھے جبکہ بی بھی شادی پر تکی ہوئی تھی)۔ ارم روانگی کے لیے جلال کے کپڑے وغیرہ تیار کر رہی تھی۔ اسی دوران میں جلال نے ڈگ بھرتا اندر داخل ہوا۔ ارم نے شرمانے کی ایکٹنگ کی (تھوڑی بہت شرم آئی تھی)۔ "آپ ایک کام ہی ہاؤس جاتے ہیں۔" وہ دوپندرست کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے اب گھڑیاں بجا کر آیا کروں گا۔" وہ بولا۔ نگاہیں بدستور سیل فون کی اسکرین پر تھیں۔ پھر بولے۔ "دم چومک کر اس نے فون بند کیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔" اپنی فریڈ کو فون کیا تم نے؟ میرا مطلب ہے روٹی کو؟"

"کس لیے؟"

"بندہ خدا! کیا کہا تھا تمہیں؟"

"ہاں..... وہ تو میں نے کل رات کو ہی کر دیا تھا۔ اس سے کہہ دیا ہے کہ ادھر ادھر بات نہیں کرنی۔ وہ ایسا ہے تو نہیں لیکن....."

"لیکن کیا؟"

"وہ ہماری فریڈ نہیں ہے جلال! صرف کاہل فیو ہے۔ اب میں اس کے منہ پر ہنی باندھنے سے تو روٹی

درخواست ہی کر سکتی ہوں۔ وہ کئی سوال پوچھ رہی تھی مجھ سے ہادی کے بارے میں اور باقی حجاب کے بارے میں۔

یہ کیسے ملے..... کہاں ملے؟ پہل کس کی طرف سے ہوئی؟ میں نے بمشکل جان چھڑائی۔"

جلال کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے شیروانی کا ہالائی ہٹن کھولا۔ پھر کڑے لہجے میں بولا۔ "اسے سختی سے

”کیا بات کہی ہے۔ ایک دم کلاسیکل شاعر بن گئے ہیں آپ۔“ آصف نے خوش ہو کر کہا۔
وقت موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ اسی دوران میں ہادی نے لڑکیوں کے لیے آئس کریم بھی منگوائی۔ جب
پس کریم کھا رہے تھے تو ہادی کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ کمرے میں ہر طرف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہادی
نے سیل فون ایک کٹن کے نیچے سے ڈھونڈا اور کال سنی۔ سنگل شاید پورے نہیں آرہے تھے۔ اس نے دو تین بار بیلو
کہا پھر بات کر رہا ہوا ہر چلا گیا۔

قریب ہی ایک تپائی پر سگریٹ کے پیکٹ اور موبائل چارجر کے پاس ہادی کا ڈیجیٹل کیمرہ پڑا تھا۔ ارم نے
چمکی کیمرہ اٹھا لیا تھا۔ وہ آن تھا۔ وہ تصویریں چیک کرنے لگی۔ درجنوں ہی تصویریں تھیں۔ یہ سب روم اور اس کے
گروڈیش کے شائے تھے تفریح گاہیں، تاریخی مقامات، پارکس، کسی کسی تصویر میں ہادی خود بھی نظر آتا تھا۔ کچھ
تصویریں اس کے ادبی دوستوں اور محفلوں کی تھیں۔

ہادی ایک قریبی بالکونی میں کھڑا فون پر بات کر رہا تھا۔ ارم تصویریں دیکھتی چلی گئی۔ روم کے بعد ونس کی
تصویر پر شروع ہو گئیں۔ ونس کی آبی شاہراہیں وہاں کے تفریحی مقامات، بازار، ایک تصویر دیکھ کر ارم بڑی طرح
خوش ہوئی۔ اس نے کیمرے کی اسکرین پر تصویر کو زوم ان کیا اور ششدر رہ گئی۔ یہ جاب ہی کی تصویر تھی۔ لیکن حیران کن طور
پر یہ تصویر پتلون اور شرٹ میں تھی۔ جاب کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ یہ سائینڈ پوز تھا۔ وہ ایک طرف
بجلی ہوئی کچھ دیکھ رہی تھی۔
”اوہ گاڈ!“ ارم کے ہونٹ دباؤ کے کی شکل میں سکڑ گئے۔

آصف ارم کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اس دوران میں وہ بھی تصویر دیکھ چکی تھی اور اس کے چہرے پر بھی حیرت نظر
آئی تھی۔ ”یہ دیکھو بھی یہ کیا سین ہے؟“ آصف نے مادہ اور کادو کو متوجہ کیا۔

ارم نے جلدی جلدی کچھ مزید تصویریں دیکھیں۔ غریب کیس جاب کی تصویر نہیں تھی۔ ہادی ابھی تک بالکونی میں
کڑبات کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی گفتگو اختتامی مراحل میں ہے۔ ارم نے اپنا شولڈر بیگ کھولا۔ اس میں سے اپنا
فون موبائل فون نکالا۔ ڈیجیٹل کیمرے کے ڈسپلے پر اس نے مطلوبہ تصویر کو اپنی ضرورت کے مطابق اتار دیا۔

”یہ تو بڑی خاصے کی چیز ہے جی۔“ ارم نے کہا اور اپنے موبائل فون کے کیمرے کے ذریعے جاب کی تصویر
اپنے موبائل فون میں منتقل کر لی۔ رزلٹ بہت اچھا ہوا۔

”یہ چیک چیک کیا چکر چل رہے ہیں ارم؟“ ارم نے آئینے میں نظر کیا۔
”مجھے کیا پتا۔“ ارم نے منہ بنا کر کہا۔

”گناہ کہہ جاؤں گا۔ تمہاری شادی کو جاب نے ہنس چکی ہے۔ وہ دی ایکشن دینے کے موڈ میں ہے۔“
”دی ایکشن ساری ایکشن یہ تو تھلک بچ جائے گا۔ مجھے تو گناہ ہے کہ اندر خانے کوئی گزب ہو بھی چکی ہے۔“
کمال بھائی شاید اسی لیے جاب کو سیکے سے واپس گھر نہیں لائے بلکہ پرانی کوٹھی لے گئے ہیں۔“ آصف نے خیال ظاہر

ہوئے ہیں اور کیا ارادے رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسے یقین تھا کہ خود جلال کے ذہن میں بھی یہ سوال بہن گئے۔
سیل فون ارم کے ہاتھ ہی میں تھا۔ اس نے جلال سے رابطہ کرنے کے لیے فون کیا۔ دو بار کال کرسٹے کے
باوجود کال ریسپونڈ نہیں ہوئی۔ وہ شاید کسی میٹنگ میں تھا۔ یہ بھی اچھی بات تھی۔ جلال سے اجازت لینے کی ضرورت
پوری ہو گئی تھی۔

وہ چاروں جہاں میں سوار ہو گئیں اور ڈرائیور کے ساتھ ہوٹل واسکوڈے پہنچ گئیں۔ انہوں نے ہادی کو فون ہادی
آمد کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ مبادا کوئی ازجن پیدا ہو جائے۔ وہ سیدھی سیکنڈ فلور کے کمرہ نمبر 118
کے نمائے پہنچ گئیں۔ ان کی خوش قسمتی سے ہادی کمرے میں ہی تھا اور اکیلا تھا۔ وہ ارم اور دیگر لڑکیوں کو اپنے سامنے
دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ بہر حال وہ منہمان تھیں۔ خوش خلقی کا مظاہرہ تو ہادی کو کرنا ہی پڑا۔ ارم نے صاف خود پر غصہ
کیا کہ ہادی پریشان ہے۔ ہال بکمرے بکمرے، آگے سرخ اور لباس مڑا تھا۔ اس کیفیت کی وجہ سے ارم
طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ جندم شاعر، حجاب کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ دوسرے
پوزیشن تھی اس بارے میں وہ ٹوٹی سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

ماہ نور چمکی۔ ”ہادی صاحب! آپ بہت بکمرے بکمرے ہیں کیا آپ کو کوئی غم اتر رہی تھی؟“
وہ زبردستی مسکرایا۔ ”اتر تو رہی تھی لیکن اب انٹیمی تین چار نکلیں اتر آئی ہیں۔“
سب جسنے نکلیں۔ ماہ نور نے کہا۔ ”تین غزلیں ایک آزاد غم۔“ اس کا اشارہ اپنی طرف تھا کہ وہ ذرا سولی تھی۔
”ہادی صاحب! یہ آپ لکھ کس طرح لیتے ہیں۔ کیا اس میں محبت کا بھی کوئی عمل دخل ہوتا ہے؟“ آصف نے
پوچھا۔

ہادی سے پہلے ارم بول اٹھی۔ ”ہاں بھی شاعری کے لیے عشق بہت ضروری ہوتا ہے بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ“
ہادی صاحب اس وقت بھی حالت عشق میں ہیں۔“

ہادی نے ذرا چونک کر ارم کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”مذاق کر رہی ہوں ہادی صاحب! بلاشبہ“
گا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ عشق کا الزام ہی لگا رہی ہیں۔ چوری چکاری کا تو نہیں۔“ وہ سب پھر پٹنے
لگیں۔

ارم ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”ویسے عشق میں چوری چکاری بھی آجاتی ہے اور کبھی کبھی تو شاید ڈاکہ بھی۔“
ہادی نے گہری سانس لی۔ ”جی ہاں۔۔۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ حالت جنگ اور حالت عشق میں سب کچھ جائز
ہوتا ہے۔“

نادیہ بولی۔ ”اچھا ہادی صاحب! مجھے یہ بتائیے کہ شاعری کے لیے صرف عشق کافی ہے یا اس کے ساتھ ساتھ“
بھی شرط ہے۔“

”عشق تو صرف عشق ہوتا ہے۔ کامیابی یا ناکامی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ بولا۔

ہنس زندان میں نے آپا خانم کو فون کیا تھا، وہ تو سو رہی تھیں۔ کلثوم (ملازمہ) سے بات ہوئی۔ وہ بڑی پریشان تھی۔

”پریشان کرنے والی؟ کیا مطلب؟“

”آپ کے بارے میں بتا رہی تھی جی! مجھے اُھاڑاؤ کھ ہوا ہے۔ ان لوگوں کو تو بس باتیں بنانے کا بہانہ چاہیے اہذا ہے۔“

”مجھے کھل کر بتاؤ شریاں! کیا باتیں بتا رہے ہیں؟“

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ”مجھے تو اس کے چھپے بھی اس بی بی ارم کا ہاتھ ہی لگا ہے جی! وہ ہتھ دھو کر آپ کے پچھے دی ہوئی ہے۔ اس نے باتیں مشہور کی ہیں جی! آپ کے اور ان ہادی صاحب کے بارے میں۔“ شریاں کی آواز لڑ رہی تھی۔

جواب کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ منہ خشک ہونے لگا وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ ”مجھے تفصیل سے بتاؤ شریاں۔“

”یہ ادا کرتا ہے کہ منہ تو دونوں ان سب کے۔ اللہ کرے ان کی زبان سڑے۔ کہتے ہیں آپ اور ہادی صیب کے لیے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ہادی صیب آپ ہی سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہادی صاحب نے چھوٹے بھائی جان ظہیر کو بھی چکر دیا۔ انہوں نے چھوٹے بھائی جان کو اس طرح ہتھوڑا دیا کہ وہ ان کو اپنے گھر میں ہی لے آئے۔ بعد میں وہ بھائی جان کو شک ہوا تو انہوں نے ہادی صیب کو گھر سے نکال دیا لیکن آپ دونوں لڑ بھی باز نہیں آئے اور ہوٹل میں ایک دوسرے سے ملنے رہے۔“

جواب کا سر گھوم رہا تھا۔ ”کون کر رہا ہے یہ باتیں؟“ اس نے پوچھا۔

”سارے ہی کر رہے ہیں جی! مجھے تو لگتا ہے کہ وہ بھائی جان تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ یہ لوگ کسی تصویر پر لکھی گئی کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ تصویر ہادی صیب کے پاس سے ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ بڑی یہود تصویر ہے۔ میں تو لڑ گیا ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتی جی۔“

”تصویر کی تصویر؟“ جواب کی آواز حیرت آمیز دکھ سے کھپا رہی تھی۔

”مجھے کیا پتا جی! صبر ادا کر رہا ہوں۔ آپ کے لیے بڑی مصیبت بن جائے گی۔ مارنے والے کا ہتھ پکڑا جاسکتا ہے۔ پر بولنے والی کی زبان کو کیسے پکڑا جائے۔ وہ تو کمپیوٹر کی گل بھی کر رہے ہیں کیا کہتے ہیں جی اس سڑان ٹھسے کو؟ انٹرنیٹ۔“

”انٹرنیٹ؟“

”آج بھی کہتے ہیں کہ آپ کا اور ہادی صیب کا معاملہ انٹرنیٹ پر شروع ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے گل یہاں تک پہنچا ہے۔ باجی آپ وڈے بھائی جان سے گل کریں فوراً اور ان باتوں کو دیکھیں جی یہ کوئی معمولی گل نہیں ہے اس گل کی کو بدنام کرتا۔“

جواب کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اسے لگا کہ اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ اس نے کرسی کا سہارا لیا اور بیٹھ گئی۔ یہ

کیا اور سوالیہ نظروں سے ارم کو دیکھنے لگی۔

”مجھے تو کچھ چاہیے یا ارم! سائیز کیا کر رہے ہیں یہ لوگ۔“ ارم نے کہا۔

”اتنی بھولی نہ بنو۔ چا تو بہت کچھ ہوگا تمہیں۔ بس ہم سے شیر نہیں کر رہی ہو۔ لیکن اسکی باتیں جھٹکتی نہیں ہیں جان من۔“ ماہ لور نے لقمہ دیا۔

”اچھا چپ ہو جاؤ۔ لگتا ہے وہ آ رہا ہے۔“ ارم نے کہا اور Nikon کا کمرہ واپس شیشے کی تپائی پر رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں گھٹلی کی چمکی ہوئی تھی۔

○.....○

ایسی باتیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ چھٹیکیاں تو کافی ہاؤس والے والے کے بعد ہی شروع ہو گئیں اور ان چھٹیکیوں کو ہوا دینے میں پس پر وہ ارم ہی کا ہاتھ رہا تھا۔ مگر اب تو حکم کھلا باتیں کی جارہی تھیں۔

میں راتھ خاندان کی تین چار فیملیاں رہائش پذیر تھیں۔ ولیدہ خاندان کے بھی دو تین گھر تھے۔ ان سب کے ہاتھ ایک نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز خبر آگئی تھی۔ خبر میں کچھ تو سنسنی کا عنصر واقعی موجود تھا۔ بہت سارے مسائل کی لیا گیا تھا۔ بر ملا کہا جا رہا تھا کہ پاکستان سے آنے والے شاعر..... محمد ہادی کے ساتھ جواب کا باقاعدہ معاشرہ مل رہا ہے۔ جواب اپنی دوست ماریہ کی شادی کے بہانے اسی سے ملنے ویش گئی تھی۔ وہاں وہ دونوں خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے۔ بعد ازاں ہادی، جواب کے پیچھے ہی پیچھے روم چلا آیا بلکہ جلال کے گھر تک بھی پہنچ گیا۔ یہاں ہوٹل و سٹوڈیو میں بھی وہ دونوں مسلسل ملتے رہے ہیں۔

جواب چونکہ الگ تھلک درس والے گھر میں تھی اور اس نے فون بھی بند کر چھوڑا تھا اس لیے وہ ان کی تشویش کا صورت حال سے بے خبر تھی۔ اس بے خبری کے عالم میں وہ کل دل کڑا کر کے ڈرائیور کے ساتھ باورسٹا گیا تھی۔ اس نے ارم کے لیے کچھ کاغذ اسٹ خریدے تھے۔ یہ اپنے گلے پر اپنے ہاتھ سے چھری چلانے والی بات کی لیکن اس کا خیال تھا کہ اس کا یہ عمل جلال کے اشتعال کو کم کرنے میں مدد دے گا۔ ویسے بھی جو کام اب کرنا تھا تو کیا ہی تھا۔ پھر اس میں تاخیر اور ہتکچاہٹ کا فائدہ؟ پچھلے دو تین روز میں بہت روٹی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ راتوں کو اس سر اور سینہ دونوں خالی ہو گئے ہیں۔ اب اس کے اندر ایک طرح کا ٹھہراؤ سا پیدا ہونے لگا تھا۔ وہی ٹھہراؤ جو اکثر و بیشتر ہادی ہوئی عورت کا سہارا بنتا ہے اور اسے بدترین حالات میں بھی زندگی کو جاری رکھنے کے راستے دکھاتا ہے۔

آج رات جلال آ رہے تھے۔ جواب نے خود کو بمشکل کمپوز کیا۔ فریش ہو کر لباس تبدیل کیا۔ اس کی ہانپت شریاں نے سندھی برائی بنائی اور جلال کے پسندیدہ سب کباب تیار کیے۔ شریاں کچھ خاموش خاموش تھی مگر شام کے بعد تک جواب کو اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ آٹھ بجے کے قریب جب جواب کھانے کی میز سجا رہی تھی اور جلال نے آنے میں یون گھنٹہ باقی تھا، جواب کو شریاں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی غمی نظر آئی۔ وہ الماری میں سے جج کاٹنے لگالے رک گئی۔ کیا بات ہے شریاں کوئی مسئلہ ہے؟ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہاتھ کاغذ سسکیاں لینے لگی۔ جواب نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور وہ پوچھی۔ وہ پہلے تو خاموش رہی۔ پھر

”جال جلیز..... مجھ سے اس لکچہ میں بات نہ کریں۔ ہم..... میں جانتی ہوں، میرے بارے میں باتیں بتائی پاری ہیں اور.....“

”تیرے بارے میں باتیں بتائی جا رہی ہیں۔ تجھ پر الزام لگ رہے ہیں۔ سارے دشمن ہو گئے ہیں تیرے۔ بس ایک ٹی بی پاک صاف رہ گئی ہے یہاں پر۔ ایک ٹی بی عابدہ پروین ہے۔“

”آپ محل سے میری بات سنیں جلال۔“

وہ پہنکا را۔ ”میں نے جو سننا تھا سن لیا ہے اور جو دیکھنا تھا وہ بھی دیکھ لیا ہے۔ یہ کیا کرتی پھر رہی ہے تو..... یہ کیا ہو رہا ہے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا جلال۔“

”کیا تو اس حرامزادے سے مل نہیں رہی؟ اس کے ساتھ ونس میں میرے ہاتھ نہیں کرتی رہی؟ تم دونوں کے عہد پر رابطے نہیں رہے ہیں؟“

”یہ غلط ہے جلال! یہ جھوٹ ہے۔“ وہ لرز کر بولی۔

”ایک زمانے کا تھپڑ جواب کے گال پر پڑا اور اس کے خوبصورتی سے سنوارے ہوئے بال اچھل کر اس کے چہرے پر آ گئے۔ جلال نے ایک تصویر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”اور یہ بھی جھوٹ ہے..... یہ بھی فراڈ ہے۔“

جواب نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی ریزہ میں سر دلہر دوڑ گئی۔ یہ چیت اور شرٹ میں اس کی تصویر تھی۔ پس نظر میں ونس کا ایک بل دکھائی دے رہا تھا۔

جال احازا۔ ”یہ اس حرامزادے کے کمرے سے ملی ہے جس کے ساتھ تو نے ونس میں اور پتا نہیں کہاں سے استیلا کی ہیں۔ لعنت ہے تجھ پر اور لعنت ہے اپنے والدین پر جنہوں نے تیرے جیسی بیٹی پیدا کی۔ ڈوب مر شرم سکے ایک طرف یہ پردہ داریاں، یہ دین داریاں ہیں اور دوسری طرف یہ گل چہرے۔ ٹو ہیروین ہے۔ ناپاک عورت ہے۔ اس نے بیٹھے بیٹھے زور سے ٹانگ چلائی جو جواب کے سینے پر لگی۔ وہ لڑکھاتی ہوئی کھانے کی میز پر جا گری۔ کچھ پہنے اس نے بڑی محنت سے جو میز سجائی تھی وہ درہم برہم ہو گئی۔ پلیٹیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ گلاس فرش پر لڑھکتے نظر آئے۔ وہ استے بیداری سے مارنے لگا۔ وہ پکار رہی تھی۔ ”جلال! میں نے کچھ نہیں کیا۔ جلال میری بات سنیں۔“

یقیناً مار دھاڑا اور رونے چلانے لگی۔ یہ ساری گولہ باز ملازمین تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان میں سے کون اندر آئے اور دھات کے کرنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ وہ کچھ جلال کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے ایک ڈانگ اسٹک اٹھائی اور اس سے جواب کو پٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اس کے ماں باپ کو اس کے خاندان کو بدترین القابات سے نواز رہا تھا۔ فلسفہ سے جواب کے لیے قیامت سے کم نہیں تھے۔ کوئی اس کے جسم کو جیسے دیکھ ہوئی سلاخوں سے داغ رہا تھا۔ وہ جلا تو رہی تھی مگر آواز جیسے اس کے سینے کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ آخر چھری کوٹ گئی۔ جلال نے اسے گردن سے لٹکا لٹکا دے کر دیوار سے دے مارا۔ وہ لہراتی ہوئی کاہار جوڑوں کے ڈبوں پر جا گری۔ زرق برق لباس

سب کیا ہو رہا تھا۔ وہ پیچھے تو ہٹ گئی تھی۔ پہا تو ہو گئی تھی۔ اب یہ لوگ اسے کہاں تک دھکیلا جا رہے تھے۔ اسے نہیں آئی کہ یہ جھوٹ کون تراش رہا ہے اور کس لیے؟ ظاہر ہے کہ شریفاں جھوٹ تو نہیں بول سکتی تھی۔ یہ باتیں تو رہی تھیں تو اس کی زبان تک آئی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں اپنے ابو امی کے چہرے گھوڑے وہ تو پہلے ہی حالات کی سنگینی سے ڈرے سبے تھے۔ ابھی تو وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ان تک جلال کی دوسری شادی کی خبر کس طرح اور کس انداز سے پہنچائے کہ انہیں کم سے کم دھکا لگے۔ (حالانکہ وہ اس معاملے سے یکسر بے خبر بھی نہیں تھے) اب یہ دوسری مصیبت گھڑی ہو گئی تھی۔ دل کا دل چاہا کہ ابھی جلال کو فون کرے اور اس سے اس بارے میں بات کرے۔ مگر اس نے گھڑی دیکھی۔ جلال اب چند لمحوں میں صفت میں پہنچنے ہی والا تھا۔

وہ سبے جینی سے برآمدے میں بیٹھنے لگی۔ کچھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد جلال کی گاڑی کا بارن سنا دیا اور جواب کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔

جلال اندر آیا تو جواب نے اسلام علیکم کہا۔ اس نے جواب دیا۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ نہ لگا سکتا تھا۔ آج بھی چہرہ سنجیدہ تھا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس کے کانوں تک وہ باتیں پہنچی ہیں یا نہیں جو اس کی شریفاں نے بتائی ہیں۔

”پہنچ کریں گے؟“ جواب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جلال نے مختصر جواب دیا۔

”کہا نا لگو آؤں؟“

”نہیں ابھی نہیں۔ میں ذرا ایک فون کر لوں۔“

وہ فون والے کمرے میں چلا گیا۔ لینڈ لائن پر کسی سے پانچ دس منٹ بات کی۔ پھر باہر آ گیا۔ دونوں ڈانگ رووم میں ہی صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ملازم باہر کیراج میں تھا۔ شریفاں بکن کی طرف جا چکی تھی۔ ”میلانوم میں کام ہو گیا؟“

جواب نے پوچھا۔

”ہوں۔“ جلال نے مختصر جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”تم کیا کرتی رہی ہو؟“

”آج تو کمر میں ہی رہی ہوں۔ کل تھوڑی دیر کے لیے بازار گئی تھی۔“

”بازار۔“

”ہاں کچھ شاپنگ کی تھی۔“ جواب نے کہا اور اٹھ کر الماری سے کاہار جوڑوں والے ڈبے اٹھالائی۔

”یہ کیا ہے؟“

”کپڑے۔“ جواب نے جواب دیا۔ اور ڈبے کھول کر جلال کو دکھانے لگی۔ جلال نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔

جواب کے سامنے بیٹھنے ہوئے بولا۔ ”مجھے بتاؤ کیا چاہتی ہو تم؟“

اس کا انداز دیکھ کر وہ پوری جان سے لرز گئی۔ ”مہ..... میں سمجھی نہیں جلال!“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارے سوا اس دنیا میں نہ رہے انتہی اور گدھے بھرے ہوئے ہیں۔“

جاؤ۔ گھٹ جائے گا۔ مر جاؤ گے۔ زندگی راستہ نہیں دے گی۔ مگر سب جانتے بوجھتے بھی وہ بے ساختہ قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ کسی انہونی کی خواہش نے دل کے اندر کہیں گہرائی میں گھات لگا رکھی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی جلتے رہو۔ تم نے سنا نہیں کبھی دیواریں راستہ دیتی ہیں۔ تم نے سنا نہیں کبھی پتھر پھٹتے ہیں اور کیا تم نے سنا نہیں کبھی پانیوں میں دیے جل اٹھتے ہیں۔

اچانک اس کا جسم سنستا اٹھا۔ دروازے پر مدھم دھمک ہوئی تھی۔ "جواب..... جواب" اس کے دل نے دیوانہ وار کپکپا اور دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ دھمک دو بارہ ہوئی۔ اس نے دروازے کے Peep Hole میں آنکھیں لگا لیں اور بائیں ایک لہریں کر اس کے سینے میں دوڑ گئی۔ وہاں جواب کا دیور ظہیر نظر آ رہا تھا۔

اس نے خود کو کپکپا کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ "اسلام علیکم ظہیر بھائی!"

"وہ علیکم سلام" ظہیر نے کہا۔ آج پہلی بار بادی اس کے فرہ چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ رہا تھا۔ دونوں صوفوں پر بیٹھے۔ ظہیر نے سفید رومال نکال کر پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

"نیا حال ہے ظہیر بھائی؟"

"ابن ٹھیک ہوں۔ ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں تم سے۔"

"جیہ جیہ"

"پہلی بات تو یہ ہے۔ بادی! کہ میں تمہاری طرف سے بے حد مایوس ہوا ہوں۔ تم ایک فنکار ہو۔ فنکار تو اتنا محنت دل اور بے حس نہیں ہوتا۔"

"میں سمجھا نہیں ظہیر بھائی۔"

"میرے خیال میں اب تم یہ بھائی کا لہجہ بھی نہ ہی کو تو بہتر ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کے بعد اس کی سانس میں ہلکتی ہے۔"

"ظہیر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔"

بادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ جلال صاحب نے جنہیں کچھ بتایا ہے۔"

وہ بڑبڑا کر بولا۔ "جلال صاحب نے نہیں بتایا پورا خاندان بتا رہا ہے۔ تو تو ہو رہی ہے تم پر اور ساتھ ہی مجھ پر۔"

مگر میں جسیں مہمان بنا کر گھر لے گیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اندر خانے کیا چکر چلے ہوئے ہیں یہاں۔"

"تم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو ظہیر۔"

"ظہیر خاموش ہو جاؤ۔ پلیز..... میرا منہ نہ کھلاؤ۔ ورنہ بات بہت بڑھ جائے گی۔" وہ بلند آواز میں بولا۔

"مگر..... کچھ پتا تو چلے۔"

"جنہیں سب پتا ہے اور مجھے بھی پتا ہے۔ جس ان باتوں کو دیکھا ہے ربنے دو تو بہتر ہے۔" ظہیر نے بہت کبیر لکچر میں کہا۔ "میں جنہیں صرف یہ پتا چاہتا ہوں کہ بھائی جلال محبت کیسے میں ہیں۔ اگر خفیہ میں ان سے کوئی انا کو محاکام ہو گیا تو مزید بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تمہارے حق میں اور شاید ہمارے حق میں بھی بہتر یہی ہے کہ تم فوراً روم سے چلے جاؤ۔ میں جنہیں کوئی دھمکی نہیں دے رہا۔ سمجھو تمہارے خیر خواہ کی حیثیت سے تمہاری منت

بکھرتے نظر آئے۔

وہ مگر جا۔ "حرام زادی! شاہنکس کرتی پھر رہی ہے۔ اس یار کو دکھانے کے لیے۔ اس کو رہ جانے کے لیے۔"

تیرے جیسی عورت کو تو چوراہے میں سنگسار کرنا چاہیے۔"

جواب کا گھاٹلک ہو کر بند ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ یہ شاہنک اس نے اپنے لیے نہیں اس کی ہونے والی بیوی کے لیے کی ہے۔ اس کے حکم کے مطابق۔ وہ نیم جان سی اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کی پشت پر انگارے دھک رہے تھے۔ جلال نے ایک اور ٹھوکرا اس کے پہلو میں رسید کی اور گالیاں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

وہ تصویر چند منٹ کے فاصلے پر ٹوٹی ہوئی پلیٹوں اور گلاسوں کے پاس پڑی تھی۔ جواب نے اشک بار نظروں سے تصویر کو دیکھا۔ یہ اس کی تھی۔ دینس کی کچی گلی میں اتاری گئی تھی۔ اگر یہ ہادی کے کمرے سے نکلی تھی تو یقیناً اس نے چوری جیسے ہی ایسا کیا تھا۔ ہادی کے لیے اس کا رخ اور پیش کچھ اور بڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے پاس سے ہو اور وہ اس کا منہ فوج لے۔

ہادی ہوٹل واسکوڈے کے کمرے میں تھا۔ اس کی بے چینی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جواب سے اس کی آخری ملاقات تب ہوئی تھی جب جلال اسے کافی ہاؤس سے لے کر گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اس کی شکل دیکھ سکا تھا نہ آواز سن سکا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ ہادی کے ذہن میں آتا تھا کہ شاید صورت حال اتنی خراب نہ ہو جتنی وہ سوچ رہا ہے۔ دروازہ پہلے ارم اور اس کی کزنز و ظہیر یہاں آئی تھیں۔ وہ بھی کچھ بکے پھلنے موڑ میں باتیں کرتی رہی تھیں۔ ان کے رویے سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ جواب کی طرف کسی طرح کی توجہ کی صورت حال موجود ہے۔ ظہیر کی طرف سے بھی کوئی ایسا ویسا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ہادی اپنے ذہن میں اس خوش حالی کے جگہ دے رہا تھا کہ شاید اس دن جلال واقعی اتفاق سے کافی ہاؤس آچکا ہو اور یہ کہ شاید آج جواب خود ہی اس سے رابطہ کر لے۔ یا کیا پتا خود ہی یہاں آن پہنچے۔ جواب کو بھی پتا تھا کہ آج روم میں اس کا آخری دن ہے۔ کل اس نے ٹکوریس یا پیسا کا رخ کرنا ہے۔ سابقہ پروگرام کے مطابق آج جواب نے آنا تھا اور ہادی کو الوداع بھی کہنا تھا۔ وہ سچ ہی نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ جواب اس سے ملنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی لے لے گی۔ کچھ نہیں تو فون تو ضرور ہی کرے گی۔

ابھی تک اس نے روم سے جانے یا نہ جانے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ چلا گیا تو اس کا دل و دماغ یہیں رہ جائے گا۔ وہ اپنا خالی مٹی کا جسم لے کر جانے گا، جس میں زندگی کی کوئی آہنگ ترک نہیں ہوگی۔ کچھ شاید زندگی ہی نہ ہوگی۔ کوئی اتنی جلدی کسی کے جسم و جان پر قبضہ کر سکتا ہے۔ ہادی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے عشق و محبت کے گداز جذبے کے بارے میں سنکر دس شعر کہے تھے۔ ہزاروں صفحات بھر دیئے تھے مگر عملی طور پر اس جذبے سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا۔ اور اتنی شدت سے کہ وہ دھمک تھا۔ اسے اپنے سامنے ایک بند گلی بالکل سناپی نظر آ رہی تھی۔ اس کا دماغ چلا کر کہہ رہا تھا کہ سزا نامکن ہے۔ آگے بڑھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ رک جاؤ۔ چلے۔

رہیں۔ آپ پر مے لکھے ہیں۔ جانتے ہی ہوں گے۔ عورت و چاری کی عزت شمشے سے زیادہ کچی ہوتی ہے۔ اور یہ پھونٹ کیا ہے باجی جی کے لیے۔“

بادی نے کہا۔ ”شریٹاں! مجھے نہیں پتا کہ تم لوگ کیا سوچ رہے ہو۔ سچ صرف اتنا ہے کہ حجاب میرے ساتھ حق چارہ نہ مٹنے کے لیے نکلی ہے۔ میں شہر دیکھنا چاہتا تھا اور وہ شہر کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہے اور اس کے بارے میں کچھ لکھ بھی رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میں حجاب کے گھر والوں کے سامنے بادی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔“

”آپ کے کہنے سے کچھ نہیں ہو گا صیب جی، اکل بہت آگے نکل گئی ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ دونوں میں بہت پہلے سے جان بچان ہے۔ آپ کیسے پڑ پر گل بات کرتے رہے ہیں۔ اور آپ صرف باجی حجاب سے ملنے کے لیے ہی پاکستان سے اچھے آئے ہیں۔ باجی شادی کے بہانے دو بجے شہر گئی تھی تو آپ سے ملنے گئی تھی۔ انہوں نے کہیں سے باجی کی ایک فونو بھی ڈھونڈ لی ہے۔ یہ فونو آپ نے ہی اتاری ہوئی ہے۔“

”جی ہاں جی! آپ کے کمرے سے نکلی ہے وہ فونو۔ اس میں باجی کے سر پر چادر ہے نہ دوپٹہ۔ انہوں نے پتلون پہنی ہوئی ہے۔ یہ سب بہت عجیب ہوا ہے صیب جی! پتا نہیں اب کیا بنے گا۔“

بادی کے کان سامنے جھانک کر رہے تھے۔ حجاب کی ایک تصویر تو اس کے کمرے میں موجود تھی۔ سینکڑوں دھری تصویریں اس کے درمیان کھینچی پڑی تھیں یہ تصویر حجاب کے گھر والوں تک کیسے پہنچی؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس نے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا کہ اس کے ساتھ ہی اور بے جسم میں سر دھردھرتی۔ تین چار دن پہلے ارم اور اس کی چھٹیائیوں اس سے ملنے یہاں کمرے میں آئی تھیں۔ کہیں انہوں نے تو کمرے سے چھینر چھانڈ نہیں کی تھی۔ اس نے حجاب کا سوا سا چادر اسے یقین ہونے لگا کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ اس دن لاہور سے والدہ کی کال آ گئی تھی۔ وہ کال سنتا ہوا برا بھلا کئی مین چلا گیا تھا۔ شاید آٹھ دس منٹ تک گئے تھے۔ اس دوران میں ارم نے یا اس کی کسی ساتھی نے کام دکھایا تھا۔ کمرے میں اس تصویر کو دیکھ کر کسی سیل فون وغیرہ میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔

یہ سارے خیالات اس دو چار سینکڑں میں اس کے ذہن سے گزر گئے۔ شریٹاں ہمارے لیے کچھ میں کہہ رہی تھی۔ صیب جی! اوڑے بھائی جان مجھے کے بڑے تیر ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے لیے چنگا کھانے کے کباب یہاں سے چلے جائیں۔“

بادی نے کہا۔ ”شریٹاں! تم اس وقت درہن دیکھ کر میں ہو۔“

”ہاں جی! ادھر ہی ہوں۔“

”کیا تم ایک دفعہ صرف ایک دفعہ میری بات اپنی باجی جان سے کر سکتی ہو؟“

”تو بہ کریں جی! کیسی گل کر رہے ہیں آپ؟ میری چڑی ادھر جا جائے گی۔ ویسے بھی میں آپ کو بتا دوں۔ باجی کے گل نہ کر کے آپ فائدہ میں رہیں گے۔ وہ بھی بہت فائدہ میں ہیں۔ آپ سے بڑی سخت گل کریں گی۔“

کر رہا ہوں۔ اگر کہتے ہو تو تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔ یہ دیکھو۔“

آخر میں ظہیر کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا اور اس میں گزراش کی جھلک آ گئی۔

بادی کے اندر بھی اہال آتے آتے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ظہیر بھائی! آپ پریشان ہوں۔ آپ جو کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ آپ اس طرح مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ مجھے صفائی کا موقع نہیں دینا چاہتے۔“

”تم جو کہنا چاہتے ہو بادی! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ بس حالات اس وقت اتنے مجزے ہوئے ہیں کہ تم سوچا بھی نہیں سکتے۔ غلطی چھوٹی ہے یا بڑی۔ میں نہیں کہہ سکتا مگر اس کا جو نتیجہ نکلا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ میری ریکورڈ ہے تم سے کہ تم چلے جاؤ۔“

بادی نے ایک بار پھر طویل سانس لی اور بولا۔ ”میں تو پہلے ہی سامان باندھ کے بیٹھا ہوا ہوں۔“

اور بیک پڑا ہے۔ کل صبح دس بجے میں نے نکل جانا ہے چھ ماہ کے لیے۔“

ظہیر نے ایک بار پھر سفید رومال سے اپنے چہرے کا پینہ پونچھا۔ بادی کے بیک سامان کی طرف دیکھا اور اُنہ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے بادی! میں چلتا ہوں۔ امید ہے کہ تم اپنے وعدے کا پل بھول نہ گئے۔“

”آپ بے فکر رہو۔“

ظہیر خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ جیسے ایک گولا آئے اور چلا جائے۔

بادی اپنی جگہ ساکت و جامہ کھڑا تھا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں سیل فون کا میوزک بج اٹھا۔ بادی نے فون اٹھایا۔ یہ شریٹاں کا نمبر تھا۔

”ہیلو۔“ شریٹاں کی دہلی دہلی آواز سنائی دی۔

”ہیلو شریٹاں! کیا بات ہے۔“

شریٹاں کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر سرگوشی جیسی گلو کیر آواز میں بولی۔ ”صیب جی! یہ کیا ہو گیا ہے۔ میرا تو دل دبا ہے۔ باجی کی حالت میرے توں دیکھی نہیں جاندی۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“

”صیب جی! یہ کچھ کیا نہیں ہوا؟“

”کچھ پتا تو چلے۔“

وہ توقف سے بولی۔ ”وڈے بھائی جان نے باجی سے بہت زیادہ جھگڑا کیا ہے۔ مارا ہے ان کو وہ کچھ بھوکی پیاسی بس روئدی جا رہی ہیں۔ یہ سب کیوں ہوا صیب جی؟ ایسا نہیں ہونا چاہیہا۔“

”میں نے منہ سے وڈی گل نہیں کرنا چاہندی پر آپ کو کچھ سوچ لینا چاہی داسی۔“

”شریٹاں! مجھے لگتا ہے کہ بات کا جھگڑا بنایا جا رہا ہے۔“

”بات ہے تو جھگڑتا ہے نا۔ پوری برادری وچ باتیں ہو رہی ہیں۔ باجی کسی کوٹ دکھانے کے لیے نکلی۔“

”ہاں..... پروگرام تبدیل ہوا ہے۔“

”اب کہاں ہیں آپ؟“

”سمجھو دم کے آس پاس ہی ہوں۔ بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم بتاؤ۔ کیوں کال کر رہے تھے؟“

”تھری نیوز ہے جی! ارم کے بارے میں۔ پچھلے سال ارم سے میری بہت ہی کم ملاقات ہوئی ہے۔ اس دوران میں وہ کیا کرتی رہی ہے۔ اس کا کچھ کچھ کھوج اب مل رہا ہے۔ پچھلے سال وہ ایک آرٹسٹ یونیورسٹی سے ایف آئی اے کر رہی تھی۔ لیکن پتا چلا ہے کہ اس نے اپنا آخری سمسٹر فریز کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی بیماری تھی۔ کم از کم یونیورسٹی کے ریکارڈز میں تو یہی بات بتائی گئی ہے۔ لگتا ہے کہ بیماری والی بات ٹھیک ہی ہے۔ کیونکہ ارم کی ایک دوست سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ چار پانچ ماہ یونیورسٹی سے غیر حاضر رہی۔ اس دوران میں ایک دو بار فون پر اس سے بات ہوئی تو وہ کافی کمزور محسوس ہو رہی تھی۔ اسے سینے یا گلے کی کوئی انفیکشن تھی جس کے بارے میں اس نے کھل کر کچھ نہیں بتایا۔“

”تم سے بھی اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔“ ہادی نے گھڑاری سے پوچھا۔

”نہیں جی! اور اس سے مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ کوئی گزبڑ معاملہ تھا۔ میں اس کی پوری ٹوہ نگار ہوں جی۔ بس ایک دو دن میں میں کبھی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔“

”ایک دو دن کا مطلب ایک دو دن ہی ہو تو اچھا ہے۔ سمجھو کہ ارجنٹ فیس کا کام ہے۔“

”آپ محبت سے بولیں لیکن میں بس یہ فیس ہی فیس ہے جی۔ یقین کریں آج کل مجھے کھانا چٹا بھولا ہوا ہے۔“

اب بھی آپ ہی کے کام پر لگا ہوا ہوں۔ ایک کافی مہنگے کلب ہے۔ وہاں گھسنا پڑا ہے۔ وہ اٹالوئی ٹرکاکا اسٹیل آیا ہوا

ہے جہاں جو یونیورسٹی میں ارم کے ساتھ ڈنکھا جاتا تھا۔ اس کا پورا نام اسٹیل ٹرکاکا ہے۔“

”خیر ہے وغیرہ کی فکر نہ کرو گھڑاری! بس روز ملے اچھا لکھنا چاہیے اور جلدی۔“

”آپ ٹھیک ہی نہ کریں جناب عالی!“ گھڑاری نے سر ہاتھ اٹھا کر ہنس کر کہا۔

وہ سچ معنوں میں مگرمئے کاٹھ تھا۔ جتنا زیادہ بھاڑا، اتنی زیادہ وفاداری اور محنت۔

ہادی نے فون بند کر دیا اور صوفے پر نیم دراز سا ہو کر دراز ہو گیا۔ ارم کے بارے میں کئی سوال ذہن میں ابھر

رہے تھے لیکن یہ سارے سوال ایک عجیب و غریب پریشانی کے نیچے دب گئے۔ یہ حجاب کی پریشانی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ حجاب

کہاں ہوگی کس حال میں ہوگی۔ کیا گزرتی ہوگی اس پر۔“

○ ○ ○ ○ ○

حجاب دو تین دن سے درس والے گھر میں خاموش پڑی ہوئی تھی۔ شریٹاں بہت اصرار کر کے اسے ایک دو تھے

کھلا دیتی تھی۔ دو بار وہاں کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ بس اس نے اتنا کہا تھا کہ یہاں بیٹے کے اگلے روز شریٹاں کو فون

لگا تھا اور اسے بتایا تھا کہ فلاں الماری میں فرسٹ ایئر کی چیزیں پڑی ہیں۔ مگر حجاب کو کہیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے

نہیں۔“

”چلو سخت ہی کرے لیکن.....“

”نہیں صیب جی!“ اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”یہ اب نہیں ہو سکتا۔ میں تو بس اتنا کہتا چاہندی ہوں۔“

آپ سارے علاقے کے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر اپنا پنڈ اپنے لوگ یاد آتے تھے۔ پر جو ہوا بہت بُرا ہوا۔ اب بھڑکی

ہے کہ آپ چلے جائیں یہاں سے۔“

اس سے پہلے کہ ہادی مزید کچھ کہتا۔ شریٹاں تیزی سے بولی۔ ”اچھا کوئی اس پاس آ رہا ہے۔ میں بند کرتی

ہوں۔ رب راکھا۔“

فون بند ہو گیا۔ ہادی سکتے گروہ سا جھٹکا رہا۔ حالات اس کی توقع سے کہیں زیادہ غراب تھے اور یقیناً اس غراب

میں اس کا اپنا کردار بہت زیادہ تھا۔ حجاب کے گاہ بگاہ کے انکار کے باوجود وہ اس سے ملنے پر اصرار کرتا رہا لہذا ایک

طرح سے اس کو جذباتی و اخلاقی دباؤ کا شکار کیا۔ تصویر والی غلطی بھی سراسر اس کی اپنی ہی تھی۔ اس نے اپنے

تصویر اتاری اور مزید غلطی یہ کہ کئی ہفتے گزرنے کے باوجود اسے کمرے میں ہی رہنے دیا۔ اس کے گمان

نہیں تھا کہ کوئی اس طرح تمہو پر تک پہنچے گا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اسے اب جانے کا بھانگنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔ مگر وہ کیسے بھانگ سکتا تھا۔ وہ تو زنجیروں میں جکڑا گیا تھا۔

زنجیریں عشق صادق کی ایسی دھات سے بنی تھیں جنہیں کبھی کوئی پھل سکا ہے نہ توڑ سکا ہے۔ یہ وہ کھائی نہ دینے والی

زنجیریں بظاہر دھاگے سے کمزور ہوتی ہیں مگر اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اپنے قیدی کو کھینچ کر محبت کے منہ میں لے

جائیں تو وہ کسمپاس نہیں سکتا۔ ہادی بھی یہاں سے جانے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ صرف اور صرف حجاب کی مصیبت

بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت کو کیسے کم کیا جا سکتا ہے۔

○ ○ ○ ○ ○

دو رات اس نے جیسے زہریلے کانٹوں پر لڑختے ہوئے گھڑاری۔ اگلے روز صبح پانچ بجے وہ اپنے کسی بھی دوست

احباب کو آگاہ کیے بغیر ہوٹل سے چیک آؤٹ کر گیا۔ اس نے اپنا سیل فون بھی آف کر دیا تھا۔ بظاہر وہ اس شہر کو چھوڑ

رہا تھا لیکن اصل میں صرف علاقہ بدل رہا تھا۔ دن نو بجے تک وہ روم سنٹرل کے گنجان علاقے میں ایک فراہمہ ٹالی

ہوٹل میں منتقل ہو چکا تھا۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل صاف سترا تھا۔ کسی انتہائی باشندے کا تھا۔ محلہ بھی زیادہ تر

اسٹینش ہی تھا۔ ہادی کے دل و دماغ میں آگ سی بھڑکی ہوئی تھی۔ ارم کا چہرہ بار بار اس کے تصور میں آتا تھا اور غرت

کی اک بلند لہر اٹھتی تھی۔ یہ عورت حجاب کی دشمنی میں بہت آگے نکل گئی تھی۔

دفتر گھڑاری کا خیال ہادی کے ذہن میں آیا۔ اس نے سیل فون آن کیا۔ اس پر پہلے ہی گھڑاری کا پیغام آیا

تھا۔ ”کالی۔“

ہادی نے اس کا نمبر ملایا۔ فوراً ہی گھڑاری کی باریک آواز سنائی دی۔ ”ہیلو ہادی صاحب! آپ کہاں تھے۔“

نے کافی فون کیے۔ آپ کے ہوٹل کے نمبر پر بھی کال کی۔ پتا چلا کہ آپ مگر سویرے نکل گئے ہیں۔ آپ کو تو دس بجے

بجے جانا تھا شاید۔“

حجاب کو ہرگز خواہش نہیں تھی کہ جلال خود یہاں آئے۔ بلکہ وہ تو گیت کے قریب کسی گاڑی کا بارن من کر بھی جا جاتی تھی کہ کہیں یہ جلال کی گاڑی نہ ہو۔ یہ کیسی ستم خیز لڑکی تھی۔ ایک بیوی جس کو اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ کا انتظار ہوتا چاہیے۔ اس آہٹ سے دہشت زدہ تھی۔ یہ بات اب انہی طرح حجاب کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس گھر میں اس کی زندگی بدتر بلکہ بدتر بن ہو جائے گی۔ اگر وہ یہاں رہے گی تو بے حد حقیر صورت میں۔ تو پھر وہ کیا کرے؟ کسی طرف جائے؟ نہ جائے مانتا ہے نہ پائے رفتن۔ ناقابل برداشت جس بڑھتا جا رہا تھا اور تازہ ہوا کے لیے کوئی ماحول نہیں تھا۔ اگر اپنی جان لیوا حرام نہ بھٹاتا تو شاید وہ اس بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیتی۔ ان تین دنوں میں اس کے ابو امی کی طرف سے بھی کوئی خبر نہیں تھی نہ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں ان پر کیا نوکری ہو رہی تھی کہتے ہیں کہ کوئی ہوئی بانیں گردن کی طرف ہی آتی ہیں۔ حجاب بھی تم کی انتہا کو بخور رہی تھی۔ اسے اپوں کی ضرورت تھی وہ جنہیں اپنے دل کا حال بتانا چاہتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اب چھپانے کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے سامنے اپنے سارے رنجوں سے پردہ اٹھا دے اور پھر ان کے کھلے ہونے پر ہر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پہلے اس نے فون کرنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ صورت حال اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ فون کرنا بے معنی سمجھوں ہوا۔ اس نے شریقال کو بتایا کہ وہ امی کے گھر جا رہی ہے۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ پتا چلا ہے۔

”کب تک آجائیں گی باجی؟“

”ابھی کچھ پتا نہیں۔“

ملازم ٹیکسی لے آیا۔ حجاب اس گھر کی طرف روانہ ہو گئی جو مصیبتوں سے بھری اس دنیا میں اس کا گھر تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ امی ابو اور بھائی تک کیا باتیں پہنچی ہیں اور وہی Feelings کیا ہیں۔ وہ بس یہی دعا کر رہی تھی کہ امی ان سارے حالات سے بے خبر ہوں۔ ان کی طبیعت بے خبر ہوئی تھی۔

دن کے گیارہ بجے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی۔ ملازم نے سلام کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ سب خیریت تو ہے نا؟“ حجاب نے سہم کر پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”امی کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں ہیں جی! شاید سو رہی ہیں۔“

حجاب اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ تپائی پر ایک ٹولڈر بیگ پڑا ہوا تھا۔ جس سے حجاب کو اندازہ ہوا کہ اس کی پیمپو بھی آئی ہوئی ہیں۔ ان کا نام زاہدہ تھا۔ حجاب دھڑکتے دل سے امی والے کمرے کی طرف گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولا مناسب نہیں سمجھا۔ یقیناً پیمپو بھی اندر ہی موجود تھیں۔ وہ گھر کے ڈرائنگ روم میں سے گزر کر اسٹڈی والے کمرے کی طرف آ گئی۔

”فیصل..... فیصل! کہاں ہو بھی؟“ اس نے چھوٹے بھائی کو پکارا۔

وہ تو نہیں آیا لیکن واش روم کی طرف سے ابو نمودار ہو گئے۔ حجاب نے ان کا چہرہ دیکھا اور دہل گئی۔ وہاں دنیا بھر کی سبید کی سٹ آئی تھی۔ آنکھوں میں ایک ایسی بیچ گئی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ٹھٹھکے ہوئے انداز میں ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جب وہ اچانک مڑے اور تیز قدموں سے اسٹڈی روم میں داخل ہو گئے۔ اپنے پیچے انہوں نے دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ لگا اس کے بالائی حصے کا شیشہ ٹوٹ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ جس طرح لوہا متناطیس کی طرف کھینچتا ہے وہ اپنے ابو کی طرف لپکی۔

”ابو جی! ابو جی!“ اس نے کرب میں ڈوب کر کہا اور دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بولت تھا۔ وہ رو رہی۔ کسی ایسی بچی کی طرح جو چوٹ کھا کر آئی ہو اور اپنے باپ سے اپنا درد بیان کرنا چاہتی ہو۔ ”ابو جان دروازہ کھولیں۔ پلیز ابو جان!“ اس نے کہا اور دھک دیے لگی۔

اندر بیکسر خاموشی تھی۔ وہ ہولے ہولے دستک دیتی رہی اور پکارتی رہی۔ ”ابو جی! دروازہ کھولیں میری بات سنیں۔ ایک بار میری بات سن لیں۔“ کوئی جواب نہیں آیا۔ آہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب جب اسے چوٹ لگی جب جب کوئی کھلونا ٹوٹا تھا۔ جب جب اسے کسی ڈکھنے غیر تھا۔ اس نے اپنے ابو کو پکارا تھا۔ وہ تڑپ کر طرف سے آئے تھے۔ کبھی گود میں اٹھایا۔ کبھی سینے سے لگایا اور کبھی ماتھا چوما تھا۔ آج وہ ابو دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے۔ اس کی جگہ چاہا کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی بن جائے۔ ایسی معصوم زبان میں پکارے کہ اس کے ابو دروازہ کھول دیں۔

وہ ان کی باتوں سے چٹک نہ سکی۔ ان سے کہے۔ ”ابو میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر بھی مجھے مارا گیا ہے۔ ابو مجھے چوٹ لگ گئی ہے۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔“

ابو اسے گود میں اٹھا لیں۔ اسے پکارا کہ ان کے سینے سے لگ کر وہ سب کچھ بھول جائے یا یک است اپنے دل میں نہ دے۔ اس کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے حذر کر لیا۔ اس کے سینے سے لگ کر وہ تیز سرگوشی میں بولا۔

”تو کیا کر رہی ہیں باجی! ادھر امی کے کمرے تک آؤ اور یہاں جا رہی ہیں۔ وہ ابھی ابھی سوئی ہیں۔“ حجاب دروازے کے سامنے سے اٹھی اور سسکتی ہوئی اپنے چھوٹے بھائی کے گلے لگ گئی۔ فیصل کے انداز میں گھٹکی نہیں تھی۔ اس کے بازو بے جان رہے۔ وہ کراہی۔ ”فیصل! میں بے تصور ہوں۔ مجھ پر اثر ام لگائے جا رہے تھے۔ تم تو جانتے ہو تمہاری بہن کیسی ہے۔ کچھ ایسا کر سکتی ہے؟ بتاؤ کیا وہ کر سکتی ہے؟“

فیصل خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھوڑ رہے تھے۔ اس نے ہشکل اتھاہی کہا۔ ”آپ کو ابھی یہاں کھڑا آ جائیے تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے امی کی طبیعت کتنی خراب ہے۔“

”تو میں کہاں جاؤں فیصل! تم ہی بتاؤ کہاں جاؤں!“

”میں آپ کو کیا بتاؤں؟ لیکن اگر امی کو ان حالات کی بجائے کبھی کوئی توجہ نہ رہے نہیں رہ سکیں گی۔“

”اچھا..... مجھے بتاؤ فیصل کیا تم بھی ان باتوں پر یقین کرتے ہو جو مجھ سے بارے میں کہی جا رہی ہیں؟“

اس سے پہلے کہ فیصل جواب میں کچھ کہتا۔ سامنے دروازے میں پیمپو زاہدہ کی صورت نظر آئی۔ حجاب کو دیکھ کر

وہ مومن سے اٹھ کر قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے پھپھو کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ پچکیاں لیتے ہوئے بولی۔
”پھپھو! مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اتنی بڑی نہیں جتنی مجھے سزا دی جا رہی ہے۔ کسی نے میری بات سنی ہی
نہیں۔ کسی نے مجھے معافی کا موقع ہی نہیں دیا۔“

”کیا معافی چاہ کرے گی تو کیا رہ گیا ہے تیرے پاس کہنے کو۔“ پھپھو نے اپنے گھٹنے جھٹک کر اسے دور
پٹانے کی کوشش کی۔

وہ ان کے گھٹنوں سے چمٹے چمٹے ہوئی۔ ”پھپھو! میں نے اس گھر میں بہت کچھ سہا ہے۔ جتنا آپ لوگوں کو پتا
ہے اس سے دس گنا زیادہ جمیلا ہے۔ کبھی آف نہیں کی لیکن پھپھو! میں کیا کروں۔ جو آخری ظلم مجھ پر ڈھایا جا رہا تھا وہ
مجھ سے نہیں جمیلا گیا۔ مجھے خود اپنی ہی سمجھ نہیں آتی تھی کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن یہ
مجھ سے ہوا ہے پھپھو! میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔ لیکن مجھے اس غلطی پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بندے نے مجھے دھکیل دھکیل
کردوار کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ اپنی سوچوں پر میرا اختیار ہی نہ رہا۔ آپ اسے جرأت کہہ لیں۔ مزاحمت کہہ لیں یا
محبت کر۔ ہوا مجھ سے۔ لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے
کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں ہادی صاحب کے ساتھ گھوم پھری ضرور ہوں لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے میں
بعل کے ساتھ گھوموں یا آپ کے ساتھ گھوموں۔ مرد تو سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے کیا عورت کے لیے اتنی
ی رعایت بھی نہیں۔“

”لیکن ڈکیوں گھوم پھرتی نہ کیا بن گئی تھی تیری جان پر؟ کیا ہمارے خاندان میں پہلے کبھی ایسا ہوا ہے۔ بغیر کسی
کی اجازت کے تو ایک غیر مرد کے ساتھ گھر کو کتاب میں چھپا کر پارکوں اور ہوٹلوں میں پھرتی رہی۔ کون قبول کرے
گا۔“

”پھپھو! جن دنوں میں ونس گئی۔ ان دنوں مجھے پہلی بار پتا چلا تھا کہ جلال اور ارم میں تعلق ہے۔ مجھے یوں لگا
تھا جیسے میرے لیے دنیا میں سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اتنی گھٹن تھی پھپھو! اتنی گھٹن تھی کہ کیا بتاؤں۔ مجھے لگتا تھا کہ میری
مائیں رگ گئی اور میں بڑبڑ رہی ہوں۔ میرا دل چاہا کہ میں کچھ دنوں کے لیے سب کچھ بھول بھال جاؤں۔ کوئی اور
لوگ بن جاؤں۔ کچھ اور ہو جاؤں۔ کھلی ہوا میں کھل کر سانس لوں۔ شاید بے موت مرنے سے بچ جاؤں۔ وہ جو تصویر
آپ نے میری دیکھی ہے ان ہی دو تین دنوں میں اتاری گئی ہے۔ میں مانتی ہوں یہ میری غلطی تھی۔ میں کیا بتاؤں
پھپھو! مجھے جب ارم اور جلال کے ہمارے میں کوئی بات پتا چلتی تھی۔ مجھے کچھ ہو جاتا تھا۔ میں جلال سے تو کچھ
گھٹن کہہ پاتی تھی مگر میرے اندر ایک شدید گھٹن ہے ابھرتی تھی۔ اس گھٹن سے نکلنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں چلاتی
تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بر عمل کار عمل ہوتا ہے۔ شاید یہ بھی ایک زوغلن ہی تھا کہ میں چند بار ہادی صاحب کے ساتھ
گھومنے پھرنے کے لیے نکلی۔ وہ بہت شریف بندہ ہے جس میں ایسی ایسی قسم کھاتی ہوں پھپھو! میرے اور ان کے
ملاقات کو نہیں ہے۔“

”کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے دادیلا کرنے سے وہ داغ دھل جائے گا جو تمہارے اور ہم سب کے چہروں پر لگا

ان کے چہرے پر لکھروں کا جال سا پھیل گیا۔ بچپن میں جب وہ اپنی بڑی بڑی سفید آنکھوں سے حجاب اور فیصل اور دیگر
کو گھورتی تھیں اور کسی بات پر جھڑکتی تھیں تو وہ بالکل سہم جایا کرتے تھے۔ آج بھی حجاب کی کچھ بھی کیفیت ہوئی۔
انہوں نے سرسراہٹ آواز میں کہا۔ ”کب آئی ہو تم؟“
فیصل نے کہا۔ ”ابھی پانچ دس منٹ پہلے۔“

انہوں نے سینک لے کر پیچھے سے ایک تیز نگاہ حجاب پر ڈالی اور حکم سے بولیں۔ ”ادھر آؤ میرے ساتھ۔“ انہیں
کے بعد وہ فیصل سے مخاطب ہوئیں۔ ”تم امی کے پاس جاؤ۔“

حجاب نے ایک انفر اسٹڈی کے بندہ دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کسی معمول کی طرح پھپھو کے پیچھے چل
دی۔ وہ اسے لے کر چھوٹی سیریلوں کی طرف آگئیں۔ سیریلوں کا دروازہ لاک تھا وہ اسے کھولنے لگیں۔ اسی دور ان
میں حجاب کی نگاہ سامنے کمرے میں گئی۔ یہ وہی میٹن کی دیوار گیر تصویر والا کمرہ تھا۔ حجاب کی نگاہ تصویر پر پڑی تو اس کی
جیسے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج اس کی آنکھوں میں حجاب کو دکھائی پر چھائیاں نظر آئیں۔ اس نے جیسے کسی
کی زبان میں حجاب سے کہا۔ ”تم نے اب سب کچھ دیکھ لیا تا حب! یہاں چھوٹی سی جسامت کو بھی بغاوت کا دم ہوا
جاتا ہے۔ تم سے بھی شاید وہی غلطی ہوئی جو مجھ سے ہوئی تھی۔ تم نے کئی بار کچھ کرنا چاہا ہے۔ تمہیں ذرا سے قدم
جمانے چاہیے اور یہی تمہارا ناقابل معافی گناہ بن گیا۔“

پھپھو اسے لے کر بالائی منزل کے ایک کمرے میں آگئیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ گرجیں۔ ”اب کیا
کرنے آئی ہو یہاں؟ ماں کی جان لینے آئی ہو؟ کوئی کسر رو گئی تھی جو اب پوری کرنی ہے؟“

وہ ہلک پڑی۔ ”پھپھو! میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میں کسی
”ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ تمہیں جانتے ہیں۔ لیکن جو کچھ سامنے آ رہا ہے اسے کیسے جھٹلائیں کس منہ سے
کریں۔ ٹوٹنے کا لگتی ہے ہم سب کے منہ پر۔ تیرا باپ مسلسل رو رہا ہے تین دن سے۔ تیری ماں تیرے دکھ میں
پہلے ہی پڑی ہوئی ہے بستر پر۔ اب اور کیا چاہتی ہے تو..... اور کیا چاہتی ہے؟“ انہوں نے آخری الفاظ اتنے زور
سے کہے کہ پورے کمرے میں گونج سنائی دی۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”پھپھو! اگر آپ بھی مجھے گناہگار سمجھتی ہیں تو پھر اپنے ہاتھوں سے مجھے ختم کر دیجئے۔
میری جان لے لیں۔ میں آپ سب کو اپنا خون معاف کرتی ہوں۔ پلیز پھپھو! ماریں مجھے۔“

”رونے چلانے سے جھوٹ بچ نہیں بن جائے گا۔ مجھے بتاؤ تم۔ کیا تم ونس میں اس لڑکے سے ملتی نہیں رہی
ہو۔ کیا تم چوری چھپے یہاں ہوٹل میں اس کے پاس نہیں جاتی رہی ہو؟ تم نے نئی چادر خریدی، نئے جوتے اور ایک لپا
تا کہ کوئی تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر پہچان نہ سکے۔ تم نے اپنے شوہر کو دھوکا دیا، ہم سب کو دھوکا دیا۔ یہاں مایا
کہہ کر جاتی تھی کہ شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں اور وہاں اس کے ساتھ ہوٹلوں میں کھانے کھاتی تھی۔ کیا تم نے
ونس میں ساری شرم حیا، اتار کر پتلون اور شرٹ میں تصویریں نہیں بنوائیں۔ کس کس بات کو جھٹلاؤ گی تم۔ تمہارا
کس کس بات پر پردہ ڈالیں گے ہم۔ تم نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھو۔“

ہے۔ عورت کی عزت اتنی جلدی برباد ہوتی ہے یہ سب کچھ بتا رہے اور تمہاری عزت برباد ہو چکی ہے۔
 ”کیوں برباد ہو چکی ہے پھپھو!“ وہ کہتی۔ ”مجھے اتنی سزا دیں جتنی میں نے غلطی کی ہے۔ میں نے چوری کی ہے تو میرا ہاتھ کاٹ دیں، مجھے پھانسی تو نہ چڑھائیں۔“

”تو نے چوری نہیں کی۔ تو نے ڈاکہ ڈالا ہے۔ اور اس ڈاکے میں تم سے ہم سب کی عزت کا خون بہا ہے۔“ پھپھو نے بے حد دکھ سے کہا۔ ”کیا تو سنسی سی بیٹی تھی۔ کیا تجھے پتا نہیں تھا کہ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ یہاں عورتوں کی غلطیوں کو معاف کرنے کا رواج نہیں ہے۔ ان کو سزا دینے کے لیے یہاں ڈھونڈے جاتے ہیں، اور پھر انے تو ایک ایسا بہانہ دیا کہ جس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا۔ جب تجھے پتا تھا کہ تو جلال کو اس کے ارادے سے نہیں روک سکتی۔ پھر اپنے اندر بغاوت کے خیمے اٹھیں پیدا ہونے دیئے تو نے؟ جب میرے پردے پر ہلکے ہونے سے تو پھر کیوں پھر پھڑائی۔ خود کو لہو لہان کیا اور ہم سب کو بھی۔ تجھے پرے درجے کا یوقوف اور اس کی پھانسی لگائی گئی۔“

”میں جانتی ہوں۔ مجھ سے بہت بُرا ہوا پھپھو! لیکن اب بتائیں میں کیا کروں۔ میں پھر کہتی ہوں۔ اگر میرے مرنے سے کچھ بہتر ہو سکتا ہے تو میں اسی وقت جان دینے کو تیار ہوں۔“
 ”جان دینا آسان ہوتا ہے، زندگی جتنا مشکل۔ اب یہ زندگی جیسی بھی ہے اس کا سامنا کر۔“
 ”مجھے راستہ بتائیں پھپھو! مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا۔ اب اس گھر میں میرے لیے تکلیف اور ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھ سے بڑا یوقوف کون ہے۔ جلال اب شادی بھی کرے گا۔ مجھے چھوڑنے کی نوک پر بھی رکھے گا۔ وہاں میرے ساتھ بہت بُرا ہونے والا ہے۔ میں ان دیواروں میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔“
 ”اس لیے تو کہہ رہی ہوں۔ مرنا آسان ہوتا ہے زندہ رہنا مشکل۔“

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ ”کون؟“ پھپھو نے پوچھا۔
 ”میں ہوں فیصل!“ باہر سے ہم آواز سنائی دی۔
 پھپھو زائدہ نے دروازہ کھولا۔ فیصل نے دھیسے لیچے میں کچھ کہا۔ پھپھو زائدہ حجاب سے مخاطب ہو کر بولیں۔
 ”تیرے ابو بڑا رہے ہیں مجھے ابھی آتی ہوں۔ تو نیچے نہ آ جانا وایلا کرنے کے لیے۔“

دروازہ زور سے بند کر کے دو نیچے چلی گئیں۔ حجاب کو لگ رہا تھا کہ وہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہے۔ بالکل بے سہارا۔ بے خانراں۔ سینے میں اس کا دل چڑیا کی طرح پھڑک رہا تھا۔ یہ دروازہ جو پہنچنے سے اس کے ساتھی تھے ایک دم اجنبی نکلنے لگے تھے۔ جیسے وہ بھی اس سے خفا ہو چکے ہوں۔ اس کا جی چاہا کہ نیچے چلی جائے۔ ابو کی ہانکوں سے لپٹ جائے۔ مگر پھپھو حکم سے گئی تھیں سبک رہنے کا۔

پھپھو کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ ان کی سفید آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں پہلے سے گہری تھیں۔ دروازہ چرے کی لکیروں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے دروازہ دوبارہ اندر سے بند کیا۔ ٹھہری آواز میں بولیں۔
 ”حجاب! کل شام جلال آیا تھا یہاں گھنڈہ ڈیز گھنڈہ تمہارے ابو کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے بہت کچھ کہا جو ہمیں متناظر

ہم اس کے سامنے بولنے کے قابل کہاں ہیں۔ قرینے کی وجہ سے پہلے بھی نہیں تھے۔ اب تو کوئی کسری نہیں رہی۔
 ”تیرے ابو کے دل پر بڑا بوجھ ہے۔ مجھے تو ڈر ہے انہیں کچھ ہونہ جائے۔“
 ”میرے ابو کی کو کچھ نہ ہونے دیجیے پھپھو! وہ پہلے ہی ڈکھوں کے مارے ہوئے ہیں۔“ وہ ان کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”اس نے پھپھو کے چہرے پر پہلی بار قدرے نرمی کے آثار دیکھے۔ ان کی سفید آنکھوں میں غم کی تیر گئی۔ وہ بولیں۔
 ”بیٹی! میں تیری منت کرتی ہوں۔ جو کچھ بھی ہے لیکن تو واپس اپنے گھر چلی جا۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے ہماری رشتہ کی عزت بچ سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں تیرے لیے بہت مشکل ہو گا لیکن اگر ہم سب کی بھلائی چاہتی ہے تو یہ کرنا پڑے گا۔“
 ”پھپھو! لیکن۔۔۔۔۔۔“

”نیکن سے آگے انکار شروع ہوتا ہے بیٹی! انکار نہ کر۔ یہ دیکھ میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ جو کچھ ہو گا اس کے بعد شوہر بیویوں کے منہ پر فوراً طلاق کے تین طمانچے مار دیتے ہیں لیکن جلال تجھے اب بھی رکھنے کو چاہے۔ یہ موقع گنوا دیا تو بہت پچھتا تا پڑے گا۔ جا کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگا لے اور اس کی چست کی پناہ لے۔ یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔“

حجاب نے سر اٹھا کر پھپھو کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ وہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دل دکا کر لے کر کہا۔
 ”پھپھو! میرے ابو جی کہا کہتے ہیں؟“
 ”وہ بھی یہی کہتے ہیں بیٹی۔“

آہستہ دھاروں کی طرح حجاب کی آنکھوں سے ٹپکے اور نیل زدہ رخساروں پر پھیلنے لگے۔ کچھ دیر کرے میں نے خاموشی جاری رہی۔ پھر حجاب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پھپھو نے آگے بڑھ کر اسے لگے لگایا۔ آہستہ آہستہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ وہ خاموشی سے ان کا کندھا جھکوتی رہی کچھ دیر بعد گھٹ خورہ انداز میں بولی۔ ”ابو جی سے کہیں ایک بار مجھ سے مل لیں۔“

”ابھی نہیں جب! ابھی وہ بہت پریشان ہیں۔ کچھ دن بعد میں خود ملواؤں گی جنہیں ان سے۔“
 وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ پھر بولنے سے گویا ہوئی۔ ”اچھا مجھے ایک بار امی کی صورت تو دیکھ لینے دیں۔“
 دروازہ تذبذب کے بعد بولیں۔ ”پہلے تو ادھر پہنچو۔ میں نیچے سے ہو کر آتی ہوں۔ پھر تجھے بتاتی ہوں۔“
 وہ نیچے چلی گئی۔ حجاب اپنے ہی گھر میں غریبوں کی طرح سڑی سڑی چلی رہی۔ اس کا گھر کون سا تھا۔ یہ والا درس ہوا کوئی بھی نہیں۔ کیا عورت کا اپنا گھر کوئی بھی نہیں ہوتا۔ کیا وہ زندگی کا جھڑکا اپنے گھر کے بغیر ہی گزار دیتی ہے۔ چند منٹ بعد پھپھو آئیں اور اسے لے کر نیچے آگئیں۔ ایک بار پھر کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ”وہ دو اکھا کر سوئی ہو چکی ہیں۔ بس دروازے سے ہی دیکھ لو۔“ پھپھو نے سرگوشی کی۔

کر کے دروازے کو نیم داکر کے اس نے امی کو دیکھا۔ وہ کروٹ لے کر لیٹی ہوئی تھیں۔ برسوں کی پیارا نظر

یہ سہولتیں تھیں؟ دو اپنے اندر ہی جیسے بھولہاں ہوتی رہتی تھی۔ اس نے دن میں ہادی سے ملاقات کے حوالے سے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا تھا وہ جلال نے خاموشی سے سن لیا تھا لیکن امتیاز نہیں کیا تھا اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

باہر کے حالات کی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک دن جلال کے دو تین خشک جملوں سے بس اسے اتنا پتا چلا تھا کہ اس کی ان کی طبیعت اب بہتر ہے ان کے میٹ بھی ٹھیک آئے ہیں۔

تین دن کے بعد جلال کی آمد بند ہوگئی۔ اب ایک بار پھر وہ بھی اور شریفاں تھیں۔ جاب نے شریفاں کو سختی سے دبا دیا کہ کبھی تھی کہ وہ باہر کی کوئی خبر اسے نہیں دے گی۔ اسی نے شریفاں کا سیل فون بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اسے شک تھا کہ شاید ہادی کے پاس شریفاں کا نمبر موجود ہے اور وہ اس نمبر پر رابطے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اب وہ ہادی کا خیال بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے نفرت سی ہوگئی تھی اس کے تصور سے۔ نماز کے بعد بھی وہ بات نہ کرتی تھی یہ دعا کرتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو اور اب کبھی پلٹ کر اپنی صورت نہ دکھائے۔ وہ اپنے آپ کو بھی کوئی تھی کہ ایک بیانی کیفیت کے زیر اثر وہ اپنی حدود کو بھول گئی۔ ہادی کے ساتھ کھوتی پھرتی رہی اور فراموش کر گئی کہ وہ دل میں سچائی بھی ہو تو ظاہری عمل لوگوں کو انکلیاں اٹھانے کا موقع دیتا ہے اور مرد و زن کی بے جا قربت میں شر کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہادی کا اس سے بار بار رابطہ کرنا، اس کے گھر تک پہنچ جانا اور فونو گراف کے حوالے سے اس کی غفلت یہ سب چیزیں جاب کو دکھ دیتی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی کہ شاید عورت کے معاملے میں سب مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں جن سب باتوں سے قطع نظر کسی وقت وہ خود بھی اپنا تجربہ کرنے بیٹھ جاتی۔ اسے لگا کہ اس کے دل و دماغ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں ایک اہم کردار بینش والے دردناک واقعہ کا بھی ہے۔ اس نے انسانی کے اثرات نے اندر ہی اندر اس میں بڑی بڑی اور جب باہر کے حالات بھی دگرگوں ہوئے تو اس کے اندر مزاحمت کی چنگاریاں چمک اٹھیں۔ وہی حقیقت کہ انسان کے اندر کے جذبے کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طور اپنا اظہار ضرور کرتے ہیں۔

چوتھے روز جلال نے دوبارہ درس والے گھر آنا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ بھی تین دن اس کے پاس رہ کر وہ واپس نہ گئے۔ جلال کا یہ سب دھوپ بھٹاؤں کی سی کیفیت تھی۔ لیکن دھوپ بھی جلانے والی اور بھٹاؤں بھی۔ حسب توقع تین دن گزرنے کے بعد جلال کی آمد پھر شروع ہوگئی۔ وہ ہر وقت ڈری رہتی تھی کہ کہیں باتوں باتوں میں پھر کوئی نازک مضمون نہ چمڑ جائے۔ مگر شکر تھا کہ جلال ہمیشہ قریب کی کسی بات کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ اس کے لیے کچھ جتن کر بھی آیا تھا۔ کچھ جوڑے کپڑوں کے تھے۔ ایک راز دگیزی تھی۔ اس مرتبہ وہ بونل میں کھانا کھانے بھی گئے۔

یہ ساری دلکش باتیں تھیں۔ لیکن ان کے پیچھے جو وجوہ تھی وہ بھی جاب انہی طرح جانتی تھی۔ اور اس وجہ نے جلال کی ان مہربانیوں کو بالکل بے معنی کر دیا تھا۔ وہ اپنے غلطے کے مطابق اپنی دونوں بیویوں میں عدل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے شک اسے ایسا کرنا چاہیے تھا اور خدا کا حکم بھی یہی تھا مگر اس عدل کی بنیادی شرط "محبت" اس معاملے میں سے اوجھل تھی۔ اور سچا کی اس سارے عمل کو کھوکھلا دے مٹتی کرتی تھی۔ ایک دن جاب نے جنت کر

آتی تھیں۔ گھوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ سائینڈ نیبل پر دو آؤں کی بھرمار تھی۔ اس نے اپنی سسکی بھٹک روکی۔ آنکھوں میں ماس کی پیشانی چوی اور پلٹ آئی۔

○.....○.....○

درس والا گھر یا پراگم گھر اب ایک زندان تھا اور وہ اس کی قیدی تھی۔ اس زندان کا داروغہ کون تھا۔ شاید وہی شخص جو تین برس پہلے اسے بڑی شان سے بیاہ کر لایا تھا۔ زندان تو بہر حال زندان ہوتا ہے لیکن جب قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اور پکڑ کر وہ داروغہ زندان میں ڈالا جاتا ہے تو اس کی سزائیں مزید کڑی ہو جاتی ہیں۔ جاب سے بھی تو یہی تصور ہوا تھا۔

جاب نے خود کو درس والے گھر کی دیواروں تک محدود کر لیا۔ اس نے سیل فون مستقل طور پر بند کر دیا تھا۔ لائن فون کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھا لی تھی۔ سات آٹھ روز تک اسے کچھ خبر نہیں ہوئی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اس کی قدم بھی گھر میں نہیں پڑے تھے۔ نویں روز جلال گھر میں آیا۔ اس کے پاس کچھ کاغذات تھے۔ اسات لکھے۔ اس نے کچھ دیکھ کر کلمات ادا کیے اور پھر کاغذات جاب کے سامنے رکھ دیے۔ وہ متحیر تھی۔ لڑائی ہار چکی تھی۔ اسے اپنا شر تاج کے حوالے کرنا تھا۔ اس نے خاموشی سے دستخط کر دیے۔

تین روز بعد شریفاں ہی کی زبانی اسے پتا چلا کہ جلال نے ارم سے نکاح کر لیا ہے اور اب وہ اس گھر میں مزرعہ جلال ہے۔ نکاح میں دونوں طرف کے بیس تھیں افراد ہی شریک ہوئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ بعد میں کسی وقت دلچسپی کی دعوت کی جائے گی۔ ارم نے اس گھر میں اپنے لیے وہی کمرہ چنا تھا جس کا چناؤ پہلے بھی جاب کے دل کا چن کر رہا تھا۔ وہ نکاح کے آداب جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا اسے اب بہت کچھ جھیلنا پڑے گا۔

آٹھ دن بعد جب جلال کا کچھ ذاتی سامان درس والے گھر میں آیا تو جاب حیران ہوئی۔ یہ جلال کے کپڑے تھے، اس کے جوتوں کے چند جوڑے، واش روم کا سامان اور اس طرح کی دیگر اشیاء۔ سامان لانے والے ملازمین نے بتایا کہ رات کو جلال صاحب تشریف لائیں گے، کھانا بھی اور دوسری کھانیں گے۔

نوبے کے لگ بھگ جلال آ گیا۔ اس کے سوڈ کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہر حال وہ آگ بگولا یا سچ پانچ نہیں تھا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں کچھ دیر باغیچے میں چہل قدمی کرتے رہے۔ جاب نے لرزتی آواز میں اسے شادی کی مبارکباد دی۔ جلال کی باتوں سے پتا چلا کہ اس نے بیٹے میں تین دن یہاں اور تین دن نے گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

وہ اس پر اعتراض کرنا چاہتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی نئی شادی ہوئی ہے وہ اپنی لویا بتا دی کہ وقت دے لیکن اعتراض کرنے، بلکہ شاید بولنے کا حق بھی وہ کبھی نہیں تھی۔

جلال پورے تین دن درس والے گھر میں رہا۔ لیکن اس سے جاب کو کوئی خوشی نہیں ملی خوشی تو دور کی بات ہے۔ وہ ایک عجیب سے درد بردار تھا۔ وہ خود کو ایک بیوی سے زیادہ قیدی سمجھ رہی تھی۔ ایک ایسی قیدی تھی کہ کسی شرمناک جرم میں مزا ملی ہو اور جس کی نگاہیں جیل حکام کے سامنے ہر وقت جھکی رہتی ہوں۔ یہ کیا احساس تھا!

میں نے اسے کافی تھکا دیا ہے۔ وہ کافی دیر تک اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر اس نے ذرتے ذرتے اسے
مہر سے بلایا۔ "جلال... جلال..."

اس نے نیند میں بیزارگی سے کھٹکھٹا کر وٹ بدل لی۔ وہ دیر تک صوفے پر بیٹھی رہی۔ پھر کمرے میں جا
کر شریاں سے باتیں کرنے لگی۔

شرییاں نے کہا: "بھائی جان کے سر میں درد تھا۔ گولی بھی کھائی ہے انہوں نے۔ بارہ بجے کے قریب حجاب بھی
ہائی کمرے میں چلی گئی، اور بہت ہولے سے جلال کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ اسے جگا نہیں چاہتی تھی۔

صبح جلال کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ حجاب سے پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ جو نئی حجاب انھی اور بازو پر اٹھا کر
اپنے بالوں کو باندھنا شروع کیا۔ وہ اندر آ گیا۔ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ غصے سے بولا: "کیا ہو گیا تمہارا کمرہ؟ تم
نے جگایا ہی نہیں۔"

"میں نے جگایا تھا جلال! آپ اٹھے نہیں۔"

"نہیں کہہ رہی ہو تم۔" وہ پھنکارا "سورہا تھا تو نہیں گیا تھا۔ تمہارا دیسے ہی ارادہ نہیں تھا جانے کا۔ بہانے
بھی کرتی ہو تم۔ سوگ منار ہی ہو تم پتا نہیں کس کس پیارے کا۔"

جلال! میں تم کھاتی ہوں کہ.....

"نہیں مت کھا۔" وہ گرجا۔ "جھوٹی ہے تو ہمیشہ جھوٹ ہی بولے جس ٹوٹے۔ اب بھی جھوٹ بول رہی ہے۔
میں اندھ نہیں ہوں۔ سب دیکھتا ہوں۔ پرانے یار نے لہو لہان کر رہے ہیں تیرے دل کو۔"

"خدا کے لیے جلال! اگر تمہیں مجھ پر۔"

"بھائی! اصرار ہے۔ بہتان ہے۔ وہ دلکش نہیں کر بولا پھر پیش میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آلو کی پنچھی، حرام
آلو کی پنچھی بہتان ہے؟" اس کا پہلا چمچر اتنا زور دیا کہ حجاب کا ٹکڑا ہلک کر تالین پر جا گری۔ اس کے بعد جیسے اسے کچھ
ہوئی ہی نہیں رہا۔ لاتیں، چمچر، مگھونے، اتنے تو اتنے ہی کے جسم پر پڑے کہ وہ بھول گئی، جسم کے کون سے حصے کا
دفعہ کرے اور کون سا حصہ کی بے رحمی کے سامنے کھلا چھوڑ دے۔ اس کی ناک کی سانسن سے پھٹ گئی۔ زیریں لباس
نظر آئے گا۔ وہ گری ہوئی تھی۔ جلال نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ اس کو لگا کہ سانس رک جائے گا اور وہ مر
جائے گی۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا اور وہ سانس کے لیے ترپنے لگی۔ یہی وقت تھا جب شریاں روتی چلاتی اندر
آئی اور جلال کے قدموں میں گر پڑی لاس کی زور اٹھا وہ آواز حجاب کے کانوں میں پڑی۔

"وڑے بھائی جان! ناف کر دیں۔ مر جائے گی نہ سیم ہو جائے گی۔"

اس کی نگاہیں وحشت لاری تھیں۔ بس اتنا چاہتا تھا کہ وہ سانس کے لیے تڑپ رہی ہے اور اس کی گردن پر ایک بے
دم پاؤں ہے۔ مجروح موت کے منہ سے پلٹ آئی۔ گردن پر سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔ اکھری ہوئی ہوا ہوائے دار سینے میں
داخل ہو گئی اور اسے زندگی کی طرف واپس کھینچنے لگی۔ وہ بے تحاشہ کھانسنے لگی۔ اسے اٹھ بیٹھی۔ اسے اٹھایا نہیں۔
معدہ توکل دو پہر سے شامی تھا وہ سب کچھ اٹھ دیتی۔ جلال کی گردن آواز اس کے کانوں کو مجروح کر رہی تھی، ٹو

کے کہہ دیا، آپ کہیں گھومنے پھرنے نہیں جائیں گے۔ میرا مطلب ہے۔ شادی کے بعد ارم کی خواہش ہو گی چھوٹی
کہیں گزارنے کی۔

"کیا مطلب؟"

"اسے لے جائیں کہیں۔"

"اس میں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جب جانا ہوگا، چلا جاؤں گا۔" جلال نے خشک لہجے میں
کہا۔ پھر اسے سر تپا دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور جو کمرے میں لایا تھا۔ ان میں سے کسی کو بھیجا یا تک نہیں تم نے۔ کیا پتہ
نہیں آئے؟"

"نہیں... نہیں... ایسی بات تو نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا وجہ ہے۔"

وہ کہنا چاہتی تھی، وجہ یہی ہے کہ دل مر گیا ہے لیکن اسے کہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بولی "ٹھیک ہے م۔"

پہن کر آتی ہوں۔"

"نہیں... اب ضرورت نہیں۔" وہ بٹلے بننے لہجے میں بولا اور آٹھ گھنٹہ کی طرف چلا گیا۔

چوبیس بجیں روز بعد ہی وہ کھچاؤ نمایاں ہونے لگا جس کا ہوتا بالکل منطقی تھا۔ جب حجاب دھالے تین دن شروع
ہوتے تھے تو پہلا دن تو قدرے بہتر نظر آتا تھا۔ مگر میں اور بیڈروم میں بھی جلال کا موڈ قدرے بہتر تھا۔ لیکن دوسرے
دن شام ہوتے ہوتے ایک طرح کی بیزارگی جلال کے انداز میں نمایاں ہونے لگی تھی۔ وہ جیسے وہاں ہی کھڑی ہو کر
لگتا تھا۔ طبیعت میں جسٹھلاہٹ سی آ جاتی تھی۔ تیسرا دن وہ یکسر خراب موڈ میں گزارتا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے
نکلنے کی بہت جلدی ہوتی تھی۔

وہ روم کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ہلکی بارش کے بعد موسم ٹھہرا ہوا تھا۔ حجاب کے تین دن آج شروع ہوئے تھے۔
جلال رات نو بجے پہنچ گیا۔ مگر آتے ہی اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ وہ فون سنتے سنتے اوپر چست پر چلا گیا۔ حجاب
جانتی تھی یہ ارم کی کال ہوگی۔ یہ کال دس پندرہ منٹ سے پہلے ختم نہیں ہوئی۔ وہ پہلے ہی فون کر لیتی تھی مگر اب اس کی
کالیں لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ حجاب کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ کرنے کے قابل کہاں تھی۔ پہلا
آداب شکست جانتی تھی اور جانتی ہی تھی۔

جلال کا حکم تھا کہ آج کھانا باہر کھائیں گے، وہ تیار ہو جائے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب وہ تیار ہونے کے
لیے چلی گئی۔ جلال کا لایا ہوا ایک نیا سوٹ بڑی دیر تک ہاتھوں میں پکڑے کھڑی رہی۔ اسے لگا کہ یہ لوہے کا لباس
ہے اور آگ کی طرح تپا ہوا ہے۔ خود پر جبر کر کے اس نے اسے پہنا پھر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آئی۔ اس نے سوچا
کاش کوئی ایسا میک اپ ہو جو اس کے چہرے کو چھپالے۔ خاص طور سے اس تاثر کو چھپالے جو زنداں کے دامد
دیکھ کر تادم قیدی کے چہرے پر آتا تھا۔

وہ تیار ہو کر کمرے میں پہنچی تو جلال بستر پر نیم دراز تھا۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے وہ سو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے

وہ تیار ہو کر کمرے میں پہنچی تو جلال بستر پر نیم دراز تھا۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے وہ سو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے

اب بھی ہادی کے ہاتھ میں حجاب کا دیا ہوا پارکر قلم تھا۔ وہ ایک قلم کھل کر رہا تھا۔ اس طویل قلم کا خلاصہ کچھ اس

طرح تھا۔

میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو وہ نہروں کا شہر تھا
وہ ایک طلسمی رات تھی

مجھے یہی لگا کہ میں ہزاروں برس سے اسے جانتا ہوں

ہزاروں سال سے میں اس کی روشن پیشانی پر

اور بحر انگیز مسکراہٹ پر گیت کھلا رہا ہوں

ہزاروں سال گزرے ہیں جب سے وہ میرے سنہری پہنوں میں آ رہی ہے

محبت سے مسکرا رہی ہے

کیا ایسا ہوسکتا ہے کیا اس زندگی سے پہلے بھی کوئی زندگی موجود تھی؟

اس نے تو کیا میں وہاں چلت سکتا ہوں

جہاں پوری طرح اس کے دل میں بھی پیار کا سمندر موجزن تھا

یہ بے خبری نہ تھی وہ دوریاں نہ تھیں۔

ہاں جب بھی نظم، غزل یا گیت وغیرہ لکھتا تھا اس کی اندرونی تڑپ کچھ کم ہو جاتی تھی لیکن آج یہ قلم لکھ کر تڑپ

بھگوان ہو گئی۔ کیا مرض میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر نازک سی دستک ہوئی۔ پس کم ان

اس نے کہا۔

ایک اطالوی لڑکی نہایت چست مٹی کی مورت میں دروازے پر نظر آئی۔ وہ کافی حسین تھی۔ "مے آئی کم ان

دو دروازے انداز میں بولا۔

"ہاں۔" ہادی نے کہا۔

وہ اندر آ گئی اور پورا دھڑکتا ہوا کمرہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ چپ تھی مگر اس کا سارا جسم پکار پکار کر کہہ رہا

تھا کہ اس شب میں اور اس کمرے میں میری ساری رہنمایاں برائے فروخت ہیں۔ ان ہونٹوں میں ایسی کچھ جھنڈے

لکھ رہا تھا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"نہیں۔" میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔

"اوکے۔" اس نے خوش دلی سے کہا اور اگلے لمحے چپے بہت کم دروازہ بند کر دیا۔

ہادی نے نیا سگریٹ سلگایا۔ مگر اب سگریٹ سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ پتا نہیں دل و دماغ کی کیفیت کیا

تھی کہ اس نے وہ کام کیا جو شاذ و نادر ہی کرتا تھا۔ اس نے روم سروں کے درمیان آگاہی کا آرڈر دے دیا۔ چند منٹ

میں ہادی ملازم مہینوں کی سفید بوتل لیے آنے لگا۔ ساتھ میں دوست چمن کے پیسے تھے۔ ہادی نے بوتل کھول

ان چیزوں کے لائق ہی نہیں ہے۔ تجھے داس ہی نہیں ہے، یہ عزت اور یہ آرام، ٹوبس ماتم کر، سوگ منا اپنے ہونٹوں
سوتوں کا۔ اس نے زور سے ہاتھ مارا اور ڈیرنگ ٹیبل پر رکھی آرائش کی اشیاء چاروں طرف بکھر گئیں۔ پھر اس نے
دار و دروب کھولی۔ اس میں سے نئے سوٹ نکال نکال کر قمری برآمدے میں ڈھیر کر دیے۔ وہ جیسے غصے سے دیواروں پر
رہا تھا۔ اس نے پرفوم کی ایک بڑی بوتل توڑ کر ان کپڑوں پر چھڑکی اور لائٹ سے آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے غلط
بھڑکنے لگے۔ اس نے لیڈین راڈ و گھڑی، حجاب کا موبائل، چار جواہر اس طرح کی کئی چیزیں آگ میں پھینک دیں۔
شریٹاں، چوکیدار طارقی، ڈرائیور عثمان، ڈرے سے کھڑے تھے۔ جلال نے ایک الماری میں سے کچھ پلانے
کپڑے نکالے اور حجاب کے ساتھ بچھتے ہوئے دھاڑا۔ "یہ بہن اور اپنے منہ پر لعنت نہ سنا کہ بھٹی رو کر سے کے
اندروں اسی لائق ہے تو اس قابل ہی نہیں ہے کہ سچے کمرے سے نکالا جائے۔ تیرے جیسی سبے انتہائی عورتوں کے
لیے یہی حکم ہے کہ ان کو کمروں میں بند رکھا جائے۔ وہ پناہ سے نہیں مارے سیدھی ہونے والی ہوتی ہیں لائق ہیں۔"
تجھے کروں گا سیدھا۔۔۔ میں کروں گا۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے میں قیمتی کپڑوں میں ابھی تک چھوٹنے پڑے شعلے حرکت
کر رہے تھے۔

○.....○

ہادی غرابے ہونٹوں میں تھا۔ اس کے دل کی حالت عجیب تھی۔ ملازمہ شریٹاں سے حجاب کی حالت زار کا سن کر اس
کا چین سکون غارت ہو گیا تھا۔ حجاب کا خیال تو پہلے بھی ایک ہل اس سے جدا نہیں ہوتا تھا لیکن اب تو حجاب کے
سوا کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ یہ دیوانہ کر دینے والی سوچیں تھیں۔ وہ کہاں ہوگی، کیا کر رہی ہوگی، اس کے بارے میں
سوچ رہی ہوگی، کمرے میں رہ جانے والی تصویر بھی اس کے ذہن سے نکلتی نہیں تھی۔ یہ بڑی غلطی کی تھی اس نے۔

وہ یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ جبکہ گھومنا چاہتا تھا۔ دنیا کے عجائبات دیکھنا چاہتا تھا لیکن ہوا کیا تھا۔ وہیں
کی اس رات میں اس نے ایک لڑکی کو دیکھا تھا اور باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ اب اس کا ویرا ختم ہونے میں مشکل تھا
دن بچے تھے۔ شیخو بھائی کے کہنے پر ذہنی انسپکٹر ہاشم کو شش کر رہا تھا کہ کسی طرح ویرے کی ایکسٹینشن ہو جائے۔

ابھی تک کوشش کے باوجود اسے حجاب کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ شریٹاں کا سیل فون بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔

حجاب کے والدین کے مگر جانا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ پچھلی دفعہ بھی حجاب بہت ناراض ہوئی تھی۔ یہ بے خبری

اور دوری ہادی کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا رہی تھی۔ اسے ایک ایسے کرب کا احساس ہوتا تھا جس کا اسے کبھی تجربہ نہیں

ہوا تھا۔ تاہم ایک بات تھی۔ کرب کی اس بدترین صورت حال میں سے ایک چیز اچھی برآمد ہو رہی تھی۔ یہ شاعری

تھی۔ وہی شاعری جو کافی عرصے سے روٹھ چکی تھی۔ اب بڑے تواتر سے اس کے ذہنی دل پر دستک دے رہی تھی۔

اس نے پچھلے دو تین ہفتوں میں کوئی ڈیزہ درجن گیت لکھے تھے اور شیخو بھائی کو ارسال کیے تھے۔ شیخو بھائی اس

صورت حال پر بے انتہا خوش تھے۔ وہ ایک الم کی ریکارڈنگ شروع کرانے والے تھے اور دوسرے کی کاغذی چالاک

کر رہے تھے۔ ویسٹرن یونین کے ذریعے دو بھاری بھر کم رقم بھی انہوں نے ہادی کو ارسال کر دی تھیں۔

ہادی بولا۔ "میں روڈ پر کافی بڑا آئس کریم پارلر ہے سوزے کے نام سے۔"
"نہیں سر..... نہیں سر! میں سمجھ گیا۔"

"میں وہاں کھڑا ہوں گا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں بیس پچیس منٹ لگیں گے۔"
"ٹھیک ہے جناب! میں آ رہا ہوں۔" گلزاری نے کہا۔

"قریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں لب سڑک اس آئس کریم پارلر میں بیٹھے تھے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ یہ بچہ کی رات تھی، اس لیے روم جنیل حسین کی طرح چمک رہا تھا، تھرک رہا تھا اور جھوم رہا تھا۔

تہیہ کے بعد گلزار نے انکشاف انگیز آواز میں کہا۔ "ہادی صاحب! ارم قریباً ایک سال پہلے ایک پرائیویٹ کلینک "ڈکوریہ فورٹا" سے ایڈیشن کرا چکی ہے۔ وہ پچھلے سال ستمبر کی چوبیس سے اٹھائیس تاریخ تک کلینک میں باقاعدہ داخل رہی ہے۔ میرے پاس ڈاکو میٹری ٹیوٹ موجود ہیں۔"
اس نے دو تین ہیچر نکال کر ہادی کے سامنے رکھ دیئے۔

ہادی نے ہیچر دیکھے۔ یہ واقعی زبردست انکشاف تھا۔ ہیچر انگلش میں تھے اس لیے ہادی کو سمجھنے میں دقت نہیں آئی۔ یہاں باقاعدہ ارم چودھری کا نام اور اس کے دیگر کوائف لکھے تھے۔ پری اور پوسٹ آپریشن ٹریسٹ کارڈیکارڈ بھی تھا۔ ان ہیچرز کے مطابق ارم قریباً چار ماہ کی حاملہ تھی اور کئی ڈننامی اطالوی بوائے فرینڈز کے ساتھ کلینک میں آئی تھی۔

گلزاری نے واقعی کا ذکر کر دیا تھا۔ یہ حقیقت یہی دو بھاری تھی جس کا ذکر یونیورسٹی کے ریکارڈز میں بھی تھا لیکن وہاں چھائی اور گائیڈ لائن وغیرہ کی بات کی تھی۔

ہادی نے ایک گہری سانس لی۔ ہیچر پر ایک علامت نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا۔ "او کے سزارم جلال! اتم صاحب کتاب کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

.....

ارم کو دل کی مراد مل گئی تھی۔ ایک طرح سے اس نے جناب کو شکست فاش دی تھی لیکن ابھی وہ سمجھتی تھی کہ فتح مکمل نہیں۔ فتح مکمل تو تب ہوگی جب جلال اسے اپنی زندگی سے بھی نکال دیتا۔ اسے طلاق دے دیتا۔ لگتا تھا کہ وہ الگ ہو چکا ہے۔ شاید وہی عورت کی ملکیت والا جذبہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنے دائرہ اختیار اور حق استعمال میں رکھنا کئی عورتوں کا حرم بنالیا تھا۔

غیر موجودہ صورت حال بھی کچھ ایسی ہی نہیں تھی۔ ارم جانتی تھی کہ جناب کی زندگی پھولوں کا نہیں، کانٹوں کا ہے۔ کپڑوں کو آگ لگانے والے تازہ واقعے کے بعد تو جناب کی زندگی مزید مشکل ہونے والی تھی۔ وہ جلال کی محنت کی ٹوک پر آ چکی تھی اور اب اس سے باقی لونی والا سلوک متوقع تھا۔ کپڑوں کو آگ لگانے والی خبر ملا زمین سکھڑیے ہی ایک آؤٹ ہوئی تھی۔

فون پر پتے تھے۔ جلال کے آنے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی۔ وہ نہادھو کر کپڑے بدل چکی تھی۔ سرخ بتاری

لی آتش سیال گھاس میں اٹھایا لیکن چٹانیں کیوں اسے ہونٹوں تک نہیں لے جا پایا۔ اسے یہ سب کچھ کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا اور اب تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں وہ رو کر جناب کا چہرہ آ رہا تھا۔ جب وہ دینی کن کے پاس پارک میں اسے اپنی دوست بینش کی غم انگیز کہانی سنا رہی تھی اس نے شراب کا ذکر بڑے نفرت انگیز انداز میں کیا تھا۔ فیروز کی شراب نوشی کا تہمت ہوئے اس کی پیاری سی ناک پر کراہت کی بہت سی سلوٹس ابھرتی تھیں۔

ہادی کچھ دیر سوچتے ہوئے بعد بستر سے اٹھا اور واش روم میں جا کر یوحنا واش بیسن میں آلت دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بے دم سا بھر بستر پر لیٹا تھا۔ بات صرف انکھل کی ہی نہیں تھی پچھلے ایک دو ماہ میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں اس میں۔ ہر وہ چیز جو جناب کو بُری لگتی تھی اسے بُری لگنے لگی تھی۔ کسی وقت تو ایتس ہوں لگتا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں مثلاً بولنے، مسکرائے، ہنسنے، کھانے پینے میں بھی جناب کی پسند نا پسند کا خیال رکھنے کا ہے۔ اس کا وجود ویسے غیر محسوس طور پر اس کے وجود میں گم ہو رہا تھا۔ یہ عشق کی چٹانیں کون سی پرست تھیں؟

میں..... نہیں نہیں رہتا تو جتنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ وہی بے مثال، روشن پیشانی، مسکراہٹ جو اسے ہر طرف سے گھیر لیتی تھی۔ اور وہ ہزار سال سے اس مسکراہٹ کو جانتا تھا۔ یہ کتنا اچھا جذبہ یہ کتنا بڑا کتنا طاقتور تھا۔ پوری کائنات کو اپنے مدار پر حرکت دے سکتا تھا۔ دیکھا جاتا تھا ہادی کو کیا حاصل نہیں تھا۔ وہ انجیوں منٹ کے اندر دنیا کی بہترین آسائشیں اور دھنیاں اس کمرے میں موجود کر سکتا تھا لیکن وہ ان کی جو اس کی نمی لگی نہیں۔ جو چٹانیں کہاں بھی تھیں، اس کی تمام ڈوریوں اپنے ہاتھوں میں لے چکی تھی۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کچھ دھاکے سے بھی کبھی یہ ڈوریاں، دنیا کے مضبوط ترین بندھن کا روپ دھار چکی تھیں۔ یہ وہ انکھل ہی نہیں تھا جو لہا ہور سے چل کر یہاں آیا تھا۔

ہادی کے ذہن میں جب جب جناب کی بے بسی کا خیال آتا تھا، تب تب ارم کی کامرانیوں کا خیال بھی آتا تھا۔ جناب کی محبت کے ساتھ ارم سے نفرت بھی اتنی ہی شدت سے ابھرتی تھی۔ اس کی عیار چمکیلی آنکھیں، ہادی کے بچے میں شیطے سے بھڑکا دیتی تھیں۔

اس وقت اس کی سوچ کا دھارا ارم کی طرف تھا جناب فون کی بیل ہوئی۔ یہ اس کا نیا نمبر تھا جو صرف شیخو صاحب اور اس کے گھر والوں کو معلوم تھا یا پھر اٹلی میں گلزاری کو معلوم تھا۔ یہ گلزاری کی کال تھی۔ اس کی آواز جوش سے لہر رہی تھی۔ "ہادی صاحب! بڑی کڑا کے دار اطلاع ہے۔ ارم کے سلسلے میں مکمل بریکنگ نیوز مل گئی ہے۔"

"زبردست..... کیا معلوم ہوا؟"

"اے بیس نہیں سر! ملاقات کا شرف بخشے۔ کہاں نمبر ہے جیس آپ؟"

گلزاری کے منہ سے جیسے رال پک رہی تھی۔ ظاہر ہے بگڑی خبر کے بدلے وہ بگڑے انعام کی توقع کر رہا تھا۔ انعام فون پر تو نہیں مل سکتا تھا۔

ہادی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے گلزاری۔ تم روم میں برائٹ اسکوائر پر پہنچ جاؤ۔ جانتے ہو؟"
گلزاری نے اثبات میں جواب دیا۔

ہوتا ہو تو کوئی غلطی بھی کر سکتا ہے۔"

"کیا خود پر تیل چھڑک لے گی وہ؟" جلال نے بھیجھا کر کہا۔

"نہیں جلال! میں اور بات کر رہی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ..." وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔

جلال نے پلٹ کر ذرا غصے سے دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ "تمہیں پتا ہے مجھے احموری بات پتہ نہیں۔"

وہ اس کے سینے کے بالوں پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے گیا نہیں ہے۔ یہیں کہیں منڈلا رہا ہوگا۔ وہ کہیں باجی سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم اس کی دوبارہ دیکھ ہی چکے ہیں۔ یہاں ہمارے گھر تک پہنچ گیا اور مہمان بن کر خدمتیں کراتا رہا۔ پھر باجی کے ماں باپ کے گھر پہنچ گیا۔ مجھے نہیں لگتا وہ اتنی آسانی سے چھپا چھوڑے گا۔ ایسے بندے اچھی بھلی عورت کی مت مار دیتے ہیں۔ مجھے پتا ہے پہلے بھی باجی کا اتنا قصور نہیں ہوگا۔ اسی نے انہیں ورغلا یا اور اتنی بڑی معیبت میں ڈالا ہم سب کو۔"

جلال بے چین سا اٹھ کھڑا ہوا۔ ارم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ظہیر کہہ رہا تھا وہ چکا ہے یہاں سے۔ شاید یہاں سے گیا تھا۔ اب تو اٹلی سے بھی دفع ہو چکا ہوگا۔"

"جانتی ہیں جلال! مجھے ایسا نہیں لگتا۔ اور میں آپ کو ایک دوسری بات بھی بتا دوں جو شریقاں بے نایہ بھی لکھ نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ یہ جانتی ہے سب کچھ۔ باجی کی رازدار کی طرح ہے۔ ذرا نیور عثمان کل بتا رہا تھا کہ شریقاں کا فون آج کل اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ اس نے باجی کو دیا ہوا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"وہ فون باجی نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ جانتی ہیں کیوں؟ اس کے ساتھ ہی ارم نے دراز میں سے ایک پرانا فون نکالا۔ اس میں ایک پرانی سم سم تھی۔ اس نے جلال کے سینے کے سینے ہی شریقاں کا نمبر پرپرس کیا۔ نکل جاتی رہی۔ مگر اس نے اٹھا لیا۔ تیسری چٹھی کوشش پر دوسری طرف سے بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟" یہ حجاب کی آواز تھی۔ اب بیکر چونکہ آن تھا اس لیے یہ آواز جلال نے بھی سنی۔ ارم نے فون بند کر دیا۔ جلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اس نے ارم سے فون سے کہہ دوبارہ نمبر پرپرس کیا۔ مگر اب فون بند ہو چکا تھا۔

ارم نے کہا۔ "میں آپ کو یقین سے کہتی ہوں جلال! یہ شریقاں ٹھیک نہیں ہے۔ باجی حجاب نے تو اسے بعد میں علی والی کو بھی بلایا ہے یہ پہلے ہی وہاں جانے کے لیے پھر پھر آ رہی تھی بڑا دل لگتا ہے اس کا باجی کے آس پاس۔"

جلال کا سوز گری طرح غارت ہو چکا تھا۔ جانے کی کردہ اسٹڈی میں چلا گیا۔ وہاں سے پندرہ بیس منٹ بعد ٹھاکر تو کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ "ہائے اللہ! ابھی تو آئے ہیں اب کہاں جائیں گے۔" ارم سینے پر بتاری پلو دھست کر کے ادا سے بولی۔

"ذرا کام ہے۔" جلال نے مختصر جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"دیکھیں میری بات سنیں۔ باجی سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کیجیے گا۔"

سازھی، طلائی بند ہے، ڈائننگ کا دزنی ہار اور کلائیوں میں پھولوں کے گجرے، میز چایاں چمٹے ہوئے اس کی نظر سبک سرس کے بڑے گھداں پر پڑی۔ چند ماہ پہلے حجاب یہ وغیرہ سے لائی تھی اور بڑے اہتمام سے یہاں میز چایوں کے پاس سجایا تھا۔ اب ارم اسے یہاں سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے گھر میں سے ایسی بہت سی اشیاء انفرادی تھیں جو خاص حجاب نے رکھی تھیں۔ ایک خم دار صوفہ، کاسن روم کا سنہری فون سیٹ اور دلہہ خاتمان کے کسی استاد کا رنگیری بنائی ہوئی نقش تپائی جوئی وی لاؤج میں بڑی شان سے رکھی گئی تھی۔ یہ گھداں بھی ارم کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ یہ جلال کو بھی اچھا لگتا ہے اور اگر اس نے بنانا چاہا تو شاید جلال رو کے گا۔

میز چایاں چمٹے چمٹے جیسے نظر کی ایک بلند لہر ارم کے سینے سے اٹھی۔ شاید وہ اپنے آپ کو روک لچ کر کچھ غلطی بے چارے گھداں سے بھی ہوئی تھی۔ ارم کی سازھی کا پلو گھداں میں رکھے آئی فیشن پلانٹ سے الگ کیا۔ ارم کو تو جیسے بہانہ درکار تھا۔ اس نے پلو کو اتنی جھجھلاہٹ سے چھڑایا کہ گھداں کا گرنا لازم ٹھہرا۔ دو چھ سات گھنٹے لڑھکا اور پھر کڑے کڑے ہو گیا۔

ملازمہ کلثوم اور آپا خاتم تیزی سے اندر آئیں۔ اس وقت ارم غلطی گھداں کے کڑے اکٹھے کر رہی تھی۔ "اے اللہ چوٹ تو نہیں لگی میری بچی کو۔" آپا خاتم نے دلار سے کہا۔

ارم نے نفی میں سر ہلایا۔ یہی وقت تھا جب جلال بھی آ گیا۔ چند لمحوں میز چایوں کے پچھلے سوے پر ساکت کھڑا رہا پھر چڑھ کر اوپر آ گیا۔ "اچھا چھوڑو ارم! انونے والی چیز تھی نوٹ گئی۔ اب ہاتھ دھو نہ کر لیتا۔" وہ بولا۔

ملازمہ بھی نوکری لے کر آ گئی تھی۔ وہ کڑے سینے لگی۔ ارم نے انفرادہ لہجے میں بتایا کہ کس طرح اس کا پلو گھداں اور گھداں گر گیا۔

جلال اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔ "تم نے نماز پڑھ لی؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں!" وہ سر پر پلو درست کر کے بولی۔ تب اس نے معنوی حیرت سے دوبار پر آ یوزاں کیلنڈر پر نظر ڈالا اور جلال کو دیکھ کر بولی۔ "آج تو آپ کو باجی حجاب کی طرف جانا تھا۔"

"نہیں..... ادھر ہی رہوں گا۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن کیوں جلال؟" وہ چیشانی پر سلونٹیں ڈالتے ہوئے بولی۔ (حالانکہ درس والی کوٹھی میں جو کچھ ہوا وہ سب اسے ذرا نیور عثمان کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔)

"بس کہہ دیا۔ نہیں جانا۔"

ارم نے شیر والی کے منہ کھولنے میں اس کی مدد کی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ عتب میں کھڑی ہو کر اس کے کندھے دبائے لگی۔ وہ اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اپنے جسم کا بیشتر بیجان خیز گداز جلال کے جسم میں نکل کر رہی تھی۔

"ایک بات کہوں، نہ اتنا مایہ کا۔" وہ بولی۔

"کہو۔"

"آپ باجی کو اس طرح تنہا نہ چھوڑیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی بیوی ہیں اور بندہ اندر سے

اپنا تک شریفاں گھبراہٹ ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ "وڈی باجی! بھائی جان آئے ہیں۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں اطلاع دی۔

حجاب کے ہاتھ پاؤں میں جھوٹیاں سی ریج گئیں۔ آج کل جلال کی آمد سے اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ یہاں بیوی کا محبت اور احترام کا رشتہ، خوف اور تذلیل کے رشتے میں بدل چکا تھا۔ حجاب نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ جلال کی ہرجب پورج میں کھڑی تھی۔ جلال اگلا دروازہ کھول رہا تھا۔ پچھلے دروازے سے بھی کئی ملازمہ کلشوم نکلی اور اب سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ یہ بتائیں کیوں آئی تھی جلال کے ساتھ؟

شریفاں نے یونہی وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگا رکھا تھا۔ حجاب نے کہا۔ "شریفاں! ٹی وی بند کرو اور دیکھو کہ کمرے میں کوئی غالتولانت آن نہ ہو۔"

"انش تو میں نے بند کر دی ہیں جی۔" شریفاں نے کہا۔

"ایک نظر کچن میں دیکھ لو۔ کوئی چولہا کھلا نہ ہو۔" حجاب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ جلال کو ایسی باتیں سننا پسند تھیں۔

شریفاں ٹی وی آف کر کے جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ دو تین منٹ بعد جلال آن وارد ہوا۔ اسے ایک فہر کیجہ۔ یہی حجاب سمجھ گئی کہ آج پھر موڈ اترے وہ بغیر کسی تہنید کے بولا۔ "شریفاں کہاں ہے؟"

"ہن میں ہے شاید۔" حجاب نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"شریفاں! ادھر جلال! جلال نے گرج کر آواز دی۔

دو دو سینڈ بعد ہانی کاہنی ہوئی مانتے تھی۔ بد قسمتی سے قریبی ہاتھ روم کی کوئی ٹوٹی کھلی تھی اور پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ جلال گرجا۔ "یہ پانی کیوں گر رہا ہے؟"

"میں بھول گئی تھی صیب جی!" شریفاں بھلا کر بولی اور پھر لپک کر ہاتھ روم کی ٹوٹی بند کر آئی۔ جلال اس طرح کا کھڑا تھا۔ "کہاں رہتا ہے تمہارا دامخ آج کل۔" وہ گرجا۔

"میں کچن میں تھی صیب جی!"

"کچن میں تھی یا پانی کی کھلی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی پر کوئی لپچر ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔"

"کیلی! کون کیلی جی؟"

"یہی جو تیرے سامنے کھڑی ہے تیری مہراں تیری لنگوٹن۔" جلال کا اشارہ حجاب کی طرف تھا۔

"جی....." وہ بھلا کر رہ گئی۔

وہ حجاب سے مخاطب ہوا۔ اس کا فون تم نے اپنے پاس رکھا ہے؟"

"فون.....؟ ہاں جی..... وہ میں نے....."

ابھی حجاب کی بات ادھوری تھی کہ وہ پھر شریفاں سے مخاطب ہو کر گرجا۔ "کیوں فون دے دیکھا ہے ٹوٹے اسے؟"

"میں نے تو نہیں دیتا جی! اصل وجہ..... اصل وجہ....."

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چند قدم پیچھے گئی۔ "کھانا تو کمرے میں کھائیں گے نا جلال۔"

"شاید" اس نے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہارنگل گیا۔ وہ بھنایا ہوا تھا۔

اس کے جانے کے بعد ارم نے ایک لمبی سانس لی اور لٹری صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر غمی خیز مسکراہٹ تھی۔

قریب ہی پلیٹ میں سیب اور سیاہ انگوڑ پڑے تھے اس نے انگوڑ کا ایک چھوٹا سا کچھا اٹھایا اور لینے لینے ہی انگوڑ کے دانے منہ میں کر گئے۔ وہ چار منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کے فون پر بیل ہوئی۔ نامعلوم نمبر تھا۔ ڈراما ڈراما کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ "ہلو کون؟" اس نے پوچھا۔

جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے حق میں بہت بھتر ہو گا کہ آپ فون بند نہ کریں اور نہ اپنے ارد گرد کسی کو اس بارے میں بتائیں۔"

"آپ..... ہیں کون؟" وہ ذرا غصے سے بولی۔ اسے آواز کچھ پیانی ہی لگ رہی تھی۔

"آپ کے آس پاس کوئی موجود تو نہیں۔"

"نہیں۔"

"میں محمد ہادی بول رہا ہوں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہاں آپ کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ کالی میریس مسئلہ۔"

ارم کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

○.....○

حجاب درس والے گھر میں تھی۔ وہ بس ایک دو کمروں تک ہی محدود رہتی تھی۔ اپنی سخت تذلیل کے بعد لوگوں کو چاکروں سے آنکھ ملانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ صرف ایک شریفاں تھی جو اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور اس کے درد کو محسوس بھی کرتی تھی۔ چند روز پہلے شریفاں کا موبائل فون حجاب نے اپنی تحویل میں لے کر بند کر دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ہادی اس نمبر پر رابطے کی کوشش نہ کرے۔ مگر اس سے شریفاں کے لیے بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ پاکستان سے اس کی کال آتی رہتی تھی۔ مہجرات میں اس کی بہن کے ہاں بچہ ہوا تھا اور بہن بیمار تھی۔ دو گاے گاے شریفاں سے رابطہ کرتی رہتی تھی۔ شریفاں کی درخواست پر حجاب شام کے وقت ایک دو گھنٹے کے لیے اس کا فون کھلی دیتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی فون کھلا ہوا تھا جب اس پر کسی نامعلوم نمبر سے کال آئی تھی۔ شریفاں نہانے کے لیے ہاتھ روم میں گھسی ہوئی تھی۔ تیسری چوٹی کال پر حجاب نے فون اٹھایا اور ایک دو بار بیلو کیا۔ مگر دوسری طرف سے کھلی بات کے بغیر فون بند کر دیا گیا۔

کہیں یہ ہادی تو نہیں تھا؟ یہ سوچ کر حجاب کا دل دھل گیا۔ نفرت آمیز طیش کی ایک لہر اس کے سینے میں اٹھ رہی تھی۔ اس نے تہنید کیا کہ اب وہ کبھی کوئی کال ریسیو ہی نہیں کرے گی۔

نکالت نہیں ہے۔ فون پر اپنی بات چیت وہ ختم کر چکا تھا اور اب غصے میں بھرا کاسن روم کے صوفے پر بیٹھا تھا۔
جواب اسے بتانا چاہتی تھی کہ شریفان کا فون اس نے کیوں اپنے پاس رکھا تھا۔ لیکن بہت سی دیگر باتوں کی طرح یہ
بات بھی اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ اس کیفیت کی وجہ یقیناً جلال کا غیض و غضب ہی ہوا کرتا تھا۔ جونہی
شریفان اور ذرا نیور عثمان رخصت ہو گئے۔ جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ حکمے انداز میں جواب سے بولا۔
"چلو نیچے آؤ۔" اس کے ساتھ ہی وہ میزہیاں اترنے لگا۔

جواب کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی۔ پھر بھی جلال کے پیچھے جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہی
میڑھیاں اترنے لگی۔ پتا نہیں، وہ اسے کہاں لے جا رہا تھا۔ میڑھیاں اتر کر وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔ یہاں سے ایک
کوریدور نکلتا تھا۔ وہ چند قدم کوریڈور میں گئے۔ پھر حجاب کی رگوں میں خون جم سا گیا۔ وہ اسے ٹیمپٹ میں لے جا
رہا تھا۔ پر کیوں؟

"چلو۔۔۔۔۔" اس نے کہا اور نیچے جاتی میڑھیوں کا دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے جلال۔۔۔۔۔" وہ روٹھ کر پوچھی۔

"بتانا ہوں۔۔۔۔۔ نیچے چلو۔" وہ پھنکارا۔

وہ رز کر رہ گئی۔ مگر قدم آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ اسے میڑھیاں اُتار کر ٹیمپٹ میں لے آیا۔
یہاں! ٹیلیوں کا فرش تھا۔ درمیانے درجے کی آرائش بھی کی گئی تھی۔ فرنیچر، پردے، اسے سی وغیرہ سب کچھ میٹھا تھا ہوا
کی آمورفت کا بڑا بھلا انتظام بھی موجود تھا۔

"اب تم یہاں رہو گی۔" لڑو ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

وہ پوری جان سے لرز گئی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جلال؟"

"تم ایک بے اعتباری عورت ہو۔ میں تمہیں آؤ اڈا گھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا بہت بے عزتی سہہ چکا ہوں
اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوگا۔" وہ واپس جانے شکے لیے مڑا۔

جواب خوب کمر بولی۔ "لیکن اب نیا کیا ہو گیا ہے جلال! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ۔۔۔۔۔؟"
وہ جاتے جاتے ٹوک گیا۔ گھوم کر کہنے لگا۔ "کتنی کایا ایک دندانہ نوٹنے تو باقی دندانہ نوٹنے زیادہ دیر نہیں لگتی۔
تم اب بے حیائی کی ہر حد تک چا سکتی ہو۔"

وہ سسک پڑی۔ "جلال! ایسے الزام نہ لگاؤ مجھ پر۔ مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے پر ایسی سزا تو نہ دیں۔ اس
سے تو بہتر ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مجھے مار دیں۔ میری جان لے لیں۔"

"چپ رہو۔" وہ اتنے زور سے دھڑا کر کہ جس سے گئی کو یو ایس لرز گئیں۔ "پھر وہی بات۔۔۔۔۔ میں الزام لگا رہا
ہوں تم پر۔ بہتان باندھ رہا ہوں تیری نیک سیرتی پر۔ بے جا بے تحاشی۔" وہ شیر کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔

ایک بار پھر وہی کچھ ہوا جو چند دن پہلے اوپر کمرے میں ہوا تھا۔ اس پر پھپھڑوں اور ٹھوکروں کی بارش ہو گئی۔
"جلال۔۔۔۔۔" وہ خوف اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں چلائی۔

"اصل وجہ تو شیطان کی بچی ہے۔ حرازدی ہے تو۔ پوری حرازدی ہے۔" جلال گر جا۔
شریفان سر تا پا لرز رہی تھی۔ مگر کالی اس سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے کی طرح زرد
رہا۔ اس نے ہمت کر کے جلال کی طرف دیکھا۔ "صیب جی! میں بے قصور ہوں۔ آپ ماہ بیک گالی تو نہ دیں۔"
"بولتی ہے۔ آگے سے بولتی ہے۔ ہنسل۔ کتنے کی بچی۔" جلال اس کی طرف بڑھا اور مارنے کے لیے ہاتھ
اٹھایا۔ مگر پھر رُک گیا۔ اس نے دائیں طرف جا کر ایک دروازہ کھولا اور دھاڑتے ہوئے ذرا نیور عثمان کو آواز دی۔
"عثمان۔۔۔۔۔ عثمان۔۔۔۔۔"

چند سیکنڈ بعد عثمان ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ جلال نے شریفان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ
واپس جاری ہے نئے گھر۔ ابھی جاری ہے۔ اس کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔ جلدی کرو۔"
ذرا نیور عثمان نے ادب سے اثبات میں سر ہلایا اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں شریفان کا سامان
رکھا تھا۔ شریفان سر جھکائے کھڑی تھی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ سارا جسم لرز رہا تھا۔
کچھ کہتا جا لیکن پھر شاید سمجھ گئی کہ بولنے کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

اس دوران میں حسب معمول جلال کے سیل فون پر کوئی کال آگئی۔ وہ کال ریسیو کرنا اور برہم لہجے میں
کاروباری باتیں کرتا ہوا نیروس کی طرف چلا گیا۔ حجاب پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ اسی کی جھنکی جس، نئے حادثہ کی آہ
کی خبر دے رہی تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ ابھی کچھ دیر پہلے شریفان کے نمبر پر جو کال آئی تھی، وہ سارا اسی کا
شاخسانہ ہے۔

صرف دس منٹ بعد شریفان سر جھکائے دس والے گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں
تھیں۔

حجاب جانتی تھی کہ شریفان کے بغیر اس گھر میں اس کا دم گھٹ جائے گا مگر وہ اسے روک نہیں سکتی تھی۔ اس کے
لیے حکم جاری ہو چکا تھا اور اس حکم کو بدل نہیں جاسکتا تھا۔

"رُب راکھا جاتی!" حجاب کے پاس سے گزرتے ہوئے شریفان نے ہولے سے کہا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے
اسے دیکھا اور پھر مردہ قدموں سے میڑھیاں اتر گئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے شریفان، جلال کے پتھر کی زد میں آنے والی تھی۔ بلکہ یہ ایک پتھر نہ ہوتا۔ یقیناً اس پر پتھروں
اور ٹھوکروں کی بارش ہو جاتی۔ مگر عین وقت پر جلال نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ پاکستان نہیں
ہے۔ یہاں ملازم کو مارنا بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔ مار کھانے کے بعد شریفان پولیس کو کال کر دیتی تو جلال کو لینے کے
دینے پڑ جاتے۔ وہ اپنی ملازمہ کو تو نہیں مار سکتا تھا لیکن اپنی بیوی کو مارنے میں اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔
وہ اسے بے دریغ پیت لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے میں ہے۔ کہیں اس کی شکایت نہیں کرے گی۔
ازدواجی رشتے کے ساتھ ساتھ حاشی پھندے میں بھی پھنسی ہوئی تھی۔

اور تھوڑی دیر بعد یہ بات ثابت بھی ہو گئی کہ حجاب کو مارنے اور اس کی تذلیل کرنے میں جلال کے سامنے کوئی

روپائے گی۔" بند کمروں سے اسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اپنے گرد بستر کی چادر درست کی اور لڑکھاتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا اور فریادی لہجے میں پکاری۔

"دروازہ کھول دیں جلال! دروازہ کھول دیں۔"

وہ پکارتی رہی اور دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ حرکت کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کی سانس واقعی ڈکنے لگی۔ وہ کھڑکی کی طرف لپکی لیکن کھڑکی نام کی کوئی چیز یہاں نہیں تھی۔ وہ پھر دروازے کی طرف آئی۔ جلال اور کلثوم کو پکارنے لگی مگر یہ سب بے سود رہا۔ وہ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھ گئی۔ وقفے وقفے سے آواز دیتی رہی، دروازہ بجاتی رہی۔ اس کی آواز بیٹھتی تھی۔ پھر وہ بے دم سی ہو کر وہیں پھولدار ٹائیلوں کے فرش پر لیٹ گئی۔ دروازے کے قریب لیٹنا اسے نسبتاً بہتر تھا۔ شاید دروازے کی درزوں میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ وہ کس دلدل میں پھنسی جا رہی تھی۔ ایک جھوٹی سی جسارت کی اتنی بڑی سزا.....؟

○.....○.....○

بادی شانزہ کے علاقے میں ایک گناہم کہنے میں بیٹھا تھا۔ وہ ارم کا انتظار کر رہا تھا اور اسے یقین تھا، وہ ضرور آئے گی۔ ٹیلیفون پر ہونے والی گفتگو کے آخر میں اس نے ارم کو ایک ایسا اشارہ دیا تھا جس نے اس کی سٹی گم کر دی تھی۔ وہ یہ بامی بھرتے پر مجبور ہو گئی تھی کہ کل دو پہر اس سے اس کہنے میں ملے گی۔

بادی نے ایک بار پھر درشت واپس پر نگاہ دوڑائی۔ 12 بجے کا وقت تھا اب 12 بج کر 20 منٹ ہو چکے تھے۔ بادی ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار تھا۔ اس کی درخواست پر ڈپٹی انسپکٹر باشم نے اپنے ایک ماتحت تھامس کو بھی اس کہنے میں بھیج دیا تھا۔ وہ سادہ لباس پہن بادی سے تیسری چوتھی میز پر موجود تھا اور چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ وقت گزری کے لیے بادی نے شیخو صاحب کو ٹوک لیا۔ انہوں نے مخصوص پنجابی لہجے میں اوپر تلے دو اچھی بھجیں دیں۔ پہلی یہ کہ انالین سفارت خانے کی طرف سے بادی کو ایمر جنسی سٹل مل گیا تھا۔ دوسری اہم خبر یہ تھی کہ بادی کے کانوں کے نئے لالچ ہونے والے اہم نے سٹل کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ شیخو صاحب بہت خوش تھے اور مسلسل خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

قریباً ساڑھے بارہ بجے تھے جب ارم تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک نیلے رنگ کا اسکارف اوڑھ رکھا تھا۔ جس میں بے بس چہرے کی کھینچا نظر آتی تھی۔ ایک شال نے اس کے بالائی جسم اور لباس کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پاؤں میں جو گر شوز تھے۔ ہال میں نگاہ دوڑانے کے بعد وہ سیدھی اس گوشے میں پہنچ گئی جہاں بادی موجود تھا۔

دونوں میں رسی کلمات کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ اپنے سامنے بیٹھ گئے۔ آج پہلی بار بادی کو ارم کی آنکھوں کی چمک مانند نظر آئی۔ رنگ بھی کچھ پیکا سا تھا۔ یہ آواز دیکھ کر اسے راحت محسوس ہوئی۔

"کیا پیس کی؟" بادی نے پوچھا۔

"بادی صاحب! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" وہ کھڑے لہجے میں بولی۔

اس کے چلانے نے جلال کو مزید بڑھکا دیا۔ اس نے حجاب کو اس کے بالوں سے پکڑا اور تھما کر دیوار پر دھسے مارا۔ وہ غم جان ہو کر بستر پر گر گئی۔ وہ دھاڑا "ٹو ان آسانکوں، ان نمنٹوں کے قابل ہی نہیں ہے۔ بد قسمت ہے ڈو اور وہ بھی بد بخت ہیں جنہوں نے تجھے جتا ہے۔" شیخ ذات کے ہو۔ شیخ خون ہے تم لوگوں کا۔ جکی پینے اور گھاس کا پانی والوں کی اولاد میں سے ہو۔ میں جانتا ہوں تیرے بڑوں کو اور اب تجھے بھی اچھی طرح جان گیا ہوں۔ تجھے آرام کی گمرانی ہو رہی ہے۔ پیسے کی ریل چلنے نے تیرے پنڈے کو گرم کیا ہوا ہے۔ اس لیے عاشق ڈھونڈ رہی ہے۔ تیری طرح سیدھا کر دوں گا تجھے۔ تیری طرح۔" وہ پھنکارا۔

اس نے کمرے میں رکھا ہوا فریج کھولا۔ اس میں کھانے پینے کی کئی اشیاء رکھی تھیں۔ جو ہر ہنر و نس، اسٹیکس وغیرہ۔ اس نے یہ چیزیں نکال نکال کر فرش پر پھینچ دیں۔ پکار کر دیں۔ پھر وہ پھرا ہوا ٹیلیفون شیٹ کی طرف گیا۔ اس کو نیچے شیخ کر توڑ دیا۔ اس نے ساری درازیں کھولی کراٹ پٹ کر دیں۔ غالباً دیکھ رہا تھا کہ کوئی تو باہل کھڑا ہو جائے۔ موجود نہ ہو۔ جب وہ حجاب کی طرف آیا۔ اس پر چڑھ دوڑا۔ اس کے جیبی کپڑے پھاڑ دیئے۔ ایک ایک تار کھینچا۔ جدا کر دیا۔ وہ عریاں ہو گئی اور رونے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ اس نے اس کے گلے سے ہار اور کانوں سے بندے لگی کھینچ کر پھینک دیئے اور اس کے عریاں جسم پر تھوک کر باہر نکل گیا۔ زمین و آسمان حجاب کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ جیسے زہر ناک ہواؤں میں معلق تھی۔ جلال کا لعاب دہن اس کے کندھے پر گر رہا تھا اور اب رہنے لگا ہوا پینے کی طرف آ رہا تھا۔ اسے لگا یہ رقتیں۔ لیس دار مادہ، ایک تیزاب ہے جو اس کو جھلساتا چلا جا رہا ہے۔ اس نے عریاں چھپانے کے لیے بستر کی چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔

چار پانچ منٹ بعد وہ پھر دندا تا ہوا تسمت میں داخل ہوا۔ اس نے کسی ملازمہ کا بوسیدہ جوڑا حجاب سے مارا اور پھنکارا۔ "ٹو اس کے قابل ہے۔ بلکہ شاید اس کے قابل بھی نہیں ہے۔ اب تو وہی پینے کی جو میں پیتا ہوں اور وہی کھائے گی جو میں کھاؤں گا۔ میں تیرے پنڈے کی گرمی کم کر دوں گا۔ بالکل ٹھنڈی ٹھنڈا اور نرم ہو جائے گی۔ کان میں ڈالنے کے قابل۔"

وہ غیض و غضب میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد حجاب نے باہر سے دروازہ پلٹ ہونے کی آواز سنی۔ اسے یوں لگا جیسے سینے میں اس کی سانس پھنس گئی ہے۔ وہ جلال کو پکارنا چاہتی تھی مگر پکار بھی نہ سکی۔ اسی طرح بیٹھ شیٹ میں لپٹی کروٹ لیے پڑی رہی۔ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر انگارے سے ایک رہے تھے۔ یہ ان طمانچوں کے انگارے تھے جو جلال نے اس پر برسائے تھے۔ عریاں جسم پر انگاروں کی جھلن کم نہیں ہوئی۔ مگر تیزاب کی جھلن تو بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور حجاب کے کوئل بدن پر تیزاب بھی لعاب دہن کی صورت میں سرک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد حجاب نے محسوس کیا کہ تسمت کے دروازے سے باہر جلال کسی سے باتوں میں مصروف ہے۔ غالباً ملازمہ کلثوم ہی تھی۔ وہ درشت لہجے میں اسے حجاب کے متعلق کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر آجنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہدایات بہت سخت ہیں۔

تو کیا وہ اسے یہاں بند کر کے چلا جائے گا۔ دو تین دن کے لیے یا چار پانچ دن کے لیے؟ "اودہ خدا یا اودہ کیسے

ہے۔ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ تم سب کچھ جانتی ہو اور میں بھی۔ اب میرے اور تمہارے درمیان ایک پیار شدہ وجود میں آتا ہے۔ تمہیں وہ کچھ کرنا پڑے گا جو میں کہوں گا۔“

وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ”میں اس کے لیے زیادہ دور تک نہیں جا سکتی مسٹر ہادی! اگر مجھے دیکھ لیں تو وہ ذرا سنبھل کر بولی۔“

اس نے دلیری سے بات کی تھی مگر اس کی آواز کا کھوکھلا پن ہادی کو صاف محسوس ہوا۔ وہ اتنی بڑی بازی نہیں کھیل سکتی تھی جس کی پہلی چال میں ہی اسے جلال الدین کو کھونا پڑتا۔

ہادی سگریٹ سلگا کر زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ”میں تمہیں دیکھ لیں تو وہ ذرا سنبھل کر بولی۔“

اس محبت سے پیدا ہونے والی غیر معمولی توانائی نے ارم چودھری جیسی خزانہ لڑکی کو دو چار منٹ میں ہی مسرور کر دیا۔ بالآخر وہ مری مری آواز میں بولی۔ ”دیکھو ہادی صاحب! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا کوئی بدخواہ نہ ہوگا۔“

جانتی ہوں۔ آپ مجھ سے کیا چاہ رہے ہیں؟“

وہ بات کاٹنے والے انداز میں کہنے لگی۔ ”میں ہمارا کسی تناؤ کا شکار ہونا نہیں چاہتی۔ نہ ہی بار بار آپ سے رابطہ کر سکتی ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔ مجھے ایک ہی بات یاد دہانی اور..... اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ان بچہ زخمیوں کو بھلا دینا کبھی میرے لیے بھروسہ نہیں کریں گے۔“

”کوئی ضمانت نہیں۔“ ہادی نے بے چلک لہجے میں کہا۔ ”اگر کوئی ضمانت ہے تو وہ میں خود ہوں۔ تمہیں میری زبان پر یقین کرنا پڑے گا۔ ہاں! میں بتا رہی ہوں کہ اس یقین کی وجہ سے تم کبھی بچھڑاؤ گی نہیں۔ اور ایک دوسری بات کوئی شرط میرے سامنے نہ رکھو۔ تم بشرطہ بات کوئی ہو تو میرا میسر ہوئے گا۔ یہ سب کچھ اسی طریقے سے ہوگا جس طریقے سے میں چاہوں گا۔ میری سب سے پہلی اور اہم ترین ذمہ داری یہ ہے جو میں نے ابھی تمہیں بتائی ہے۔“

قالب کے خلاف اب کوئی اور کیسنگ نہ دکھاتا۔ ہادی نے آخری الفاظ ہوا کیے تو اس کی انگلی ارم کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ بے ساختہ کھپکھپائے لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ مگر اسے یہ یقین تھا کہ ہادی نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی کھپکھپاہٹ کو کنٹرول کرتے ہوئے چسکیاں لینے لگی۔ کہنے کے دروازے پر ایک شخص سڑکیوں پر بیٹھا گنڈا بجا رہا تھا۔ اس کی خوبصورت صحن سے متاثر ہو کر ایک لڑکی لورڈز کے رقص شروع کر دیا۔

”ہاں..... مجھے بھی لگتا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔“

آپ ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گی۔“ ہادی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

ہادی نے اطمینان سے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ ارم کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں ان تین عید پرنس آؤٹ کی کاپیاں تھیں جو گزشتہ روز نے پرائیویٹ کلینک و کنوریہ فورٹ سے حاصل کیے تھے۔

پرنس آؤٹ دیکھنے کے بعد ارم کی حالت تپتی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر کھپکھپاہٹ دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ..... سب کیا ہے؟“ وہ ہکھلائی۔

”دیکھیں مسز ارم! آپ نے خود کہا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ پھر اسے فضول باتوں میں نہ لگائیں۔“

میرے پاس محسوس ثبوت موجود ہیں۔ آپ کی وہ انڈیا کی زندگی چند روز میں ختم ہو سکتی ہے جو آپ بڑی چالاکی سے چھپائی ہے۔“

”تو تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟“ وہ آپ سے تم پر اترا آئی۔

”میں بلیک میل کرنا چاہتا نہیں ہوں۔ کر رہا ہوں اور یہ اوجھے جھکنڈے تم نے خود شروع کیے ہیں ارم چودھری! اس لڑائی میں تمہیں ہراٹھ کا جواب پھر سے ملے گا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ لڑنے کا خیال واپس لے لیں۔“

وہ ایک تک ہادی کی طرف دیکھتی رہی پھر شاید سمجھ گئی کہ ہادی زرا شاعری نہیں۔ ان لوگوں میں سے بات کرتے ہیں تو اسے عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”تو تم.....“

سب حجاب کے لیے کر رہے ہو۔ اس کے کہنے پر..... اس کی خواہش کے مطابق۔“

”اس بے چاری کو ان باتوں کا پتا بھی نہیں۔ وہ ایسی ہوشیار چالاک ہوتی تو تمہارے پسندوں میں پھنسی ہی نہیں۔ جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا ہے، کسی اور کے ساتھ کیا ہوتا تو وہ تمہاری جان لے لیتا۔“ ہادی کے لہجے میں آگ تھی اور چشم پورے جسم میں پھیلنے محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے لب و لہجے نے ارم کو ہلا دیا۔ اس نے اس کا رخ درست کرتے ہوئے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ چہرہ سیکنڈ تک الفاظ منتخب کرنے کے بعد بولی۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

ہادی نے اس کے ہاتھ سے کاغذات واپس لیتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حجاب کے خلاف ہر طرح کی سازشیں بالکل بند کر دو۔ ایک دم فل سٹاپ ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“

”میں نے کوئی سازش نہیں کی۔“

”میرے کمرے سے حجاب کی تصویر نکال کر پورے خاندان میں پھیلاؤ، تمہاری سازش نہیں محبت تھی۔“

اس طرح کی کبتیں تم نے بہت کی ہیں حجاب سے۔ اب ان کا بدلہ چکانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں پھر کہوں گا تم

ہمارا جو بالکل محفوظ ہوتا رہا ہے۔“



تاج کا اندام حال تھا۔ چھپتے چھپتے گھنٹوں سے اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ رورو کر اور پکار پکار کر اس کی آواز پہنچتی تھی۔ اس نے کسی لو کرانی کا وہی بوسیدہ لباس پہن رکھا تھا جو جلال نے اسے مہیا کیا تھا۔ آج صبح اسے ناشتہ دیا گیا تھا۔ یہ ناشتہ لانے والی بیٹی کئی کلوٹوم ہی تھی۔ تاہم اس نے سیسٹ کا دروازہ پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ دروازے میں اندر کی طرح باہر کی طرف بھی دروازے سے جھانکنے والی زنجیر لگی ہوئی تھی اس زنجیر کی وجہ سے دروازہ بمشکل چھ سات انچ تک ہی کھل سکا تھا۔ اس خلا میں سے کلوٹوم نے سوکھی روٹی، انڈے کا آلیٹ اور چائے کا کپ اندر کھسکا دیا تھا۔ اور حجاب کی منت سماجت کی پروا کیے بغیر دروازہ فوراً بند کر دیا تھا۔ یہ ناشتہ بارہ گھنٹے بعد بھی جوں کا توں پڑا تھا۔

”میں کیا کروں میرے اللہ! یہ مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے معاف کر دے میرے مالک! مجھ پر رحم فرما۔ میرے ماں باپ پر رحم فرما۔“ وہ تنکے میں سر دے کر گڑ گڑائی۔

اسی دوران میں دروازے پر پھر آہٹیں سنائی دیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کی طرف گئی۔ اس بار بھی ہوازدہ پورا نہیں کھلا تھا۔ دوسری طرف کلوٹم کا کرخت چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے ٹیکھیں میں لپٹی ہوئی روٹی، پانی کی بوتل اور سامن کی پائینے اندر کھسکا دی۔ اس میں آلو گوہ بھی کا سامن تھا۔ حجاب، کلوٹم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بگی۔ ”خدا کے لیے کلوٹم! مجھے یہاں سے نکال لو۔ میری سانس بند ہو جائے گی۔ مجھ پر رحم کرو کلوٹم۔“

”اور وہ کچے پن سے بولی۔“ ”نمبر سے سامنے ہاتھ جوڑ کر مجھے گناہگار کیوں کرتی ہیں باجی! ہاتھ جوڑنے میں توان کے سامنے جوڑ و جن کی عزت غراؤں کی ہے آپ کی وجہ سے۔ جو لوگوں کے طعنے سن رہے ہیں۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا فلوٹم! میں یہ نہ گناہ ہوں۔ مجھ پر بہتان باندھے جا رہے ہیں۔ تم تو ایک عورت ہو۔ عورت و بیچاقتی ہو۔ کیا جہیں لگتا ہے میں کچھ ایسا کر سکتی ہوں؟“

”کئی دن کے ماتھے پر کچھ نہیں لکھا ہوتا باجی! آپ اس بندے سے ہونٹوں میں ملتی رہی ہیں۔ اس کے کمرے میں سے آپ کی فلفل تصویریں نکلی ہیں۔“

”کوئی غلط تصویر نہیں ہے کلٹوم! صرف بازار میں اتاری ہوئی ایک تصویر ہے۔ جو اس نے مجھے بتائے بغیر اتاری تھی اور کچھ نہیں ہے کلٹوم! کچھ بھی نہیں ہے۔“ آخری تین چار الفاظ وہ اتنے زور سے بولی کہ اس کے گلے کی دھڑکیاں ہول تھیں۔ اتنی کوشش کے باوجود اس کی چلیسی ہوئی آواز بمثل کلٹوم کے کانوں تک پہنچی ہوگی۔

”ماں باپ سے رنج اور کوئی نہیں ہوتا پاجی! جب تمہارے ماں باپ کے پاس تمہاری صفائی نہیں ہے تو اور کسی کے پاس کیا ہوگی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ تمہارے بچے والوں نے تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔“

”یہ سب غلط ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ رائی کے پہاڑ، طے جا رہے ہیں۔ مجھے کسی نے دھکے نہیں دیے اور مجھ نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا۔“

”بانی! تمہاری کناہکاری یا بے کناہی کا فیصلہ تو تمہارے سر کے سائیں نے کرنا ہے۔ مجھے بتانے سے کوئی

۱۰ کچھ دیر اس کی طرف متوجہ رہے مگر ختم ہوئی تو لوگوں نے گنارست کے ہیٹ میں سکے وغیرہ پھینکے۔

ہادی نے نیا سکرٹ ملاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک بات یاد آ رہی! جہاں تک میں سمجھا ہوں۔ تم سچے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہو۔ جلال اور حجاب میں ٹھیک ٹھیک دوری پیدا ہو گئی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تو اس گھر میں رہنا اب حجاب کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ شاید حجاب کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہے۔ مگر پھر بھی وہ برداشت کر رہی ہے۔ اس کے والدین کی طرف سے بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہو رہا۔ وہ اتنا کھلی ذر رہے ہیں جلال سے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی بات ہے۔ کوئی خاص وجہ؟“

”وجہ تو سب کے سامنے ہے۔ اگر میں کہوں گی تو تمہیں قصہ لگے گا۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے۔“

”جی بات کہوں..... تو اے ماننا..... حجاب نے ہلال کا اعتماد ہی مجروح نہیں کیا ان کو مالی طور پر بھی نہیں
”مالی طور پر؟“

”تحا ہاں..... ان کے ابو انکل فیاض نے بہت چیرہ کھایا ہے جلال سے۔ شادی کے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ واپسی کے لیے مسلسل جھوٹے وعدے کرتے رہے ہیں۔ جلال قانونی کارروائی کا ارادہ نہ کر لیں تو چاروں کے اہل انکل فیاض پولیس کی کسٹڈی میں نظر آئیں گے۔“

ہادی کو ارم کی بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے تفصیل جاننا چاہی۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر کی ہانسی رہی۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ یہ راز افشانی اس کے لیے کوئی مشکل پیدا کرے گی لیکن ہادی کے اصرار پر وہ بتانے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کی باتوں سے ہادی پر انکشاف ہوا کہ نہ صرف جناب کے والدین کا گھر گروہی ہے بلکہ اس کے والد جلال کے پوتے بھی ہیں۔ لاکھ یورو سے زیادہ کے مقروض ہیں اور مارک آپ ڈال کر یہ رقم اور بڑھ جاتی ہے۔

کسی کتاب میں پڑھا ہوا یہ فقرہ ہادی کے ذہن میں گھومنے لگا۔ ”داماد کے سامنے تو بیٹی والوں کے سرویسے تھا جھکے ہوئے ہیں لیکن اگر بیٹی والے داماد کے مقروض بھی ہوں تو سر جھکانے والا یہ بوجھ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔“

اس کے دل و دماغ میں الجھل تھی۔ اب اسے اس سارے دباؤ اور خوف کی سمجھ زیادہ اچھے طریقے سے آنے لگی تھی جو جلال کے حوالے سے حجاب کے میکے میں موجود تھا۔ وہ ابھی ارم سے کچھ اور سوال بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر اس انکشاف کے بعد باقی سوال غیر اہم لگ رہے تھے۔

اس نے ویز کو ٹل کے لیے کہنے کے بعد ارم سے پوچھا۔ ”مجھے ابھی تم سے کچھ اور ضروری باتیں کرنی ہیں۔ جلال آج کل کتنے بے گھر لوفتا ہے۔“

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "نوبے کے قریب۔"

”اور جانا کتنے پیچھے ہے؟“

"آٹھ بجے صبح۔" اس کے لہجے میں قائلگی تھی۔

”میں پرسوں صبح آٹھ اوپر رات نو بجے کے درمیان کسی بھی وقت تم سے فون پر رابطہ کروں گا۔ مجھے کوئی ایسا لمحہ

میں۔ پانچویں وہ کب تک اسی طرح پڑی رہی۔ دل کے کسی دور دراز گوشے سے صدا آ رہی تھی، اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔

وہ غنودگی اور بیداری کی کوئی درمیانی کیفیت تھی۔ یہ خواب نہیں تھا۔ یا شاید جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ اس میں غنودہ تصورات نے اسے ایک عجیب منظر دکھایا۔ اسے لگا کہ دروازے کا قفل کھلا ہے۔ پتہ واہوئے۔ اس کے ابو دراصل ہو گئے۔ سفید براق لباس میں۔ سفیدی بال بال سفید سے چھپے کی طرف جتے ہوئے آنکھوں پر عینک کی چمک۔ دایا پتلا سینہ مگر تپتا ہوا۔ اور شانے سیدھے۔ وہ مستحکم قدموں سے چلتے اس کے پاس آئے۔ جبکہ اس کا ماتھا چمکا۔ بڑی آسانی سے اسے گود میں اٹھالیا۔ اسے اس طرح اٹھائے اٹھائے دو باہر نکلے۔ غنوم دم بخود کھڑی رہی۔ جلال کے کمرے نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے لے کر گھر کے وسیع لان کی طرف بڑھے۔ وہاں بے لکڑی کی آوازوں کی جھنناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ شاید سنکر دوں لوگ جمع تھے۔ ابو نے اس کے کان میں کہا۔ بڑے چہرے میں ہے کہ دو۔ بلند آواز سے کہہ دو۔ کسی سے ڈرنا نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بوڑھا ہوں مگر بے ڈر ہوں میری بچی۔

اور واقعی اس میں ایک عجیب توانائی بھری گئی۔ اس کے سینے میں مدتوں سے جکڑی ہوئی صدائیں اس کی آواز بن کر اس کے ہونٹوں سے نکلنے کے لیے بیتاب ہو گئیں۔

ابو نے اسے اٹھا اور وہ اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ وسیع لان کچھ بھرا تھا۔ ایک بہت بڑے شہر کی کچھ پر ایک نورانی صورت والے بزرگ منقش کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کی سیدھی سفید داڑھی ان کے سینے پر گرا رہی تھی۔ ان کے پہلو میں جلال بھی ایک شاندار کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل شیج تھی۔ کسی نظر بھوم کی اگلی صف پر پڑی۔ یہاں اس کے ابو جلال کے کئی عزیز واقارب موجود تھے۔ دائیں طرف جلال کے چار بھائی بیروز بیضا تھا۔ سرخ سپید صفا چٹ چہرہ ٹیکر اور خیاں پہنے ہوئے ہاتھ میں داسکی کا جام تھا۔ دونوں اطراف میں بھائی بڑیاں تھیں۔

جیو، کچھ کرکٹاب ڈھانڈھائی۔ ابو نے اس کے کندھے پر تھکی دی۔ "میں یہاں ہوں، تمہارے ساتھ ہوں۔ جاؤ۔" اس کے قدموں کی لڑائی جاتی رہی۔ وہ میز حیاں چڑھ کر چوڑے پر آگئی۔ سفید براق داڑھی والے بزرگ سناٹا۔ "ہاں بیٹی، تم اپنی سفالی میں کچھ کھانا چاہ رہی ہو۔"

"ہاں محترم بزرگ۔" وہ صاف توانا آواز میں بولی۔ "لیکن پہلے اس شخص کو شیج سے اتاریں اور اس شخص کے ہاتھ میں جو اگلی صف میں دائیں طرف بیٹھا ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہ تو جلال الدین ہیں۔ روم کی سطر کی کوئی ایک معزز شخص!"

"لیکن میری شرط یہی ہے محترم بزرگ، میں تب ہی ہاتھ بٹوں گی جب یہ شیج سے اتر کر اپنے بھائی کے پاس پہنچے۔"

فائدہ نہیں ہے۔ میں تو ستم کی بندی ہوں۔ میں تو بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ کھانا کھا لو اور حوصلہ رکھو۔ پہلے بھی تو حوصلے والے کام کیے ہی ہیں، نام نہ نہ۔"

"خدا کے لیے کلثوم! مجھے کوئی فون لا دو۔ میں جلال سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے ویسے یاد دہانی میں طرح کرے میں بند نہ کروں۔ میں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے جب آنا ہے خود ہی آنا ہے۔" اس نے خشکیں انداز میں کہا اور جواب کے چہرے کے سامنے دروازہ دھککے سے بند کر دیا۔ جواب ہدائی انداز میں پھر چلائے گئی۔ یہ کمرہ جیسے ٹھک ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دیواریں موت کی پرچھائیوں کی طرح جواب کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ کچھ کچھ کھانسی لینے لگی۔ وہ بیروز بند جگہوں سے خوف کھاتی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ والدہ نے کسی بات پر سرزنش کے طور پر اسے ہاتھ بھوم میں بند کر دیا تھا اور خود اپنے کام سے چھٹ پر چلی گئی تھیں۔ اس کے دور دراز حال کر لیا تھا۔ بے ہوش ہوئے اسے کچھ بھول گیا تھا۔ اس کی زبان پر صرف ایک ہی نام تھا۔ "ابو جی! ابو جی!" اور ابو جی نے اس کی پکار سن لی تھی۔ انہوں نے اسے ہاتھ روم سے نکالا تھا۔ گود میں اٹھایا تھا۔ اس واقعے کے بعد ابو جی دن اونی سے سخت خفا رہے تھے۔

آج ان جاں مسل لکھوں میں اسے نہ جانے کیوں پھر ابو جی کی یاد آئے۔ وہ دل ہی دل میں انہیں پکارنے لگی۔ "ابو جی! میری مدد کو کوئی نہیں آ رہا۔ کوئی مجھے اس تاریکی سے نہیں نکال رہا۔ آج پھر میری جان پر بن گئی ہے ابو جی! مجھے یہاں سے نکال لیں۔ ورنہ پھر کبھی میری صورت نہ دیکھ سکیں گے۔ آپ نے کبھی مجھے اتار دینے نہیں دیا تھا۔ آج کیوں میرا دروازہ نہیں کھول رہے۔ کیوں آپ بھی منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اپنی بیٹی پر اعتماد نہیں رہا؟ انہیں خونا پر شک کرنے لگے ہیں؟ ایسا نہ کیجیے ابو جی! آپ ہی نے تو کہا تھا آپ کبھی میری انگلی نہیں چھوڑیں گے۔ میں اب بھی وہاں بن جاؤں گی تب بھی نہیں۔ میں ابھی دادی اماں نہیں بنی۔ ابھی ماں بھی نہیں بنی۔ ابھی میں نے جینا بھی نہیں سیکھا۔ میں مر رہی ہوں۔ کیا آپ مجھے مرنے دیں گے۔ اسی طرح بے بسی سے۔"

اچانک اسے محسوس ہوا کہ دروازے کی طرف آنے والے زینوں پر پھر آہٹ ہوئی ہے۔ کوئی نیچے اتر رہا تھا شاید۔ کون ہو سکتا تھا۔ اس کے ابو جی؟ جو اپنے ناتواں جسم کو کھینچے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کا بھائی فیصل جسے اپنی بیماری باہمی کی پکار کچھ لاتی تھی۔ یا پھر ڈاکٹر انکل عطا جو اسے بیٹیوں کی طرح ہی چاہتے تھے یا پھر ماموں جو بیمار رہتے تھے۔ وہ سر تاپا سہمت بن گئی۔ وہیں لیٹی لیٹی امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کوئی دروازے پر پہنچا۔ آہٹ ہوئی۔ پھر اندازہ ہوا کہ دروازے کو باہر سے منقل کیا جا رہا ہے۔ تالا لگائے جانے کی آوازیں بڑی بے رحم تھیں۔ وہ ایک بار پھر دروازے پر پہنچ گئی۔ آہ دینا کرنے لگی۔ مگر سننے والے کان تو شاید سمجھ رہے ہو چکے تھے آنے والا میز حیاں چڑھ کر واپس چلا گیا۔

وہ کھڑکی ہی بن کر کمرے کے بل پھر دروازے کے پاس ہی لیٹ گئی۔ سانس کی آمد و رفت مشکل سے مشکل سے ہوتی جا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں بن ہو رہے تھے۔ شاید وہ مر رہی ہے۔ اس نے سوچا۔ دماغ پر دھند چھانے لگی۔ اسے کدو فرش سے اٹھ کر آہستہ آہستہ ہوا میں معلق ہو رہی ہے۔ ایک تاریک اور سرد ہوا میں۔ اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔

یمن ہے، لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو اسے بھی کوئی تمیز نہیں۔ فیروز جد یہ فیئشن کے کپڑوں پر مامانہ ہزاروں خرچ کر رہا ہے۔ یہ شلوار قمیص اور شیر دانی ہی اتنی مہنگی، بخواتا ہے کہ حساب برابر ہو جاتا ہے۔ فیروز نت نئی عورتوں کے ساتھ ہفت گزارتا ہے۔ اس نے ایک خاص دائرے میں رہ کر یہ سہولت حاصل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ پاور اس جیسے لوگ نکاح کو آڑ دیتا لیتے ہیں۔ فیروز دنیا میں گھومتا پھرتا ہے۔ سیر سپاٹے پر لاکھوں خرچ کرتا ہے۔ اس نے اور اس کے چہر صاحب نے تبلیغی دوروں کی آزمائش یہ شوق پورا کیا ہوا ہے۔ آپ غور سے دیکھتے چلے جائیں ہرے مخمر بزرگ، آپ کو ان دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آئے گا اور دنیا دنیا پھر بھی اس بے چارے کے لیے ایک قید خانہ ہے۔ یہ قیدی نہیں ہے بزرگوار! قیدی تو میں ہوں یہ تو داروغہ ہے۔"

"داروغہ ہے؟ کیا مطلب؟"

”اس قید خانے کا داروغہ ہے جس کو یہ گھر کہتا ہے اور جس کو بیوی کہتا ہے وہ قیدی ہے۔ اس جیسے لوگ نکاح کے یوں پر حوالے کے بعد اپنا حق سمجھتے ہیں کہ اپنی بیوی کو اپنی مرضی سے جینے پر مجبور کر دیں یہ چاہے جس اس کا سارا وجود ایک دم ناپید ہو جائے۔ اس کا حال اور مستقبل صرف اور صرف ان کے گرد گھومے۔ وہ روئے تو ان کے لیے ہنسنے تو ان کی اجازت سے۔ یہ قیدی اور داروغہ کا رشتہ نہیں تو پھر کیا ہے محترم بزرگ! یہ مارتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ میں نے بھی بس تھوڑا سا رونے کی جسارت کی تھی۔ چند دن اپنے داروغہ کی مرضی کے بغیر کھلی ہوا میں سانس لیا تھا۔ میں لاتی ہوں۔ یہ بھی میری غلطی تھی۔ لیکن میں گناہگار نہیں ہوں جناب! میری یہ سزا نہیں ہے جو مجھے دی جا رہی ہے۔“

اپنا کسے جناب نے دیکھا کہ جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ بول نہیں پارہا تھا مگر اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار جناب کی طرف آگیا۔ سچ کی سیر حیاں چڑھ کر جناب پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے چمکدار پھل کا ٹوکھا تھا۔ جناب کے والد میدان کر اس کے مناسبت آگئے۔ بنی کے سامنے دیوار بن گئے۔ اسٹیج پر موجود لوگوں نے اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر دیش سے دیوانہ ہوا ہوا تھا۔ اس کے مسلح کارڈز بھی اسٹیج پر چڑھ آئے۔ انہوں نے اس کی مدد کی۔ لوگ تھرتھرتے ہوئے۔ جلال نے پہلا وار جناب کے سینے پر کیا جو اس کے ابونے اپنے نژاد جسم پر جمیلا۔ پھر دوسرا وار اس کے اوپر کر گئے۔ دھکا لگنے سے وہ بھی کئی فٹ اونچے اسٹیج سے نیچے جا گری۔ اس کی سانس کھڑنٹ گئی۔ اسے دیکھ کر وہ بھی اسے اپنا اسٹیج پر کھرا م سا بچا ہوا تھا۔ جلال نیچے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی بھی وقت اس کے آکر اس کا پیٹ چاک کر کے کھٹکا تھا۔ پھر اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر اس کی سانس کی ڈور توڑ سکتا تھا۔ اس کے انہیں تھے۔ اب اسے کس نے بچا ہوا تھا۔ اب تو کی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا لیکن یہ کیا تھا؟ اس نے ڈوبتی نظروں سے دیکھا۔ دور ایک سایہ سا حرکت کر رہا تھا۔ جناب کو دیکھ کر اس کی مدد کرنا چاہ رہا ہے۔ مدد کے لیے آ رہا ہے۔ وہ کون

وہ کون تھا؟

ہاں سخت بے چین تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ حجاب کہاں ہو کس حال میں ہے۔ کوشش کے باوجود

حجاب بلند؛ واز میں ہوئی۔ "محترم بزرگ! میرے شوہر جلال کو دوسری شادی کا حق تھا مگر عیاشی کا حق نہیں تھا۔"
اس نے شادی کی رعایت کو مصرف اور مصرف اپنی بخش و عشرت کے لیے استعمال کیا ہے اور اس سلسلے میں ہر اہل غلوئی
بدایت کو نظر انداز کیا۔"

محترم بزرگ ہوئے۔" لیکن بیٹی! اگر یہ شخص شادی کرنے کے بعد دونوں بیویوں میں مساوات برقرار رکھتا ہے تو پھر اعتراض کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔"

”یہی تو بات ہے محترم بزرگ۔“ دو دلیری سے بولی۔ ”اس نے جن ہدایات کو نظر انداز کیا ہے ان میں یہ مساوات اور انصاف والی شرط بھی ہے۔ اس سے پوچھیں یہ دونوں بیویوں میں صرف ہر ایک کا مساوات بھی تھے دن قائم رکھ۔ نکاح ہے۔ اس سے پوچھیں یہ محترم! ایک مہینے کے اندر اندر اس نے اس مساوات کا حلیہ نکال دیا۔ تین دن میری طرف تین دن دوسری بیوی کی طرف۔ یہ تھے بروز اس طریقے پر چل سکا ہے۔ بس اس کو طلاق دے دو۔“

تھا۔ اس نے اس مساوات کی ایک جانب تھپڑ اور شوکرین کو کھدو دیا اور دوسری طرف تھپٹیں اور نوازشیں۔“

”کیا ایسا بوجال الدین؟“ محترم بزرگ نے پوچھا۔

جالال نے کھڑے ہو کر کچھ کہتا چاہا لیکن اس کی آواز پھنس گئی۔ اس کے منہ میں کھانسی کا پھندا سا لگ گیا۔ وہ بولے بغیر بیٹھ گیا۔

حجاب بے باکی سے بولی۔ ”یہ جھوٹا ہے محترم بزرگ! ہر لحاظ سے جھوٹا ہے۔ اس نے اپنی طرح طبع کے لیے دوسری شادی کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ تیسری بھی کرے، جس طرح اس کے پیر طریقت صاحب نے کئی عورتوں کو رکھی ہیں۔ یہ منافق لوگ ہیں محترم بزرگ۔ ان کی زبان پر کچھ دل میں کچھ ہوتا ہے۔ میرے شوہر جلال کو بتائیے کہ بار بار کہتا ہے کہ مومن کے لیے دنیا ایک قید خانہ ہے۔ اس کی اصل زندگی تو آخرت میں شروع ہوگی۔ اس کا اصل زندگی پر بھروسہ نہیں ہے محترم بزرگ! اگر ہوتا تو پھر شاید اس کی موجودہ زندگی میں قید خانے کی زندگی والی بھنگ ہوتی۔ اس سے پوچھیں محترم بزرگ! یہ کیسا قید خانہ ہے جس میں بہترین لذتیں اور راحتیں بھی موجود ہیں۔ ہے شہ دولت بھی ہے اور مزید دولت کی شبانہ روز ہوس بھی ہے۔ اگر یہ قید خانہ ہے تو پھر اس دنیا کی جہل زندگی کیا ہوگی؟“

محترم بزرگ نے جلال سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”کیا تم ایسی بات کہتے رہے ہو؟ اور اس حقیقت کو سمجھتے ہو کہ مومن کے لیے دنیا ایک قید خانہ ہے؟“

جلال نے کھڑے ہو کر یوں نالہ کیا کہ آواز ایک بار پھر گلے میں اٹک کر رہ گئی شہید کھانسی کے سبب وہ دیرا ہو گیا اور بیٹھ گیا۔

حجاب کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی۔ دو مگر ج کر پائی۔ ”یہ کہتا رہا ہے محترم بزرگ! اور ایسی اور بھی بہت سی باتیں کہتا ہے جن پر عمل نہیں کرتا۔ اس کا دنیا دار بھائی فیروز بدنام ہے لیکن حقیقت میں شاید فیروز میں اور اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ فیروز شراب پیتا ہے، شراب نہیں پیتا لیکن اسے دولت اور اعتبار کا نشہ ہے۔ فیروز دنیا کے بھرتی کھانے کھا کر کام و بدن کی لذت حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ نظامہ یہ حرام حلال کی چیز

کی تھی اور اس کی آواز سننے ہی فون بند کر دیا تھا۔ گزاری کی زبانی ہادی کو صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ شریفان کو درس دلانے گھر سے واپس نئے گھر بھیج دیا گیا ہے اور درس والے گھر میں چونکدار کے علاوہ ایک نیا گارڈ بھی بھیج دیا گیا ہے۔

حجاب کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں ہادی کا اہم کردار تھا۔ کبھی کبھی تو وہ عرق نہ است میں ڈوب جاتا تھا۔ اس کی غلطیوں میں تصویر والی غلطی بھی شامل تھی۔ وہ حجاب سے عشق کرنے لگا تھا یہ بڑا انوکھا عاشق تھا اور وہ جانتا تھا کہ عشق صرف حاصل کرنے کا نام ہی نہیں ہے۔ عشق کسی کے لیے اپنی خواہشات کو یکسر قربان کرنے کا نام بھی ہے۔ حجاب کو مصائب سے لٹا کٹنے کے لیے وہ اپنی ہی ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ ایک بھر پور کوشش۔ اس کوشش کے لیے حوصلہ درکار تھا اور یہ حوصلہ حجاب سے ہم جانے والی والہانہ محبت اسے مہیا کر چکی تھی۔ آج وہ ایک خاص ارادے کے ساتھ ہوٹل سے نکلا تھا۔

احتیاطاً اس نے ڈپٹی ہاشم امیرک کے ماتحت تھانہ کو اپنے ساتھ لے لیا۔ تھانہ میں ایک سفید ڈائننگ کھانا کھا رہی تھی اور وردی کے بجائے سادہ لباس میں تھا۔ یہ سہ پہر پانی پیچے کا وقت تھا۔ وہ جلال کے دوست و عزیز ڈی۔ پی۔ اے کے پاس پر پہنچے۔ ہادی براہ راست جلال کے دفتر میں جانا اور اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ پروگرام یہی تھا کہ وہ اور تھانہ کے علیحدہ علیحدہ شور میں داخل ہوں گے۔ تھانہ میں شور کے گراؤ نہ لگور پر دھڑکا چکا تھا۔ ہادی، جلال کے دفتر میں چلا جائے گا۔

مگر جب وہ شور پہنچے پروگرام تبدیل ہو گیا۔ ہادی نے دوری سے جلال کی دیکھ کر ہر چہ کوششوں سے ہٹے دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ زرق برق لباس میں ارم بھی اس کے پہلو میں بیٹھی ہے۔

”میرا خیال ہے ہمیں ان کے پیچھے جانا چاہیے۔“ ہادی نے انگلیں اشارت میں تھانہ سے کہا۔
تھانہ نے اپنا نام گنجائش میں ہلایا اور ڈائننگ میں روک دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک محفوظ جگہ پر رکتے ہوئے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ ایک قریبی ساحل پر موجود تھے۔ آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ سمندر کے کنارے رش تھا۔ نیلی پیلی چھتریوں سے لوگوں کا جھوم دکھائی دیتا تھا۔ یہاں زیادہ تر فیملیاں ہی تھیں۔ ہادی اور تھانہ پارکنگ کے قریب گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ جلال اور ارم گاڑی سے نکل کر ریت پر چہل قدمی کرنے لگے۔ بحیرہ روم کا نیلا پانی ڈوبے سورج کی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ ہادی دور سے ان دونوں کی چہل قدمی کا نظارہ کرنے لگا۔ ارم کے چہرے کا نیلا حصہ یعنی ٹھوڑی اور ہونٹ وغیرہ چادر کے نقاب میں تھے، باقی حصہ نظر آ رہا تھا وہ ایک چمکنا ہوا چہرہ ہوئے تھی۔ وہ قدرے خاموش تھی مگر جلال ایسے موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ارم کا موڈ بحال کرنے کے لیے اسے یہاں لایا ہے (ارم کے موڈ کی خرابی کا تعلق غالباً اسی تہلکہ خیز ملاقات سے تھا جو کل اس کے اور ہادی کے درمیان شانزائے گم نام کہنے میں ہوئی تھی)

ان دونوں نے کوئلہ ڈرٹس لیں اور چہرے وغیرہ کھائے۔ کچھ دیر بعد ارم کا موڈ بھی بہتر نظر آنے لگا۔ ہمیشہ جلدی نظر آنے والا جلال بات بات پر ہنس رہا تھا۔ کسی وقت وہ تھوڑی سی شوخی کا مظاہرہ کرتا تھا اور ارم کے پہلو میں بیٹھ جاتا تھا۔

چلے اسے اپنے ساتھ بھی لگا لیتا تھا۔ اس دوران میں ارم کے پاؤں میں کوئی چیز چبھ گئی۔ وہ غالباً نئے پاؤں تھے۔ وہ ریت پر بیٹھ گئی۔ جلال بھی بے تکلف بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں گود میں رکھ کر اس کا تلواریا کیسے لگا۔ ان لمحوں میں وہ کوئی عاشق نوجوان ہی دکھائی دیا۔
ہادی ایک ٹھنڈی سانس لے کر رو گیا۔

جلال اور ارم کی واپسی سورج ڈوبنے سے چند منٹ پہلے ہوئی۔ ہادی اور تھانہ کی گاڑی ایک بار پھر ہمر جیپ سے پیچھے تھی۔ جلال سے ملاقات کا آج تو کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ قرآن سے یہی لگتا تھا کہ اب وہ دونوں میرے گھر جائیں گے۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ راستے میں ایک جگہ درختوں کے نیچے اچانک جلال نے گاڑی روکی۔ قریب ہی ایک اسلامک کچلر سینٹر نظر آ رہا تھا۔ یہ دراصل ایک ترک مسجد تھی لیکن اس کے مینار وغیرہ نہیں تھے۔ وہ مسجد کے اندر چلا گیا۔ یقیناً مغرب کی نماز ادا کرنے گیا تھا۔ ارم وہیں گاڑی میں بیٹھی رہی۔ ہادی نے چند لمحوں سوچا پھر وہ بھی گاڑی سے نکل کر مسجد میں چلا گیا۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ قیمتی قالین بچھے تھے۔ جدید آڈیو سسٹم تھا۔ ایک حجاب شے کے ایک چوکور کمرے میں کیپوئرز سی ڈیز اور وی بی کتب کا ذخیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ باجماعت نماز تو ہو چکی تھی، جلال آخری صف میں کھڑا اپنی نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں نمبر آؤ کے بجائے غلبت اور بے دھیانی کی کیفیت دکھائی دیتی تھی۔

ہادی نے بھی وضو کر کے فرض ادا کیے۔ اسی دوران میں جلال باہر جانے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ اس نے ابھی تک ہادی کو دیکھا نہیں تھا۔ ہادی قالین پر اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں سکڑ کر ہادی کو دیکھا۔ جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ ہادی ہی ہے۔ ”اسلام ٹیکم جلال صاحب!“ ہادی نے محترم لہجے میں کہا۔

وہ سلام کا جواب دینا بھی بھول گیا۔ شیر والی کے براؤن کالر کے اوپر اس کا بھرا بھرا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔
”جسب اعزاز کیں لالا۔“ تم..... ابھی تک گئے نہیں ہو یہاں سے؟“

”جس جاتے ہی والا ہوں جلال صاحب! آپ سے ایک ملاقات کے لیے زکا ہوا تھا۔“
”ملاقات؟ کس لیے ملاقات؟“ جلال کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں میری اس طرح کی بے وقت مداخلت آپ کو مزید لگی ہے۔ میں اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ نام نہیں لوں گا۔“

جلال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ منبھولی سے بھیج کر رکھے تھے۔ آنکھوں میں بیجانی کیفیت تھی۔ اس نے آہستہ پائنتی مار کھی تھی۔ ہادی نے اس کے سامنے کاناؤ بیٹھ بیٹھنے کہا۔ ”جلال صاحب! میں اللہ کے گھر میں بیٹھا ہوں۔ اللہ کو حاضر حاضر جان کر کہتا ہوں آپ کی دعوت بالظہر ہے حضور ہیں۔ ان کی عزت پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا داغ بھی نہیں ہے۔ ہاں اتنی غلطی ان سے ضرور ہوئی ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ چند منٹ پیش کو ذلت کیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جلال صاحب! کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں ان پر کوئی

جلد بک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہادی اور تھامس وہاں سے رختہ ہو رہے تھے۔ ہمر جیب کچھ قلم پر کھڑی تھی اور اس کے کھڑکیاں دروازے بند تھیں۔ ہادی کے اندازے کے مطابق ارم اس جھگڑے سے بے خبری رہی تھی۔

○ ○ ○ ○ ○

رات کے دس بجے تھے۔ ہادی اپنے ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ اس کے سینے میں لپٹا تھی۔ وہ جوابی طور پر جلال پر ہنسا اٹھاتا تھا اور ایسا کرنے کی ہمت بھی نہ رکھتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔ اسے یہ سب کچھ جھیلنا اچھا لگا تھا۔ حجاب کے حوالے سے لگنے والی ہرجوٹ اس کے تصورات میں ایک سنہری ستارے کی طرح چمکنے لگی تھی۔

جلال سے ہونے والی اس سنگین ملاقات کے بعد یہ بات اچھی طرح ہادی کی سمجھ میں آئی تھی کہ جلال اور حجاب کے حالات پوائنٹ آف نوریشن پر آگئے ہیں۔ جلال میں کوئی معمولی سے معمولی لچک بھی ہادی کو دکھائی نہیں دی۔ ہر ایسا ہوتا تو شاید وہ اپنی عزت بے عزتی کو ایک طرف رکھ کر جلال کے مہبت دور کرنے کی ایک اور کوشش کرتا۔ جلال اس کی توقع سے زیادہ سنگناخ اور کرخٹ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بظاہر تو حجاب کو طلاق دینے پر آمادہ تھا مگر حقیقت میں اسے اپنا جس بے جا میں رکھنے کا جذبہ کیے ہوئے تھا۔

ہادی کے ان خیالات کو اس وقت مزید تقویت ملی جب اگلی صبح اسے گھڑاری نے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ کل اس کی ملاقات جلال کے ذمہ دار عثمان سے ہوئی ہے۔ عثمان کا کہنا ہے کہ درس والے گھر میں حجاب پر بڑی سختی ہو رہی ہے۔ دو تین دن پہلے اس نے ملازمہ شریفاں کا فون برآمد ہو گیا تھا۔ جلال نے بتا نہیں اس سے کیا مطلب لیا اور اس نے سخت مار پیٹ کی۔ ایک ملازمہ حجاب کے پہنے ہوئے خون آلود کپڑے گھر کے غسل خانے میں دیکھے ہیں۔

کچھ دنوں رات اس کی عمرانی کرتی ہے اور کسی کو کسی سے ملنے کی اجازت نہیں۔

اس کے گھر والوں کو بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے شہر والوں کو۔ ہادی نے گھڑارے سے پوچھا۔
”وہ تو شاید ملنا ہی نہیں چاہے۔ یا پھر ڈرتے ہیں لگتا ہے کہ انہوں نے حجاب کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔
اس کی والدہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ پھر بھی کسی نے اسے اس کی اطلاع نہیں دی۔ دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔
عثمان کا کہنا ہے کہ کل رات دریں والے گھر میں ایک اور گارڈ بھیج دیا گیا ہے۔ اب وہاں ایک چوکیدار اور دو گارڈز ہیں۔ شاید جلال صاحب کو کوئی خطرہ ہو جائے۔“

ہادی سمجھ گیا کہ یہ اضافی گارڈ کل شام کچھ نہیں پیش آنے والے واقعے کے رد عمل کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ حالات سنگین شکل اختیار کر رہے تھے۔

اب کوئی راستہ اندام اٹھانے کی ضرورت نہ رہا۔ اگلی صبح ہادی نے ڈاکٹر عطاس سے ملنے کا فیصلہ لیا۔ ڈاکٹر عطاس صاحب حجاب کے گھر والوں کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ اور حجاب فیملی وغیرہ انہیں ڈاکٹر انکل کے نام سے پکارتے تھے۔ چند دن پہلے ڈاکٹر عطاس کے کلینک میں ہادی ان سے مل چکا تھا۔ اس نے ان سے نزلے بخار کی دوا لی تھی۔

شک نہ کیجیے گا۔ میں ان کی صفائی میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“
ہادی کے جسم میں لرزش تھی۔ جلال پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔

ہادی نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں جلال صاحب! ایک تصویر کی بات کو آپ کے سامنے بہت بڑھا چڑھا کر بتایا گیا ہے۔ وہ تصویر میں بننے ان کی بے خبری میں اتاری تھی۔ انہیں اس کی بالکل خبر نہیں تھی۔ یہ میری غلطی ہے جس میں کو تسلیم کرتا ہوں۔ آپ اس کے لیے مجھے جو سزا دینا چاہیں مجھے قبول ہے لیکن خدا! اس حوالے سے ان کو معذور ازام نہ ٹھہرائیے گا۔ میں اس ایک گھور روز میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ کبھی میری صورت نہیں دیکھیں گے۔ اس حوالے سے تسلی رکھیے۔“

جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجبوراً ہادی کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔ جلال کے تیرا تھتھے نہیں تھے۔ ان کے گھیرنے میں کہا۔ ”تم کتنی بار یہاں سے جاؤ گے، اور کتنی بار آؤ گے کہ دوسری بات مجھے یہ بتاؤ کہ میری بیوی کی زندگی کے لیے تم سے کسی نے کہا ہے؟“

”کسی نے نہیں کہا۔ جلال صاحب! یہ میرے اندر کی سچائی ہے جو مجھے سمجھتی ہے۔“
”کیوں بند کرو۔“ جلال اسے زور سے دھاڑا کہ مسجد کے دروازے کو کھول دیکھئے۔
موجود تھے۔ دو چرک کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔

”حرامزادے! شیطان! تیری جرأت کیسے ہوئی۔ مجھ سے بات کرنے کی۔ تیری جرأت کیسے ہوئی۔“ دو دھاڑا اور نکلنے سے بے پروا ہو کر ہادی پر پل پڑا۔ اس کا زور دار دھکا لگنے سے ہادی ایک ستون سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں میں ستارے سے تاج گئے۔ اس نے ہادی پر تھپڑ مار کے برساتنے کی کوشش کی۔ ہادی نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔
پندرہ ضربات اس کو سہتا پڑیں۔ اس کا گریبان پھٹ گیا۔ لوگ بیچ میں کود پڑے۔ پھر سے ہوئے جلال کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ کسی نے پکار کر کہا۔ ”یہ مسجد ہے بھائی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

جلال، ہادی کی طرف آنکلی اٹھا کر گرجا۔ ”تجھے کہا تھا نا چلا جا یہاں سے۔ تجھے کہا تھا نا۔ میں تیری جان لے لوں گا۔ میں تیرے سانس کھینچ لوں گا۔“

ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ ”یہ مسجد ہے۔ ایسا مت کریں یہاں۔“

جلال لپک لپک کر ہادی کی طرف آ رہا تھا۔ نمازیوں نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ اسی دوران میں ڈپٹی کا آتھا تھا اس بھی اندر آ گیا۔ اس نے ہادی کی طرف دیکھا، جیسے جلال کی طرف بڑھنے کی اجازت چاہ رہا ہو۔ ”نہیں تمہاں!“ ہادی نے کہا۔

کچھ لوگ ہادی کو گھیرے میں لے کر مسجد سے باہر لے آئے۔ ہادی کے منہ میں خون کا ٹپکنا ڈانٹا تھا ہوا تھا۔ مسجد کے دروازے کے پاس اب بھی جلال کی دھماکی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بالکل ”ہائیر“ ہو رہا تھا۔ ہادی نے تھامس کو اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف آ گیا۔ اگر دوسروں کو تو اس کا بھی ہادی کے لیے یہی مشورہ تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ جائے۔ جھگڑے کی وجہ تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر یہ ضرور پتا چل گیا تھا کہ یہ

"کس طرح کا تعاون؟"

"مالی تعاون ڈاکٹر صاحب! اور ایک بار پھر کہوں گا کہ پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک فیاض اس وقت سخت مالی مشکلات میں ہیں۔ انہوں نے خالص صوفیہ کے علاج اور فیصل کی شاپ کے لیے ایک بری قرض اٹھایا تھا، جو حال اتر نہیں سکا اور یہی قرض ہے جس کے سبب حجاب کی مصیبت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔"

انہوں نے پھر اپنی آنکھیں ہادی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ وہ گہرائی تک دیکھ رہے تھے۔ یہ فیصلہ لکھ تھا۔ آخر یوں ہوا کہ ہادی کے اندر کی سچائی نے ان پر قرار واقعی اثر کیا ہے۔ وہ میری سانس لے کر بولے۔ "کھل کر کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! پلیز میری بے لوثی پر شبہ نہ کیجیے گا۔ میں انکل فیاض کو قرض حسد کے طور پر کچھ رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے حوالے سے بہت بدگمان ہیں۔ میری ایسی کوئی پیشکش انہیں قبول نہ ہوگی۔"

"ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے ہر سوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"میں جانتا ہوں ڈاکٹر صاحب! کہ انکل فیاض کے لیے رقم کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں آپ بھی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کے ایک دو دوستوں نے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ آپ مجھے بھی ان میں شامل سمجھتے۔ میں چاہتا ہوں کہ رقم کی فراہمی کے سلسلے میں میں سانس لے سکوں۔ یہ کام آپ کے توسط سے ہو جائے۔ آپ اس میں میرا کوئی ذکر نہ کریں۔ اور میں اپنی بات دہرائوں گا کہ یہ قرض حسد ہوگا۔ وہ جیسے اور جب چاہیں اپنی بھولت کے مطابق لوٹا سکیں گے۔"

انکل آدھ پون گئے میں ڈاکٹر عطا اور ہادی کے درمیان اس معاملے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہادی نے کہا کہ وہ ایک ہندو بیس روز کے اندر انہیں اپنے ذریعے سے قریباً 8 لاکھ روپے فراہم کر سکتا ہے۔

یوں ملتا تھا کہ ڈاکٹر عطا کی معاملہ نمونی نے اپنی سب سے بڑی کامیابی کو کنٹرول لیا ہے۔ وہ اس کی شرافت کے ساتھ ساتھ اس کے جذبے کی شدت اور سچائی کے بھی قائل ہو رہے ہیں۔ ان دونوں میں جلد ہی اعتماد کی فضا قائم ہوتی۔

انہوں نے باہمی کو رقم سے کی مکمل تفصیل فراہم کی اور یہ بھی بتایا کہ کتنی رقم کا انتظام ہو چکا ہے۔ یہ دراصل پہلی قسط کا انتظام تھا جو قریباً 102300 روپے یعنی ایک کروڑ دس لاکھ روپے کے لگ بھگ بنتی تھی لیکن اس میں بھی ابھی پینتیس چار لاکھ روپے کم تھے۔

ہادی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں چاہتا ہوں کہ قسط کے بجائے پوری رقم ہی ان لوگوں کے منہ پر ماری جائے اور یہ معاملہ ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد سب کچھ حجاب پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جلال سے Divorce چاہتی ہیں یا نہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہادی! مگر یہ کہنا آسان ہے اس پہل عمل خاصا مشکل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے یہ مارک اپ وغیرہ ڈال کر سواتین کروڑ روپے کے قریب ملتا جلتا ہے۔ بہت کوشش کر کے ہم جو جمع کر سکے ہیں وہ پینتھ ہزار روپے یعنی ستر لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ اب اگر تمہارے 80 لاکھ مل جاتے ہیں تو یہ ڈیڑھ کروڑ کے قریب مل جائے گا۔ اس کے بعد بھی جس لگ بھگ مزید ایک کروڑ ادھائی لاکھ کی ضرورت ہوگی۔"

پسندیدہ

ڈاکٹر عطا ہر لحاظ سے ہادی کو ایک نرم خور دانا پیرا شخص لگتے تھے۔ وہ ہادی کے ادنیٰ ذوق سے بھی متاثر ہوتے تھے۔ آج ہادی ایک پروگرام لے کر ان کی طرف جا رہا تھا اور نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر عطا اس کی گواہی دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کا گھر کلینک کے ساتھ ہی واقع تھا۔ اتوار کے روز دو بج کے وقت چھٹی کرتے تھے۔ ہادی کو پتا تھا کہ وہ گھر میں ہی ہوں گے۔ ہادی نے ملازم کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ قریباً دس منٹ بعد وہ عطا صاحب کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا گرین ٹی پی رہا تھا۔ ان کی اطالوی وائف کو دس گیارہ بجے تک سونا تھا۔ عطا صاحب اکبر سے بدن کے بچپن کا ساتھ سالہ شخص تھے۔ عمر کے مقابلے میں صحت بہت اچھی تھی۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں نرم خوئی اور معاملہ نمونی کی جھلک بہت نمایاں نظر آتی تھی۔ اپنے طور اطوار سے وہ روشن خیال بھی لگتے تھے۔ چار پانچ منٹ کے اندر ہی ان کی باتوں سے ہادی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ولہبہ کیل کی حالت میں ہیں۔

طرح آگاہ ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حجاب کس صورت حال سے گزر رہی ہے اور اس صورت حال سے کس طرح آگاہ ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حجاب کس صورت حال سے گزر رہی ہے اور اس صورت حال سے کس طرح آگاہ ہیں۔

اس سب کے باوجود وہ ان کے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ہادی کے حوالے سے وہ بدگمانیاں اور طیش ڈاکٹر عطا کے ذہن میں نہیں تھا جو انکل فیاض اور فیصل وغیرہ کے ہاں پایا جا سکتا تھا۔ یا کم از کم یہ اس درجے کا نہیں تھا۔

ہادی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں بس تمہیں باندھنا نہیں چاہتا۔ آپ کے سامنے حقیقت یہ ہے کہ میں ہوں کہ میرے اور حجاب کے حوالے سے جو باتیں پھیلائی گئی ہیں ان میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی سچائی نہیں ہے۔ ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح چند بار ملے ضرور ہیں لیکن وہ بھی ایک فاصلے اور رک رکھاؤ کے ساتھ۔"

وہ بڑی گہری نظروں سے ہادی کو دیکھتے رہے۔ ان کی نگاہیں جیسے ہادی کے اندر تک جا رہی تھیں۔ بہر حال حسب معمول دھیمے لہجے میں بولے۔ "کیا دونوں طرف ہی ایسا تھا۔"

"م..... میں سمجھا نہیں تھی۔"

"مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تم حجاب کے متعلق جو کہہ رہے ہو وہ بالکل درست ہے لیکن کیا تم اپنے بارے میں درست کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے تمہارے دل میں حجاب کے لیے بس دوتی ہے؟"

ایک لمحے کے لیے وہ شٹا گیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! حجاب میرے لیے بیش بہا عزت ہے۔ میں اس پر نہیں ہٹی۔ میرے ذہن میں ان کے لیے کوئی نامناسب حوالہ آئی نہیں سکتا یہ ناممکن ہے حجاب۔"

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پھر خاموش رہے۔ اسے دیکھتے رہے۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کچھ کہہ رہے ہوں۔ "تم نے بات کو الفاظ کے خلاف میں لپیٹا ہے۔ سسر ہادی! بہر حال آگے کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ہادی نے چائے ختم کرنے کے بعد کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! مجھے پتا نہیں کہ آپ اس بات کو کس انداز سے لے رہے ہیں۔ مگر میں پورے خلوص دل کے ساتھ اس مصیبت میں انکل فیاض کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں۔"

ہادی نے غور سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”عطا صاحب! مجھے ایک بات بتائیں۔ یہ فیاض صاحب کا ذاتی مسئلہ ہے لیکن اس حوالے سے ذہن میں سوال ضرور اٹھتا ہے۔ وہ جس مکان میں رہ رہے ہیں میرے انداز سے کے مطابق پاکستانی کرنسی میں چار ساڑھے چار کروڑ کا تو ضرور ہے۔ کیا اسے بچ کر کسی نسبتاً چھوٹے گھر میں رہنے کا خیال ان کے ذہن میں نہیں آتا۔“

ڈاکٹر عطا نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”در اصل یہ مکان اسکیلے فیاض کا نہیں ہے۔ اس میں پچاس فیصد حصہ فیاض کی بڑی بھانجی کا ہے اور وہ بڑی سخت گیر عورت ہے۔ وہ مکان فروخت کرنے پر رضی نہیں ہو گی۔ جب فیاض نے گھر کو فروغ دیا تھا تب بھی وہ بڑی مشکل سے تیار ہوئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ تب اسے دسٹے داری ہو جانے کی امید تھی۔ اس وقت تک فیاض کے بڑے بھائی بھی زندہ تھے۔“

”رشتے داری سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“

”در اصل فیاض کی بڑی بھانجی خواہش رکھتی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی فیاض کے بیٹے فیصل سے ہو جائے۔ فیاض کے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی شاید فیصل کے لیے۔ لڑکی شہر میں بڑی ہے تو کیا اٹھائیس انتیس سال کی ذلیل ذول کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ کی گنتی ہے۔ فیصل کو تو تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ وہ نوں کا کوئی جوڑی نہیں ہے۔ اس تنازعے کی وجہ سے دونوں گھروں میں کافی کھچاؤ ہے۔“

ہادی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے جناب! یہ بات تو سمجھ میں آ رہی ہے لیکن اب جلال والے جو جائے کیا کیا جائے۔ یہ بات تو اب تقریباً کلیئر ہے کہ جناب اور جلال اسٹے نہیں رہ سکتے۔ جناب علیحدہ ہو جانا چاہتی ہیں لیکن عطا صاحب ہم سب جانتے ہیں کہ وہاں درس والے گھر میں جناب بہت سختی کے دن گزار رہی ہیں۔ جلال انہیں کہہ چکا ہے کہ وہ زیادہ تنگ ہے تو اس سے طلاق لے لے۔ اور یقیناً اب جناب بھی یہی چاہتی ہوں گی۔ مگر انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے بعد ان کے گھر والے سخت مصیبت میں آ جائیں گے۔ بات تو بالکل واضح ہے۔ جناب کو آزادی اس صورت میں مل سکتی ہے جب یہ قرض والا معاملہ ختم ہوگا۔“

”مگر کیسے؟ اہم سوال تو یہی ہے۔“

ہادی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مدسوج لہجے میں بولا۔ ”آپ نے اسی بتایا ہے کہ گجرات میں فیاض صاحب کی کچھ زمین ہے جو وہ بیچنا چاہ رہے ہیں۔ اگر ہم کسی طرح اس کا کوئی گاہک پیدا کر سکیں تو صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔ آپ کا کیا اندازہ ہے۔ کتنے تک بک جائے گی وہ جگہ؟“

ڈاکٹر عطا بولے۔ ”قیمت تو اس کی اتنی پچاسی لاکھ سے کم نہیں ہے۔ مگر فیاض ساتھ ستر تک بھی بیچنے کو تیار ہے۔ مسئلہ تو حقیقی خریدار کا ہے۔“

”عطا صاحب! آپ مجھے چھ سات روز کی مہلت دیں۔ میں اس سلسلے میں کوشش کرتا ہوں۔ آج کل میں جن کے لیے کام کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ رقبہ خریدنے پر آمادہ ہو جائیں یا کسی اور کو آمادہ کر لیں۔“

”وہ بک بھی جائے گی ہادی! تو ہم زیادہ سے زیادہ 2 کروڑ دس بیس لاکھ تک بیچ جائیں گے۔ میرا اندازہ تو

ہی ہے کہ جلال کو اتنی بڑی رقم یکدمشست اور کرنا کافی مشکل کام ہے۔“

”مگر ہم ایک بھر پور کوشش تو کر سکتے ہیں عطا صاحب! آپ... آپ مجھے ایک ہفتے کا ٹائم دیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ کر سکوں گا۔ آپ بھی اپنے طور پر کوششیں جاری رکھیے۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ فنڈ تو فیاض صاحب اور فیصل کے پاس بھی ہوگا۔ ان شاء اللہ کوئی اچھی صورت حال سامنے آئے گی۔ مگر وہی پہلے والی گزارش میں ایک بار پھر آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہ آئے۔“

ڈاکٹر عطا اٹھاتی انداز میں خاموش رہے۔ یہ بات وہ بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ جلال کے گھر میں جناب کے لیے حالات دن بدن دگرگوں ہوتے جا رہے ہیں اور اسے اس صورت حال سے نکالے جانے کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ اسے زبردستی نکالنا بے کار تھا اور اس نے لکھنا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کو مزید مشکلات میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی سلامتی و آسودگی کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو چکی تھی۔ اب ایک فی راستہ تھا اسے اور اس کے والدین کو معاشی ٹکٹے سے نکالا جاتا۔

وہیں ڈاکٹر عطا صاحب کے پاس بیٹھے بیٹھے ہادی نے شیخو صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے چھوٹے ہی کہا۔ ”اوئے بھائی! جانو! تیرے تے ہادی پیارے! ہلا کے رکھ دتا ہے ٹو نے مار کیت کو۔ مزہ آ گیا تیری قسم۔ بس اب جلدی سے ایک اہم میٹنگ اور سب سے (پینک دے) ہوائی ڈاک کے ذریعے کوئی چودہ کے نیزے گانے ہو جائیں۔“

”جلو شیخو بھائی! وہ بھی بہت دینا ہوں۔ پر آپ کو بھی کچھ پیسے اور سٹے پڑیں گے۔ ضرورت آن پڑی ہے۔“

”اوئے کتنے پیسے! مگر فرمائش اتنی ہی کرنا جتنی میری پہلی ہے۔“

”آپ کی پہلی کافی بڑی ہے شیخو بھائی! اور کافی سخت بھی ہے۔“

”اوئے اتنی سخت بھی نہیں ہے۔ پر میں کر لوں گا کچھ نہ کچھ۔ ٹو بس کوئی نئی چیز بھیج دے نافٹ۔ وہ کیا گا نا کھسا کر لے آئے۔ آخری فون کر لیں یا رازداساجی اور سر لیں یا راز۔ بس اسی ٹائپ کی کوئی سپر ہٹ چیز لکھ بھجی ہے۔“

”جو جائے گا شیخو بھائی! اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ گجرات کے علاقے میں زمین کا ایک ٹوٹا ہے۔ مٹی من سب جگہ ہے۔ جلد ہی کسی نہ کسی سکیم میں آ جائے گی سٹے داسوں مل رہی ہے۔ انویسٹمنٹ کر لیں۔ فائدے مگر دین گئے۔“

”یار ہادی! تو شاعر ہی رہ پڑا ہوں! ڈیڑھ نہ بن ب ورنہ مردادے گا کہیں۔“

”شیخو بھائی! شاعر اور زمین کا گہرا تعلق ہے۔ ہر گیت غزل کی ایک زمین ہوتی ہے۔“

”ایک تو یار تو خدایتہ بولا ہے۔ اچھا کس تھاں پر ہے یہ پلاٹ؟“

”یہ میں آپ کو شام کو بتاؤں گا۔ اور تھوڑی بہت ایلو وائس کی رقم بھی اپنے لیے“

”ہلو پھر ٹھیک ہے۔ شام کو بات کریں گے۔“ شیخو بھائی نے کہا۔

شیخو بھائی سے بات ختم کر کے ہادی پاکستان میں اپنے واقعہ پر پہنچی! یار کا نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے اتنا تو بتا دیں۔ امی کا کیا حال ہے۔ کہاں ہیں وہ؟
وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "آئی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ مگر اب بہتر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن میں گھر آ جائیں۔"
"پلیز جلال! مجھے ایک بار ان سے ملا دیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ ایک لفظ زبان سے نہیں نکالوں گی۔ آ..... آپ میرے ساتھ رہیے گا۔ میں بس پانچ منٹ ان کے پاس بیٹھ کر واپس آ جاؤں گی۔"

"ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ تم جہاں آؤ بالکل ٹھیک ہو۔ تمہارے گوشت کی گرمی ذرا ٹھنڈی ہو جائے گی تو پھر بیٹھیں گے۔"

اسے لگا اس کی سانس رک جائے گی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے دروازے کی درز میں سے ہاتھ گزارا اور جلال کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سیاہ رنگ کی چھچھاتی جوتی کو اپنے نازک ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے ایسا نہ کریں جلال! آپ جو نہیں گے میں وہی کروں گی۔ لیکن مجھے یہاں سے نکال لیں جلال۔"

وہ اپنی جگہ تھکا ہوا رہا۔ چہرے پر نرمی کی کوئی رقم نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک استہزایہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "کتنے اتنا زخمین بولا۔" اسی لمحے میں بات کرنا جیسے کیا کرتی تھی۔ تمہارے اندر چنگاری تھی تابعدا کی۔ جو وہ رو کر کہنے لگی۔ "میرے چنگارے مارتی تھی۔ اب چکا ڈانا ہے۔ اب وہ کیوں نہیں بھڑک رہی۔ بتاؤ نا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ریشمی بال مٹھی میں بکڑے اور جھٹکا دے کر اس کا چہرہ اوپر اپنی طرف اٹھا دیا۔ وہ دوتے سے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔ جلال کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کے بالوں کی جڑیں اکھڑنے لگیں۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ "آف جلال مجھے روک رہا ہے۔ پلیز چھوڑ دیں۔"

وہ اور زور سے پکڑتے ہوئے بولا۔ "میرے سوال کا جواب دو۔ اس چنگاری کا ذکر تم نے خود ہی کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ چنگاری تم جیسے ہیں اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ اب کہاں ہے وہ؟"

وہ تکلیف کی سمیت سے نرمی طرح کر رہی تھی۔ اس کی گردن ایک طرف مڑی ہوئی تھی۔ اس کے لرزاں ہاتھ جلال کی کمرے پر تھے۔ جیسے وہ خود کو چھڑانے کی کمروری کوشش کر رہی ہو۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ جواب میں کہے۔ جلال نے ایک لمحہ کا وقت اس کے بال چھوڑ دیئے اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ حجاب نے نوپ کر دروازے کا پٹ تمام لیا۔ "تسے ہندو نہ کرینگے۔ اسے کھلا رہنے دیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔" وہ دل انگار آواز میں بولی۔

جلال ماننے والا کہاں تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ حجاب کا ہاتھ دونوں ہٹ کے درمیان آ گیا۔ وہ پٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ مگر جب جلال نے دباؤ بڑھایا اور اسے اپنی جھلی کی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں تو اس نے تڑپ کر ہاتھ اندر کر لیا۔ اس کی کراہیں دلدہاؤ تھیں۔ وہ ٹھنکی سی ٹھنکی ہوئی تھی۔ پھر حجاب نے اس کی ہانگ اور دروازے کی چمکی درز سے بالکل قریب کر لیا۔ ایسا

حجاب گھر کے نیم تاریک ہسٹ میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر صبح یہ امید بندھتی تھی کہ وہ آج شام تک یہاں سے نکال لی جائے گی اور ہر شام یہ امید ٹوٹ جاتی تھی۔ یہاں اب اسے چھ دن تھا۔ یہ چھ دن چھ برسوں سے کم نہیں تھے۔ اس دوران میں اسے ایک بار بھی جلال کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ باہر کی دنیا سے اس کا واحد راستہ کلوٹوم ہی تھا۔ اب وہ بے بسی کی انتہا کو چھونے لگی تھی۔

یہ چھ دن روز کی شام کی بات ہے۔ حجاب وہیں دروازے کے پاس فرش پر ایک غالیچہ بچھائے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے فاصلے سے گاڑی کا دھم بکڑ سنائی دیا۔ وہ چونک گئی۔ یقیناً یہ جلال کی ہمریپ جلی تھی۔ وہ یہاں آیا تھا۔ ایک دم بے قرار ہو گئی۔ کچھ دیر آنکھ کرکڑی کرکڑی کرکڑی رہی پھر دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ کلوٹوم کو آواز میں دے رہی تھی۔ کلوٹوم تو جیسے بالکل بھری سی ہو چکی تھی۔ اس کی کوئی منت ساجت سنتی ہی نہیں تھی۔
میری بات سن لو۔ صرف ایک بار..... کلوٹوم.....

اس کے ارد گرد وہی سا نا رہا جو آج کل دن رات اس کی جان کھاتا تھا۔ وہ بے چینی اور ڈپریشن کی انتہا پر پہنچ گئی۔ وہ جلال کو آواز میں دینے لگی۔ "جلال..... جلال! میری بات سن لے ایک بار میری بات سنیں۔" ساتھ ساتھ وہ دروازے پر دو تھوڑی ماریں مار رہی تھی۔ اس کے رونے چلانے کی آوازیں ہسٹ کی کھٹکھٹانے والوں میں گونجنے لگیں۔ اور پھر ہسٹ کی سیڑھیوں پر ہماری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ نیچے آ رہا تھا۔ وہ پھر جھٹکا دے کر اپنی رہی۔ دروازے کا لاک کھولا گیا۔ حسب معمول دروازہ چھ سات انچ تک کھلا اور دوسری طرف جلال کی سرور سے ڈھکی چھپی دلی۔ وہ شلواری قیص اور ویسٹ کوٹ میں تھا۔ میٹھ کی طرح سیل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔

وہ بے دم سی ہو کر گر پڑی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ "جلال! مجھے یہاں سے نکالیں۔ مجھے یہاں کیوں بند کر دیا ہے۔ کیوں کر دیا ہے؟" وہ ہلکتی سی آواز میں بولی۔

"اپنے سوال کا جواب ابھی تم نے خود ہی دے دیا ہے۔" جلال پھٹکارا۔ "اس طرح جلاؤ گی تو پھر تمہارے منہ میں کپڑا بھی ٹھونسنے پڑے گا۔"

"میں کچھ نہیں کہوں گی جلال! اپنے ہونٹ ہی لوں گی لیکن پلیز مجھے اس طرح بند نہ کریں۔ میں گھٹ گھٹ کر رہی ہوں۔"

"کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔ میں جانتا ہوں بڑی سخت جان ہو اور اتنی ہی سخت دل بھی ہو۔ تمہارے جیسی عورت بہت کچھ جھیل سکتی ہیں۔"

"میں کیسی عورت ہوں جلال! مجھے بتائیں میں نے کیا کر دیا ہے کیا آپ بھی دنیا کی باتوں میں....."

"بکواس بند کر۔" وہ اتنے زور سے دھماکا دیا کہ دیواریں ہل گئیں۔ "اس بارے میں ایک لفظ منہ سے نہ نکالو۔ جس میں پتا ہے تمہیں پتا ہے مجھ سے یہ جھوٹ برداشت نہیں ہوتا۔"

وہ دم نہ کر رہی ہو گئی۔ دروازے سے سر نکا کر سسکیاں لینے لگی۔ پھر آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر بولی۔

کرنے سے اسے کچھ سکون ملتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ باہر کی روشنی اور ہوا کو محسوس کر رہی ہے۔



درحقیقت ہادی کے سنے گیتوں کے اہم نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ گلوکار بھی نیا تھا۔ موسیقار کے پچھلے ایک دو اہم فلپ گئے تھے۔ اس اہم کی اصل جان ہادی کے لکھے ہوئے بول ہی تھے۔ وہی بول جو اس نے کسی کے لیے لکھے تھے۔ وہ گیت تو خاص طور سے خاص و عام میں مقبول ہو رہا تھا جس میں ونس کی ایک رات کا ذکر تھا اور نہایت تابندہ و چاشنی والی ایک لڑکی کا ذکر تھا۔ جو نہ جانے کہاں سے آئی تھی اور صدیوں کا سفر طے کر کے اس تک پہنچی تھی۔ اور وہ بھی زمانوں سے اس کا انتظار کر رہا تھا اس کی حراغیز سکرہٹ پر گیت لکھ رہا تھا۔ دونوں روشنیوں سے جھللاتے ایک رواں پانی کے کنارے ملے تھے۔ وہ اسے پہچان گیا تھا لیکن وہ اسے نہیں پہچانتی تھی۔ یہ کیسا غم تھا؟ یہ کیسی بے خبری تھی؟

ہادی بول کے کمرے میں تھا۔ آڈیو سسٹم پر سبکی گیت دھیمی آواز میں پلے ہو رہا تھا۔ ہادی کے کاندھات بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں کیلکولیٹر تھا۔ وہ حساب کتاب جوڑ رہا تھا۔ وہ لاہور سے روانہ ہوا تھا تو اس کے بینک اکاؤنٹ میں گیارہ لاکھ کے قریب موجود تھے۔ مگر میں سیدھے سر فٹپلٹس اور بانڈز وغیرہ کی شکل میں بھی بارہ چودہ لاکھ روپیہ رکھا تھا۔ اہم کی مقبولیت کے بعد اس کے بینک اکاؤنٹ میں تیزی سے رقم کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ تین اٹھو کے گیت لکھ چکا تھا۔ پہلا اہم لائی ہو گیا تھا اور معاہدے کے مطابق اس کی رائلٹی کی مدت میں بھی کچھ رقم اس کے اکاؤنٹ میں ترانسفر ہوتی تھی۔ قریب دس لاکھ شیخو صاحب ایڈوانس دینے والے تھے۔ یہ سب مل کر 84 لاکھ کے قریب بن رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہادی کو لگ رہا تھا کہ جو پینتیس پچیس لاکھ روپیہ پاکستان سے آئے تھے۔ ڈیپازٹ ہوا ہے۔ وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ یہ قباب کی امانت ہے۔ اس کی اصل حقدار وہی ہے۔ کیونکہ اس کی ہوتی تو انائی سے اس کی تخلیقی قوت کے بند سوتے کھلے ہیں اور اس کے دیئے ہوئے قلم سے اس نے وہ الفاظ کاغذ پر اتارے ہیں جنہوں نے اس کے لیے آسانوں اور کشائش کے دروازے کھولے ہیں۔

اس نے ساری جمع تفریق کر لی۔ اب اگر وہ لاہور میں اپنی ہنڈا گاڑی فروخت کر دیتا تو وہ 80 لاکھ روپیہ تو قریب پا پورا ہو جاتا تھا جس کا وعدہ اس نے ڈاکٹر عطا سے کیا تھا۔ مگر گاڑی فروخت کرنے سے لاہور میں والدہ اور بھائی کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ وہ ان کو ذرا سی پریشانی بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر گاڑی فروخت نہ ہوتی تو سترہ اٹھارہ لاکھ روپے کم پڑ جاتے۔

اس سے بہتر تو یہی تھا کہ وہ اپنا ایل ڈی اے سکیم والا پلاٹ بیچ دیتا کوئی ایسا گاہک جو پوری رقم یکدمٹ ادا کر دے۔ یوں اسے تیس تیس لاکھ روپے مزید مل جاتے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گاڑی کے بجائے پلاٹ فروخت کر دے گا۔ پتا نہیں یہ کیسا جذبہ تھا۔ ہادی کو اپنا سب کچھ لانا دینے پر آمادہ کر رہا تھا۔ بس اس کے دل میں ایک ہی بات ہوتی تھی۔ قباب کو کسی طرح معاشی شعبے سے آزاد کرانا ہے۔

اس نے فون اٹھایا اور شیخو صاحب کا نمبر پر لیں کیا۔ وہ غائبانہ طور پر کے بھاری بھر کم کھانے کے بعد دو گلاس لیں

ہادی۔ "جیکے تھے اور اب دفتر میں ہی کچھ دیر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔" "پیلو" ان کی پاسدار آواز سنائی دی۔ "کیا بلا شیخو بھائی؟"

"یار! اب بنے گا تو وہی جو تم بتاؤ گے۔ ہم تو تمہارے حکم کے بندے بنے ہوئے ہیں۔"

"نہیں..... میرا مطلب ہے جو تمہارا ایڈوانس مانگا تھا آپ سے؟"

"شہزادے! تمہارا تو نہیں تھا وہ۔ بہر حال میں نے ترانسفر کر دیا ہے تمہارے اکاؤنٹ میں دس لاکھ۔"

"اور وہ جو انو۔ مسٹنٹ کا مشورہ دیا تھا آپ کو؟"

"اے جگر گوشے! تم اس مسکین کو کہیں انو۔ مسٹنٹ کرنے جو گا چھوڑ دے گا تو انو۔ مسٹنٹ کرے گا نا۔"

"چھوڑیں شیخو بھائی! آپ تو اپنا کرنا کار کر جھڑیں تو آٹھ دس لاکھ ٹپک پڑتا ہے۔"

"تو آٹھ دس لاکھ میں تو نہیں ملے گا نا وہ گجرات والا رقبہ۔"

"پلیس کچھ اور ڈال لیں اس میں۔ مجھے لگتا ہے سانحہ پینٹھ تک یہ سوداؤن ہو جائے گا۔ زیادہ نہیں تو بھیجیں

پینٹھ تو آپ خرید میں ہی کمار ہے ہیں۔"

"ہم چھایا؟" شیخو بھائی نے تسلی تسلی آواز میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اب ٹونے یہ وصول میرے گلے میں ڈال

کے گا۔ چھوڑنا ہے۔ مگر مجھے یہ دس کہ تیرے ارادے کیا ہیں۔ اس کڑی کو کھلاق ہو بھی جاتی ہے اور وہ اپنے ماں پو

کے کٹر آگئی جاتی ہے تو پھر کیا ہوگا۔ کیا وہ دیاہ شیاہ کرے گی تھہ سے۔"

ہادی نے ایک گہری سانس لی۔ "شیخو بھائی! سب کچھ دیاہ شیاہ ہی تو نہیں ہوتا۔ میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا

قباب کے سلسلے میں میرے دل پر بہت بھاری بوجھ ہے۔ میں اس کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی عشق و عشق کوئی نہیں ہے تجھے۔" شیخو بھائی نے ذرا طنز پر انداز میں کہا۔

"وہ تو جو ہے..... سو ہے۔ لیکن اس کے لیے دیاہ شیاہ اور شادی وادی ضروری نہیں ہوتی شیخو بھائی۔ پر آپ

تم نے کیے ہوڑی سینہ۔ آپ کو یہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

شیخو بھائی نے ہلکی سانس لی۔ "آہو یار! اگر یہ گل سمجھ میں آتی ہوتی تو خود ہی آٹھ دس سطریں لکھ کر دی ہزار

گاہک وصول نہ کر لیتا۔"

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ نے لسی پی ہے۔ کیونکہ لسی پی کری آپ ایسی باتیں کرتے ہیں۔" ہادی نے

ہلکے پست انداز میں تبصرہ کیا۔

"اچھا چل چھوڑو اس گل کو نہیں جو کچھ بھی کر سکتے ہو ہاتھ پیر بچا کر کرنا۔ میں پھر کہہ رہا ہوں۔ یہ اٹلی ہے۔

مسٹر براؤن کو بھی ہوتے ہیں یہاں۔ ہاشم ایک حد تک ہی تمہارا ساتھ دے سکتا ہے۔"



دروازے میں آنے کے بعد قباب کا ہاتھ نیلا ہو گیا تھا اور کچھ سوچ بھی گیا تھا۔ لیکن جسمانی چیزوں کے بجائے

میں زیادہ تکلیف اس کے دل و دماغ میں تھی۔ وہ جو کچھ سن رہی تھی، جو کچھ کہہ رہی تھی وہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ

کٹھن عتب میں کھڑی تھی۔ جلال کے کہنے پر وہ الماری میں سے فرسٹ اینڈ کا باکس نکال لائی۔ جلال نے اس کے ہاتھ پر آؤڈیکس ٹاپ کی کوئی آئینٹ لگائی اور روٹی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ اس عمل کے دوران میں وہ دروازے پر اتنی رہی مگر جلال جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ "اب اسے لٹکا کر نہ رکھتا۔" وہ بولا۔

"پورے بازو میں درد ہو رہا ہے۔" وہ سسکی۔

اس نے باکس میں سے ڈنکھارون کا چین کلر انجکشن نکالا اور حجاب کے بازو میں ٹھونک دیا۔

کٹھن باہر جا چکی تھی۔ وہ روٹیاں آواز میں بولی۔ "جلال! پلیز میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی، نہ ہی میں نے پہلے کیا ہے۔ شریٹاں والا فون میں نے صرف اس لیے اپنے پاس رکھ رکھا کہ..."

"اس پر اس شاعر صاحب کی کال آئے گی۔" وہ بات کاٹ کر پھٹکا۔

"نہیں جلال۔ نہیں۔ وہ بلکہ مجھے ڈر تھا کہ ایسا ہوگا۔ اس کے پاس شریٹاں کا نمبر تھا۔ میں قسم کھاتی ہوں جلال۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود آگے نہ بول سکی۔ اور کٹھنوں میں سر دے کر بچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بستر پر بیٹھی تھی۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس نے التجا آمیز انداز میں اس کا کندھا تھامنا چاہا۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "منہ سے بولو، کیا چاہتی ہو تم؟"

وہ اپنے اندر کی ساری حاجت اپنے لفظوں میں سمیٹ کر بولی۔ "جلال! آپ کو پتا ہے مجھے بند بچوں سے کتنا ڈر آتا ہے۔ میں یہاں گھٹ گھٹ کر رہی ہوں۔ مہ... مجھے کہیں بھی لے جائیں لیکن اس کمرے سے اب نکال لیں۔" "یعنی میں غالم ہوں۔ میں نے تمہیں یہ گناہ یہاں بند کیا ہوا ہے، جس بے جا میں رکھا ہوا ہے تمہیں۔ ٹھیک رہے ٹھیک ہے۔ مجھے بھی اب احساس ہو رہا ہے کہ شاید میں زیادتی کر رہا ہوں تم سے۔ مجھے اس کی عافی کرنی چاہیے۔ بلکہ عافی مانگ کر ملانی کرنی چاہیے۔ تاؤ کتنی طرح معافی مانگوں تم سے۔ تاؤ۔"

"آپ ایسا مت کہیں۔ آپ شوہر ہیں میرے۔ میرے مجازی خدا کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"مت استعمال کرو ایسے الفاظ۔ یہ مقدس لفظ تمہارے منہ میں آکر بد چلنی کا طعنہ بن جاتے ہیں۔ میں تمہارے لیے جو کر سکتا ہوں میں وہ کر دیتا ہوں۔ تمہیں اس قلم سے نجات دے دیتا ہوں۔ اگر جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے تمہارے سامنے۔"

حجاب حیرت زدہ سی کھڑی ہو گئی۔ وہ جلال کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ ہو۔ وہ اس کا لبہ دلچسپانہ کی کوشش کر رہی تھی۔ سسک کر بولی۔ "میں پوری سے پیڑی قسم کھا سکتی ہوں جلال! میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔ اگر کروں تو بے شک میری جان بے نیکی ہو جائے گی۔"

"وہ تو بعد کی بات ہے۔ لیکن میری ایک بات ابھی اچھی طرح سن لو۔ جس وقت تم اس دروازے سے باہر نکلو گی۔ جس اسی وقت تمہاری طلاق کے کاغذوں پر دستخط کروں گا۔ اسی وقت ہائل آزاد کروں گا تمہیں۔"

آزادے سے نعرے اس کی سماعت میں گونجتے رہتے تھے جن میں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اور جھوٹ جھلی میں بہت سے لوگوں کی زبان پر تھے۔ اس کی پرانی دوستی ہے ہادی سے، یہ انٹرنیٹ پر اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتی تھی۔ وہ اس سے ملنے ہی اٹلی آیا تھا۔ یہ اس کے ساتھ ہوٹلوں میں وقت گزارتی رہی ہے۔ حجاب کو کتنی ہی کہ اس کے کانوں میں دھبے انگارے ٹھونسے جا رہے ہیں۔

اس کے ارد گرد مٹا ہر جیسے ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ بس تقریباً بارہ فٹ ضرب چودہ فٹ کا ایک کمرہ، ایک انچ ہاتھ روم، ہاتھ والی دیوار کے ساتھ ایک آف وائٹ الماری اور الماری کے ساتھ ڈبل بیڈ۔ خاکستری رنگ کا ایک قد آدم ریفریجریٹر اور شیشے کی ایک میٹیل کھڑکی۔ یہ چیزیں دیکھ دیکھ کر اب اسے ابکا ہی آئے تھے لیکن دیواریں اور ان کے رنگ کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ وہ اندھیرے سے گھبراتی تو بلب آن کر لیتی۔ بلب کی مدد سے وہ کچھ دیکھ سکتی تھیں۔

پھر اندھیرا کر لیتی۔ اس نے قید خانہ کی اذیت سے باز رہے ہیں بہت سنا تھا۔ مگر اس کا تجربہ زندگی میں پہلی بار تھا۔ بے بسی کی انتہا کو چھو کر وہ سوچنے لگتی۔ کیا کوئی اس کے لیے کچھ کرے گا؟ کیا کوئی ایسی بات ہو جائے گی کہ جلال کے دل میں اس کے لیے اور اس کے بیمار والدین کے لیے نرم آجائے۔ کبھی بھی اس کے ذہن میں ہادی کا خیال آتا اور اس کے اندر غم و غصے کی لہر بلند ہوتی۔ دانستہ یا نادانستہ اس شخص نے بہت دیا اور نقصان پہنچایا تھا اس کی زندگی کو۔

رات بھر حجاب کے ہاتھ میں درد ہوتا رہا۔ صبح تک وہ زیادہ سوچ گیا۔ حسب معمول تو بچے کے قریب دروازہ کھولا۔ چھ سات انچ کی درز پیدا ہوئی اور کٹھن نے سالن اور چائے پر مشتمل روکھا سوکھا ناشتہ کھانا کھایا۔ حجاب کراہتے ہوئے بولی۔ "کٹھن مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ کہیں ہڈی کو کچھ نہ ہو گیا ہو۔ پلیز جلال کو بلا دو۔ وہ دیکھ لے گا۔" "وہ چلے گئے ہیں۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔

اسی دوران میں حجاب کو کھانسی کی دور افتادہ آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی بالائی کمرے سے آئی تھی اور یقیناً جلال ہی کی تھی۔

وہ دروازے کے خلا سے منہ لگا کر پکارنے لگی۔ "جلال۔ جلال۔ میری بات سن لیں۔"

اس کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ کٹھن نے جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ حجاب نے اپنا چہرہ بمشکل چھپا دیا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد بھی وہ پکارتی رہی اور دستک دیتی رہی۔ چند منٹ بعد دروازے سے باہر پھر آئیں۔ دروازہ کھلا اور دوسری طرف جلال کی صورت نظر آئی۔ اس بار وہ دروازہ پورا کھول کر اندر آ گیا۔ "کیا قیامت عمارت کی ہے تم نے۔" اس نے پوچھا۔

وہ اپنے مضروب ہاتھ کو تھامے ہوئے بولی۔ "جلال! مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ رات بھر ہوتا رہا ہے۔ کہیں کوئی فریکچر نہ ہو گیا ہو۔"

اس نے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ حجاب کو اٹھایا بلانے کا کہا۔ اٹھکیاں حرکت کر رہی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر چھلکا سا ہاؤ ڈال کر چیک کیا۔ وہ بری طرح کراہنے لگی۔ "کچھ نہیں ہوا۔" وہ اس بات آواز میں بولا۔ "بس ذرا اب آئی ہے۔"

یلا یک حجاب کے سینے میں امید کے سارے چراغ تیز ہوا کے جھونکے سے بجھ گئے۔ ایک سر دلہر بڑھ کی ہڈی سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ طلاق لینے اور دینے والی بات ان کے درمیان پہلے بھی ہو چکی تھی اور جس میں منظر میں ہوئی تھی وہ بھی حجاب کو معلوم تھا۔ بات اب طلاق کی نہیں تھی۔ بات تو اس معاشی تختے کی تھی جو جلال نے اس پر کس رکھا تھا اور اس کے والدین پر بھی۔ وہ طلاق کی بات کر رہا تھا تو ساتھ ہی اس "معاشی تختے" کو بے دخل کرنے کی بات بھی کر رہا تھا اس کے والدین کی سانس روک سکتا تھا۔ وہی بھاری بھر کم قرضہ جسے جلال ایک مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ کوئی بھی وقت اس قرضے کے ضمن میں اس کے بوڑھے والد اور جواس سال بھائی کو عدالتوں میں تھسیت سکتا تھا اور وہ اس تھسیت کو جھیلنے کی سکت ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

ڈاکٹر عطا ہادی کے ساتھ پورا تعاون کر رہے تھے۔ انہیں بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ حجاب کو جلال کے چنگل سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ سب سے پہلے اس کا قرض چکا یا جائے اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر جلال کو "بلیک میل" کی بہترین پوزیشن میں رہنا تھا اور وہ اس پوزیشن کو کامیابی سے استعمال بھی کر رہا تھا۔

بان نے سر دھڑکی بازی لگا رکھی تھی۔ اسکیم میں اس کا پلاٹ آٹا فائنا فروخت ہو گیا تھا اور وہ بھی کیش پر۔ یہ ایک 20 لاکھ میں بکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ عطا صاحب کو نوٹل 80 کے بجائے تقریباً 90 لاکھ فراہم کر سکتا تھا۔ ہائی سب کچھ ٹھیک ہو جاتا تو صرف ایک کروڑ دس پندرہ لاکھ کی کمی رہ جاتی تھی۔ یعنی تقریباً ایک لاکھ سات ہزار لاکھ۔ بان کو امید تھی کہ یہ کام بھی کسی نہ کسی طرح ہو جائے گا۔ اس کے سینے میں دبا دبا جوش لہریں لے رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ حجاب کی خوبصورت کامیابیوں میں پڑی ہوئی زنجیروں کو نوٹ کر نیچے گرتے دیکھ رہا ہے۔ ان زنجیروں کے گرتے ہی اس کی بے مثال شہنائی کا چاند روشن ہونے لگا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا سونا چمکنے لگا ہے۔ سب بچہ ہو جاتا تو یہ جلال کی اس جارحیت کا موثر جواب تھا جو اس نے ہادی کے خلاف اسلامک سینٹر کے ضمن میں کرنا تھا۔

ایک دو دن یہ کیفیت رہی۔ لیکن پھر ایک ایسی صورت حال تبدیل ہونے لگی۔ ہادی اور ڈاکٹر عطا نے جو بھی جمع فرق کی تھی اس میں دینے پڑنے لگے۔ سب سے پہلی ناامیدی تو حجاب کے ایو کی طرف سے ہی سامنے آئی۔ نفل نے ڈاکٹر عطا کو بتایا کہ اس وقت وہ کمر جی دست ہیں۔ اس تک دو دو میں لگے ہوئے ہیں کہ اگر ایک دو دن حجاب کی امی کو ہسپتال سے فارغ کر دیا جاتا ہے تو ہسپتال کا دوڑ حائی ہزار یورو کا بل ادا کیا جاسکے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فی الحال قرض کی ادائیگی میں مزید کوئی گرفتار دانتیں کر سکتے۔ دوسری پامپس کن خبر شیٹو صاحب کی طرف سے آئی۔

ہادی ہوٹل میں تھا۔ اپنے کمرے کی کمر کی کھولے بیٹھا تھا اور روم کی رواں دواں ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ اس ایک میں سکورز کی بھرمار تھی۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے سکورز ہاٹاں نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں بغیر ٹکٹ کے کاریں بھی تھیں۔ وٹس میں ایسی ہی ایک اوپن کار کے پیش منظر میں ہادی نے حجاب کو پہلی بار دیکھا تھا۔

"جاء..... اب جاتی کیوں نہیں؟ کیا سبھی رچی ہوئی؟" جلال کی پھکار اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ "پلیز جلال!" اس نے روتے ہوئے دوبارہ جلال کا ہاتھ کھدکھاتا مانا چاہا۔ اس نے دھکا دے کر اسے پیٹک دیا۔ دانت چیس کر ہوا۔ "میں جانتا ہوں کیوں جانا چاہتی ہے تو باہر۔ کیوں کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے؟" چڑھے ہوئے ہیں تجھے۔ سب جانتا ہوں وہ حرامزادہ ابھی نہیں ہے۔ انہی گلیوں میں گھوم رہا ہے آوارہ کتے کی طرح لیکن..... لیکن اب میں تجھے منع نہیں کروں گا۔ جانا چاہتی ہے تو چلی جا۔ دروازہ پورا کھلا ہے تیرے سامنے۔ چلی جا اگر جانا ہے تو۔"

وہ بستر پر اندھی پڑی ہتھکڑیوں سے روتی رہی۔ اس کا جسم بالکل بے جان ہو گیا تھا۔ دروازے کی طرف جانا تو کجا دروازے کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی اس میں نہیں رہی تھی۔ اپنی ماں کا بیمار لاچار چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ جلال کچھ دیر ٹائٹس چوڑی کر کے کھڑا رہا اور اس کے رومل کا انتظار کرتا رہا۔ "اب جاتی کیوں؟" دو دو چٹکھڑا۔

ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ پھر اس پر ہل پڑے گا اور اس کو ادھیر کر رکھ دے گا لیکن پھر شاید اسے اس کے ڈھی ہاتھ کا خیال آ گیا۔ کوئی باریک سا فریکر ہڈی ٹوٹنے کا بہانہ بھی بن سکتا تھا۔ اس نے اس بیڈ کو زوردار لات رسید کی جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ پھر کسی گولے کی طرح پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اسے اور اس کے والدین کو بے نقط سنائیں تھیں۔ چند سیکنڈ بعد کلثوم نے غصیلے انداز میں دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اور حسب معمول لاک لگا دیا۔ ایک دہم حجاب کا سارا جسم سرد ہو گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی ٹھنڈی خمار قبر میں اترتی جا رہی ہے۔ اپنی امی کا چہرہ اس کے قصہ میں آیا، پھر ابو کا، پھر بھائی فیصل کا۔ کہاں ہیں وہ سب؟ کیا وہ اسے دوبارہ زندہ دیکھ سکیں گے؟ اس نے سوچا۔



دہائی ہے اور کلثوم یاوڑے بھائی جان کو بلاتی ہے۔ کہیں آ لے دو الے سے دروازہ کھڑکانے کی آوازیں بھی بار بار آتی ہیں۔ صاحب پتا چلتا ہے کہ وہ کمراس ماری کسی وڈی مصیبت میں ہے۔ میں نے بہت بچھا ہے پر عثمان نے گل کھل کر میں بتائی ہے۔ "شریٹاں کی آواز پھر بھرا گئی۔"

"تم آج کل کہاں ہو؟"

"میں فیرونس گھروچ ہی ہوں۔ آپا خانم اور ارم بی بی کو بڑا غصہ ہے مجھ پر۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ لوگ مجھے جھٹی ہی پاکستان واپس بھیج دیں گے۔" کلثوم آواز میں بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ "ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے میں نے ادھر والے کمرے میں وڈے بھائی جان (جلال) کو باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ درس ہائے گھر سے اس خبیث کلثوم کا فون تھا۔ وہ کسی کی بے ہوشی کی گل کر رہی تھی۔ میں نے ذرا کن اکا کر سنا تو پتا چلا کہ اپنی جناب کے بے ہوش ہونے کی گل ہے۔ اس کے بعد وڈے بھائی جان فائنٹ تھلے گئے اور عثمان کو کہیں بھیجا۔ شاید درس والے گھر ہی بھیجا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے۔ باجی و چاری ذمہ داری مصیبت میں ہے۔" شریٹاں کا گلارندھ اور ایک بار پھر چپ ہو گئی۔ اس کے سنسنے کی آواز ہادی نے صاف سنی۔

"شریٹاں! اتہار کیا مشورہ ہے۔ مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟"

"میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتی ہوں جی! میری کیا حیثیت ہے۔ اگر آپ ہو رہے ہیں کر سکتے تو کم از کم باجی کے گھر والوں تک بھی کسی طرح پہنچے سے یہ گل پہنچا دیں۔ ان کے خاندان میں بھی سیانے لوگ ہوں گے۔"

"اچھا شریٹاں! تم دو گھنٹہ گھر پر تم نے بڑا اچھا کیا ہے کہ مجھے فون کیا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ کچھ بہتری ہوگا۔"

"بس جی! مجھ و چاری کا نام کہیں نہ لکھا آئے۔ درنہ بے موت مر جاؤں گی میں۔ اب بھی آپ کو درس ہے کہ کتنی مشکل سے یہ فون کر رہی ہوں۔"

"تم بے فکر ہو شریٹاں! کوئی حرف نہیں آئے گا تم پر۔" ہادی نے تسلی بخشی کی دو چار باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔

اس کا دماغ کھول اٹھا تھا۔ جو کچھ ہادی اور ڈاکٹر عطا نے سوچا تھا اس کو عملی شکل دینے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ ابھی کافی بڑی رقم پر رہی تھی۔ دوسری طرف یوں لگ رہا تھا کہ جناب کے پاس واقعی ٹائم کم رہ گیا ہے۔ وہ شاید جسٹنی اور ذہنی اذیت جھیل رہی تھی۔ جلال کا لہا اس سے اگلے پچھلے بدلے چکانے کے موڈ میں تھا اور اپنے غم میں اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

ہادی نے اسی وقت کمرہ بند کیا اور ٹیکسی پکڑ کر ڈاکٹر عطا کے پاس پہنچا۔ وہ گھر ہی میں تھے اور کھانے کے بعد جھل قدمی کر رہے تھے۔ ہادی نے پہلے تو انہیں گھبرات والے پلاٹ کے بارے میں آگاہ کیا اور بتایا کہ اس کا فوری طبع پر کن مشکل نظر آ رہا ہے۔ تب اس نے شریٹاں کا نام لیے بغیر درس لگائے گھر میں جناب کی حالت زار سے عطا صاحب کو آگاہ کیا۔

اچانک اس کے فون کی تیل ہوئی۔ دوسری طرف لاہور سے شہو صاحب تھے۔ پڑ مردہ آواز میں بولے۔ "ہادی۔ کل وہ گجرات والا پلاٹ دیکھ لیا ہے میں نے۔ وہ تو بالکل پیسے رو ہڑنے (بہانے) والی گل ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! وہ تو کوئی چارہ فٹ ڈونگی زمین ہے۔ کئی لکھ کی تو بھرتی ہی پڑ جاتی ہے اس میں۔ اور اب ایک مسئلہ بھی ہو گیا ہے اس کے ساتھ۔ وہاں سے سڑک نکلنے والی ہے۔ اگر واقعی سڑک نکل گئی تو ادھر سے زیادہ پلاٹ تو سڑک میں ہی آ جاتا ہے۔"

"شینو بھائی! اگر سڑک بھی تو نکلے گی تو کمرے کا گانا پھر۔"

"نہیں یار!" شینو بھائی نے بات کاٹی۔ "مگر اول بالکل نہیں مان رہا اس سودے پر۔ گھر کو کونے دیے ہی چھو دی لکھ مزید انڈوانس میں لینے ہیں تو میں کوشش کر سکتے ہیں۔"

"پندرہ وی سے کیا بے گاشینو بھائی؟"

"تو پھر یار! تھوڑا سادیت کر لے۔ اس دے تو بالکل نہیں ہو سکتا ہوں میں۔ جی کہتا ہوں۔ تجھ سے کبھی مجھ سے نہیں بولا میں نے۔" شینو بھائی واقعی پریشان لگ رہے تھے۔

شینو بھائی سے بات کرنے کے بعد ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ خوشی کی وہ لہر جو مجھے دو تین روز سے اس کے چے میں دوڑ رہی تھی ایک مایوس فضا میں بدلنے لگی۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ کبھی کبھی معاشی معاملات پیچیدہ اور ناقابل حل ہو جاتے ہیں۔ اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو اب بھی مطلوبہ رقم سے کم ہونے کے لیے قریباً پونے دو کروڑ روپے کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت فوری طور پر پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسی دوران میں ہادی کے فون کی تیل ہوئی۔ یہ تیل اس کے پہلے والے پرانے نمبر پر ہوئی تھی۔ اندازہ ہوا کہ کسی بی بی او سے کال کی جا رہی ہے۔ ہادی نے کال ریسیو کی مگر احتیاطاً بولا کچھ نہیں۔ دوسری طرف بھی خاموشی رہی۔ کبھی بھاری سانسوں کی آواز آ رہی تھی اور ٹریفک کا مدھم شور تھا۔ تب شریٹاں کی ڈری ڈری آواز ابھری۔

"ہیلو۔"

"ہیلو شریٹاں! ہادی نے کہا۔"

"خیریت ہے تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"خیریت کتنے ہے صیب جی! آپ نے خیریت رہنے ہی نہیں دی ہے۔ صیب جی! برا ماننا آپ نے چکا نہیں کیا ہے باجی کے ساتھ۔ وہ تو پہلے ہی دکھوں کی ماری تھی۔ آپ کی وجہ سے وہ بالکل ہی زل گئی ہے۔ میں کیا بتاؤں آپ کو اس گھر میں اس دے نال کیا ہو رہا ہے۔ مینوں نہیں لگتا کہ وہ اس گھر وچوں زندہ لکے گی۔" شریٹاں کی آواز بھرا گئی۔ وہ شاید رو پڑی تھی۔

ہادی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ "اب کیا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پرسوں مجھ کو ذرا ریورٹن نے تھوڑا سا بتایا تھا وہ کہتا ہے کہ کدی کدی رات کو باجی کی آوازیں آتی ہیں۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“ ہاشم نے انگلیش میں پوچھا۔

”کیا ہم پریوینٹو کو فالو کیے بغیر جلال الدین پر کسی طرح کا دباؤ ڈال سکتے ہیں؟ اور اسے آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ جواب کو اس طرح جس بے جا میں نہ رکھے؟“

ہاشم ایرک نے ایک طویل سانس لی اور امریکن اسٹائل میں بولا۔ ”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ آپ قانون کا راستہ اس لیے اختیار نہیں کر رہے کہ آپ کو ذرے جواب آپ لوگوں کے حق میں بیان نہیں دے گی۔“

”جی ہاں..... اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے والدین کو ایک بڑی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ پھر مزید بدنامی کا ریسک بھی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ طریقہ کار سے ہٹ کر بھی جواب کی بہتری کے لیے کچھ کیا جاسکتا ہے۔ مگر جس شخص کا آپ نام لے رہے ہیں۔ اس کے خلاف کچھ کرنے سے پہلے آپ کو دس دفعہ سوچنا پڑے گا۔ یہ وہی جلال الدین ہے جو جلال شاہک سینئر کا اوزر ہے۔“

”جی ہاں.....“

”میرا بار بار سوچ شخص ہے مسٹر ہادی! آپ اس کو کبھی بھی آسان نہیں لے سکتے۔ میرا فیئر ”ہاپ انسپکٹر“ ڈولڈ ہوا اس کا گھر آگ لگ گیا ہے اور اس کے علاوہ بھی روم کی پولیس میں اس کے کافی لٹکس ہیں بلکہ محاف کرنا میں آپ کو دیکھ کر ناخوش کیا تھا۔ آپ قانونی طریقہ اختیار کر کے بھی اتنی جلدی خاتون کو جلال الدین کی کھڑی سے نہیں نکال سکتے۔ وہ اس کی بھی سخت عزائم کرے گا اور وہ کر سکتا ہے۔“

ہاشم ایک دھچک آفیسر تھا لیکن آج اس کی باتیں ہادی کا حوصلہ توڑ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی جلال کا قد کاٹھ بڑھ گیا اور بڑا لگنے لگا تھا۔

ہاشم کی باتیں سن کر وہ سخت بے چین ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بے بسی سے سب کچھ دیکھتے رہیں گے۔ ان کو شوشل میں لگے رہیں گے کہ جواب کے گھر والوں کو قرضے کے بوجھ سے نکالا جائے اور اس دوران میں جواب کے ساتھ چومگی ہو جائے گا یا وہ اپنے ساتھ کچھ بھی کرا لے گی۔

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا۔“ اس کے دل میں سے کسی نے پکار کر کہا۔ ”میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ وہ میری رگ جان میں بیٹھ گئی ہے۔ مجھے اپنے بدن سے اور اپنے سانسوں سے اس کی خوشبو آتی ہے۔ میں صد ہاں سے ڈھونڈ رہا ہوں اسے۔ اس کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اسے یوں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے کانوں میں صدا کو بجھنے لگی۔ گنگ لائی..... سوچے گنگ لائی۔“

اور وہ سوچنے لگا۔ لیکن یعنی محبت میں سب کچھ چلتا ہوتا ہے۔ اس نے وہیں جڑے کے اٹالین صوفے پر بیٹھ جیسے اور سامنے دیوار پر آویزاں کسی قدیم فرنیچر ڈاکٹر کی تصویر دیکھنے لگے۔ ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ اہم اور فوری۔ اس کے پاس تپ کا ایک پتا تھا اور یہ پتا ارم تھی۔ مسز ارم جلال۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جواب کو جلال کے چنگل سے نکالنے کے لیے یہ پتا استعمال کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

وہ بھی ایک دم کم سم نظر آنے لگے۔ ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ انگلی فیاض کے گھرانے سے ان کے رشتہ دار تھے۔ گھر سے تھے کہ وہ ان کے ذمہ کو اپنے ذمہ کی طرح سمجھتے تھے اور محسوس کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے ہادی کو اعتماد ہوا کہ جو کچھ سامنے آ رہا تھا اس کے اندیشے عطا صاحب کے ذہن میں پہلے سے موجود تھے۔

ہادی اب راستہ قائم پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ سارے اندیشے ایک طرف رکھے۔ ڈپٹی انسپکٹر ہاشم ایرک کو اپنے ساتھ لے اور دندنا تا ہوا درس والے گھر میں کھس جائے۔ جواب کو اس بھڑکے سے نکال لائے جہاں وہ پھر پھر انڈی تھی اور ڈی ہو رہی تھی۔

اس نے ڈاکٹر عطا سے کہا۔ ”عطا صاحب! اگر اس گھر میں جواب واقعی جس بے جا میں ہیں اور ان پر تصدیق ہے تو ہم پولیس کی مدد لے سکتے ہیں۔“

”لیکن اس کے لیے تو باقاعدہ پولیس میں رپورٹ کرنا پڑے گی اور باقی سارا پریوینٹو کرنا ہوگا۔“

”کیا فیاض اور فیصل وغیرہ اس حد تک جانا چاہتے ہیں یا نہیں؟“

”آپ کا کیا خیال ہے۔ انہیں اس میں کیا اعتراض ہوگا۔“

”سب سے پہلے تو یہی بدنامی والی بات ہے۔ ایک دم ہر طرف بھٹکا ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک بار قانونی چکر شروع ہو جائے تو آسانی سے زکنا نہیں۔ بہت کچھ سبوتا اور جھیلنا پڑے گا۔ خاص طور سے فی میل کو۔“

”لیکن وہ اب بھی تو جمیل رہی ہے عطا صاحب! بلکہ جیسے جیسے اس کی جان بھی جانتی ہے۔“

فیروز الدین کا کیا بگڑا تھا جواب جلال الدین کا بگڑ جائے گا۔ ویسے..... میرے ذہن میں ایک اور بات تھی۔

”ہادی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر عطا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

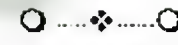
”میں جن کے لیے لکھ رہا ہوں۔ ان کے ایک جاننے والے ہیں یہاں روم کے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں۔ ڈپٹی انسپکٹر ہیں۔ کیونکہ ان سے مشورہ کر لیا جائے۔ ان سے آف دی ریکارڈ ہر بات کی جاسکتی ہے اور وہ طریقہ کار سے ہٹ کر بھی ہمارے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔“

”اگر مجھ سے کا بندہ ہے تو پھر بات کر کے دیکھ لو۔“

ہادی نے ہاشم ایرک کا نمبر ملایا۔ کال فوراً ریسیو ہو گئی۔ ڈاکٹر عطا کمرے سے باہر چلے گئے تاکہ ہادی تسلی سے بات کر سکے۔ ہادی نے سب سے پہلے پوچھا کہ کیا اس طرح فون پر ایک اہم بات کرنا مناسب رہے گی؟

ہاشم ایرک نے کہا۔ ”ہاں..... یہ بالکل محفوظ ہے۔ آپ کھل کر بات کریں۔“

اگلے چار پانچ منٹ میں ہادی نے مختصر الفاظ میں جواب اور جلال والی ساری صورت حال ہاشم کے سامنے بیان کر دی اور یہ بھی بتایا کہ جواب کی والدہ سخت بیمار ہیں جس کی وجہ سے جواب بہت تکلیف میں ہونے کے باوجود جلال سے کسی طرح Clash نہیں چاہتی اور مسلسل اس کا جبر سہ رہی ہے۔



مانے کسی طرح کا کوئی اعتراف کر لیا تو پھر ایک پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ اپنے اطالوی دوست اسٹیل کے ساتھ اس کا جو معاملہ چلا تھا وہ سارے کا سارا آشکار ہو گا۔ اور بہت سے ڈھکے چھپے گوشے بھی عیاں ہوں گے۔ کوئی ایک ماہ پہلے اسٹیل امریکہ کی ریاست فلوریڈا میں ایک ٹریفک حادثے میں زخمی ہوا اور پھر چل بسا تھا لیکن وہ جو کہانی اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا وہ تو اپنی جگہ موجود تھی۔

دو دو بارہ بستر پر آکر لیٹ گئی۔ یہ بستر بڑی کوشش سے حاصل کیا تھا اس نے لیکن اب یہ کانٹوں کا بستر بنا ہوا تھا۔ دوسرے دن بھی وہ اس سے کیا چاہ رہا ہے۔ اس کے دل میں یقیناً نفرت بھری ہوئی تھی۔ کہیں وہ اسے ٹریپ کر کے نہیں اور لے جانے کی کوشش تو نہیں کرے گا۔ اس پر وہ اپنی اور جسمانی تشدد کرنے کے لیے؟ لیکن وہ اس ٹاپ کا لگا نہیں تھا اور شاید ایک پرانے دیس میں وہ اس طرح کا حوصلہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تو کیا وہ اس سے کسی بڑی رقم کا مطالبہ کرے گا۔ دو تین ہزار یورو کی بات تو اور تھی لیکن کوئی بیماری رقم وہ اسے دینے کے قابل نہیں تھی۔ ابھی گھر کے مالی معاملات پر اسے کوئی کنٹرول حاصل نہیں تھا۔ اور شاید ہونا بھی نہیں تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ جلال بہت مالدار بننے کے باوجود بنیاد نہایت رکھتا ہے۔ اس کی کفایت شعاری کبھی کبھو کی حدوں سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔ گھر میں کوئی فائٹ لائٹ آن ہونے کی صورت میں یا ٹوٹی کھلی ہونے کی صورت میں بھی وہ قیامت برپا کر سکتا تھا۔ اس نے نکاح پر جو چوری وغیرہ ارم کو دی تھی وہ اس کی نظر اور تحویل میں رہتی تھی۔ غرضیکہ وہ مرضی سے لاکھوں خرچ تو کر رہا تھا مگر مرضی کے بغیر ایک روپے کا ادھر ادھر ہونا بھی اسے قبول نہیں تھا۔ وہ سوچتی رہی اور اُلجھتی رہی۔



”میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔“ بادی نے پڑٹیش لہجے میں کہا۔ ”بات بالکل کلیئر ہے۔ تم کل رات یہ بات یہ کام کرو گی۔ یا پھر میں وہ سب کچھ کروں گا جو کر سکتا ہوں۔ کوئی تیسرا آپشن ہے ہی نہیں۔ تمہارے لیے نہ کوئی چارٹ ہے۔“ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ میرے ساتھ چل پڑے گی۔ وہ کوئی نہ کوئی نکتہ اٹھائے گی۔ میں جانتی ہوں اسے۔ ”ارم مجھے مجھے لہجے میں بولی۔

”کوئی نکتہ نہیں اٹھاؤ گی۔ وہ دو دو ہفتے سے بند ہیں وہاں۔ باہر نکلنے کے لیے رو چلا رہی ہیں۔ سورج کی روشنی دیکھ رہی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیمار ہیں۔ تم نے ان کی بیماری کو ہی بہانہ بنانا ہے۔ جب تم ہمدردی کے دو بول بولوں کی اور گہوگی کہ تم انہیں ڈاکٹر کو دکھانا چاہتی ہو تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ وہ نہ چل پڑیں۔“

”وہ کہے گی کہ جلال سے میری بات کراؤ فون پر۔“

”تم کہنا کہ مجھے جلال ہی نے بھیجا ہے۔ ابھی اس کا موبائل آتا اچھا نہیں کہ فون پر بات کر سکے۔“

”مجھے۔ ڈرنگ رہا ہے۔“ وہ ماتھے پر تیرہری ڈال کر بولی۔

”تم تو اب ملکہ عالیہ ہو۔ تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بااوشاہ سلامت دو روز کے لیے راجدھانی سے باہر ہیں۔ ملازم اور گارڈز وغیرہ میں اتنی جرأت نہیں کہ تمہیں روک سکیں۔ تم جتنی آسانی سے اندر جاؤ گی اتنی ہی

ارم اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔ آج کل سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق جا رہا تھا۔ جناب زیر مخاب تھی۔ خانم اس کے قہید سے پڑھ رہی تھیں۔ جلال دن بد دن اس کی منگی میں آتا جا رہا تھا اور شریقاں کو وہ جی بھر کر ڈیل کر رہی تھی۔ اس کے باوجود دل میں ایک گہرا کانٹا چبھا ہوا تھا۔ یہ کانٹا سوتے جاگتے اس کی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ یہ بادی سے جو ملنے والی ملاقات کا کانٹا تھا۔ بادی کا اگلا فون کب آئے گا اور وہ اس سے کیا چاہے گا۔ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ مگر اتنا اسے پتا تھا کہ فون آئے گا ضرور اور اس کے چین سکون کو ایک بار تو غارت کر دے گا۔

اب کبھی کبھی اسے شک ہونے لگتا تھا کہ کہیں اس صورت حال میں مگراری کا ہاتھ تو نہیں۔ کیا پتا اس نے کسی ڈبل ایجنٹ کا سا کردار ادا کیا ہو اور کسی بڑے لائی میں ہادی کا آلہ کار بننا ہو۔ بہر حال ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔

چند روز پہلے جو فون نمبر اس نے ہادی کو دیا تھا وہ اکثر بھڑ بھڑاتا تھا مگر وہ کبھی کبھی اس پر ایس ایم ایس بھیج دیتا تھا۔ آج اس نے ایس ایم ایس چیک کیے تو بڑی طرح چونک گئی۔ ہادی کا پیغام موجود تھا۔ ”مجھے کال کر دے جلدی۔“ ارم نے پریشان ہو کر گھڑی دیکھی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ بڑے دم میں ہلال کے خزانوں کی مدد کو گئی تھی۔ اس نے یہ آہستگی اس کا وزنی ہاتھ اپنے پیٹ پر سے ہٹایا اور اپنے نہایت مختصر لباس پر ناکئی درست کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی کچن کا دروازہ بند کر کے اس نے یونہی فریج کھول لیا اور بادی کو کال کی۔ کال کر رہے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینہ تھا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ جلدی ہادی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”کیا بات ہے؟“ ارم نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ انداز سرگوشی کا تھا۔

”کل دو پہر ساڑھے بارہ بجے سے ایک بجے کے درمیان شانز اوائلے کینے میں پہنچ جاؤ۔ ضروری بات کرنی ہے۔“ بادی کا لہجہ حکمیت اور جتنی تھا۔

”لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کی کوئی گنجائش نہیں۔“ وہ پھنکارا۔ ”ساڑھے بارہ اور ایک کے درمیان اور پہلے کی طرح جہیں بالکل اکیلے ہونا چاہیے۔“ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

ارم کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کبھی خوف کی لہر سینے سے اٹھتی تھی کبھی ٹیش کی۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ اس بلیک میلنگ کے سامنے سر جھکانے سے بالکل انکار کر دے۔ جلال کے سامنے اپنے ماضی کی اس غلطی کا اعتراف کر لے۔ اس کے لیے کوئی قابل قبول جواز دینے کی کوشش کرے۔ مثلاً یہ کہ کسی وقت اسے بے ہوشی کی حالت میں زیادتی کا نشانہ بنایا گیا یا اس طرح کی کوئی اور بات۔ مگر جب وہ ایسی باتوں کے بارے میں سوچتی تھی تو فوراً جلال کے کٹر خیالات اس کے ذہن میں آ جاتے تھے۔ کچھ حاطوں میں وہ انتہائی تنگ نظر تھا۔ اس کی اسی تنگ نظری سے تو فائدہ اٹھا کر ارم نے اسے آٹا فانا اپنانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ارم کو پتا تھا کہ اگر اس نے جلال سے

ہائے می۔ یا اے کم از کم طلاق تو ضرور ہو جائے گی۔ اور دل سے وہ یہی چاہتی تھی۔ لہذا اس کے لیے خطرہ بھی مول لے سکتی تھی۔

یہ ایک بہت اہم دن تھا۔ ہادی نے سارے غذائیات اور مصلحتیں ایک طرف رکھ کر راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ دراصل اس وقت ہو گیا تھا جب ہاشم ابرک نے اسے بتایا تھا کہ اگر تجاب کو قانونی طریقے سے بھی جلال کے پتکے سے نکلنے کی کوشش کی جائے تو وہ اس میں بڑی کامیابی سے رکاوٹ ڈالے گا اور تاخیری حربے استعمال کرے گا۔

جبکہ ہادی کے خیال کے مطابق وہاں درس والے گھر میں اب حجاب کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ سخت مصیبت بلکہ شاید موت کی طرف بڑھ رہی تھی اور ڈاکٹر عطا بھی اس سے متعلق تھے۔ ڈاکٹر عطا نے ایک اور بات بھی بانی کو بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر جلال نے حجاب کو تنہا کسی کمرے میں بند کر رکھا ہے تو وہ بڑی نرمی حالت میں ہو گی۔ وہ بچپن سے ہی بند جلیبیوں سے خوف کھاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں تنہائی اور ٹھٹھن کے حوالے سے ایک طرح کا فوبیا ہوتا ہے۔

بادی ہاشم ایرک کے ساتھ ایک پرائیوٹ کار میں بیٹھا تھا۔ ہاشم ایرک سادہ لباس میں تھا۔ بہر حال اس کی جینٹ میں بھرا ہوا کرکٹ پیل موجود تھا۔ ہاشم کا ساتھی تھامس بھی کچھ فاصلے پر ایک بک سٹال پر موجود تھا۔ ہاشم ایب اور اس کے ساتھی کو ہادی نے احتیاطاً ہی ساتھ لیا تھا کہ کوئی گزربز ہو تو اس سے چٹا جائے۔ ویسے اس کی توقع کم ہی تھی۔ پروگرام کے مطابق ہاشم نے اپنی کار اس سہ منزلہ پرائیوٹ ہسپتال کے سامنے کھڑی کی تھی جہاں ارم نے کباب بولے کر پہنچا تھا۔

یہ بڑے سنسنی خیز لمحے تھے۔ انتظار کا ایک ایک من ایک ایک دن کی طرح تھا۔ سب سے اہم سوال یہی تھا کہ اگر خواب کو دور والے گھر سے نکالنے اور یہاں تک لے جانے میں کامیاب ہو جائے گی یا نہیں؟ باقی باتیں بعد کی تھیں۔ گھر کی کی موبائیل اپنی مخصوص رفتار سے حرکت میں تھیں۔ سازھے بارون چکے تھے۔ ارم نے کہا تھا کہ وہ جیسے نیل سے نکل کر پہاڑ کی مگرفر روانہ ہوگی اسے فون پر اطلاع دے گی۔ یہ اطلاع بارہ بجے کے گنگ بجے آئی تھی۔ اب آدھ پون گھنٹہ اوپر ہو چکا تھا۔ موبائی اپنی نشست پر بار بار پیٹو بدل رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ خود ہی ارم سے رابطہ کر کے دیکھے۔ اس نے سیل فون اٹھایا اور کہی، وقت تھا جب ارم کی کال موصول ہوگئی۔

"ہیلو..... کہاں ہو تم؟" ارم نے پوچھا۔
 "میں کیلنک کے سامنے بیچی چکا ہوں اور تم؟"
 "میں گھر سے نکلنے والی ہوں۔ تم تیار رہو۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

ہاشم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہادی نے کہا: ”وہ تو بس روانہ ہونے والی ہے گھر سے۔“ وہ بے قراری سے انتظار کرتے رہے۔ ہادی مسلسل عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ چوڑا چکلا ہاشم ڈراموٹک

آسانی سے حجاب کو لے کر باہر آ جاؤ گی۔“

”اور پھر بعد میں کیا ہوگا؟“ ارم نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”بعد میں بھی کچھ نہیں ہوگا۔ تم جلال سے کہو گی کہ حجاب کی بے ہوشی کا سن کر تمہارے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی۔ تم درس والے گھر میں پہنچیں۔ اس کی حالت زار دیکھ کر تم نے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ راتے میں ایک ٹریک جام پر حجاب نے اچانک کار کا دروازہ کھولا اور بھیڑ میں گم ہو گئی۔“

”یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ میرا معاملہ ہے۔ ہاں میں اپنا یہ وعدہ پھر دہرائے گا ہوں کہ جیسے ہی میں نے خود کو اور حجاب کو محفوظ سمجھا جلال کی دسترس سے دور ہو گیا۔ میرا اور تمہارا جھگڑا بالکل ختم ہو جائے گا۔ میں تمہارے خلاف سارے ثبوت ختم کر دوں گا اور میری طرف سے تمہیں یہ گارنٹی ہوگی کہ اس معاملے کی وضاحت تمہیں بھی طرف سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”تمہاری طرف سے نہ ہوگی لیکن اگر کسی اور کی طرف سے ہو مئی تو پھر؟“ ارم نے نشو کے ساتھ پریشانی سے پوچھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے میرا کوئی ساتھی جس نے ثبوت حاصل کرنے میں میری مدد کی ہے؟“

"میرا بھی مطلب ہے۔" ارم نے کہا۔

”ایسا کوئی چکر نہیں ہے اور اگر تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ ایسا ہے تو اس حوالے سے بھی میری پوری جانچ ہے۔“

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور خواہواہ کارف کو درست کرنے لگی۔ اس چھوٹے سے کینے میں ایک ایسے حال میں گن تھا۔ کسی طرح یہ اعلیٰ گیت کی دھن، تہا کو اور کافی کی خوشبو کے ساتھ گنڈا ہو رہی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ کہنا آسان لیکن کرنا اتنا آسان نہیں۔ سب سے پہلے تو جلال الہی پوچھیں گے کہ ان کی اجازت کے بغیر میں درس والے گھر میں کیوں گئی۔ اور اگر تھی ہی تھی اور ڈاکٹر کی طرف جانے کا پروگرام بھی بن گیا تھا تو پھر میں نے اپنے ساتھ کوئی گارڈ کیوں نہ لیا جبکہ مجھے سارے حالات کا پتا بھی تھا۔ وہ تم سب کو چاہتا ہے کہ وہ کہتے ٹکی ہیں۔"

”وہ فکلی نہ ہوتا تو تمہارے ستارے اتنی جلدی عروج پر کیسے پہنچتے۔ اب ان ستاروں کو عروج پر رکھنے کے لیے تمہیں تھوڑا بہت ریسک تو لینا ہی پڑے گا۔ غور کرو تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ تمہاری جان بڑے سستے میں چھوٹ رہی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو بدلے چکانے کے لیے تمہیں کتنی کا تاج بچا دیتا۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے ہادی کا لہجہ پھر زہر ناک ہو گیا۔

اوس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ ایک عیار اور چرب زبان لڑکی تھی مگر اس وقت مہنگ ہو رہی تھی اور لاچار بھی نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اب نیم رضا مند بھی دکھائی دیتے مگر تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا دماغ ایک انداز سے بھی سوچ رہا تھا۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا اس میں امید تھی کہ حجاب اس کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے دور رہے گا۔

اندروہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر سخت لہجے میں بولا۔

”حب! میں کہہ رہا ہوں آپ سے..... صرف دو منٹ بات کرنی ہے مجھے۔ اگر آپ تماشا بنائیں گی تو تماشا بن جائے گا۔ اگر بات سن لیں گی تو ابھی چلا جاؤں گا یہاں سے۔“ ہادی کے لہجے میں کچھ ایسی توانائی اور ایسی فیصلہ کن کیفیت تھی کہ حجاب ٹھک گئی۔

”اب کیا بات کرنی ہے۔ اب کیا کسر رہ گئی ہے۔“ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔

”میں اپنی صفائی میں کچھ کہتا چاہتا ہوں حب! اور ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔“ (طمعاً بچے اس کے ہونٹ سے خون رس آیا تھا۔)

وہ رو ہنسی ہو کر بولی۔ ”جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیں۔ یہاں ارم میرے ساتھ ہے۔ اندر ٹینک میں گئی ہے۔“

”میں نے دیکھ لیا ہے۔ وہ ”کو“ میں ہے۔ ابھی چند رو میں منٹ سے پہلے باری نہیں آئے گی اس کی۔“ ہادی نے کہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی بھی بڑی سختی سے حجاب کی کلائیوں کو پکڑ رکھا ہے۔ اس نے کلائیوں سے اپنی گرفت ختم کر دی اور ایک بار پھر التجا آمیز لہجے میں حجاب کو دیکھنے لگا۔

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

ہادی نے آگے سر تاپا دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور دکھائی دیتی تھی۔ خاص طور سے چہرہ کمزور اور زرد تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آتے تھے۔ بال منتشر اور الجھے ہوئے۔ ہونٹوں پر چڑیاں، ہادی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔

”کیا حالت بنائی ہے آپ کے؟“ اس نے بے حد تاسف سے کہا۔

”میری حالت کو چھوڑیں۔ کیا کہنا ہے آپ نے؟“ اس کے انداز میں انتہا درجے کی رکھائی تھی۔

”حب! پہلے تو مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔ میری غلطیوں کی وجہ سے آپ کے معاملات خراب سے خراب ہوئے اور ان میں سب سے بڑی غلطی وہی غلطی گراف والی تھی۔ میں نے آپ کو بتائے بغیر وہ تصویر اٹھادی اور.....“

”ٹھیک ہے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس کے ذکر کا فائدہ نہیں۔“ وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ چہرے کی طرح اس کی آواز بھی قنابٹ سے بھر پور تھی۔ جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اب ہادی دیکھ رہا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ بھی زخمی ہے۔

”حب! میری نیت ہرگز برائی نہیں تھی لیکن مجھے وجہ سے جو کچھ ہوا وہ بہت بُرا ہوا۔ میں سب جانتا ہوں یہاں آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ جلال بہت بخلیا۔ پھر اُتر آیا ہے۔ معاف کرنا..... اپنی دولت کے زور پر وہ آپ کو زبردستی لوٹنے کی حیثیت دینا چاہتا ہے۔ بالکل فاضل کو دیا ہوا قرض وہ جس شرم ناک بلیک میلنگ کے لیے استعمال کر رہا ہے وہ کوئی پوشیدہ بات نہیں۔“

”ان باتوں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔“

”بات صرف آپ کے حال کی نہیں حب! میں جانتا ہوں آپ جو کچھ جھیل رہی ہیں اس سے زیادہ بھی جھیل سکتی

سیٹ پر تھا اور اس کی نظر بھی بار بار گھڑی کی طرف اٹھتی تھی۔

اور پھر ہادی کو ارم کی سفید فیاٹ کا داخلہ آئی۔ کار نے ٹرن لیا اور سیدھی ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں جا کر رکی۔ ہادی کا دل جیسے اس کے پورے جسم میں دھڑک رہا تھا۔ فیاٹ کی فرنٹ سیٹ پر ارم کے ساتھ حجاب موجود تھی۔ اس کی سیاہ رنگ کی شال وہ وہاں سے دیکھ سکتا تھا۔

حجاب کو گاڑی میں چھوڑ کر ارم باہر نکلی اور متوازن قدموں سے ہسپتال کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ حسب معمول وہ ایک گاؤں تھا۔ کچھ لہوے اور اسکراف میں تھی۔ اونچی اڑی پر ٹھک ٹھک کرتی وہ دروازے میں داخل ہو گئی۔

”احتیاط سے۔“ ہاشم ایک نے انگریزی میں کہا۔

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا اور بخلی سڑک سے نکل کر مین روڈ پر آ گیا۔ مین روڈ پارک کے ہی وہ تھا۔ پارکنگ میں تھا۔ اپنی سرپٹ دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے فیاٹ کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا کر کے برابر بیٹھ گیا۔ حجاب نے بڑی طرح چونک کر اسے دیکھا۔ ”سو رہی حجاب! اور یہی سو رہی..... میں نے آپ کو دیکھا اور اندر آ گیا۔ میں بس دو منٹ آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں..... پلیز.....“

حجاب کے زرد چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چہرے کے لیے یوں لگا کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی جائے گی اور چلا نا شروع کر دے گی۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہادی نے اس کا وہ ہاتھ تھام لیا جو وہ دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھا رہی تھی۔ ”پلیز حب! میں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

”چلے جاؤ یہاں سے.....“

”ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں لیکن.....“

”ہاتھ چھوڑو میرا..... میں کہتی ہوں ہاتھ چھوڑو۔“

ہادی نے جلدی سے ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”پلیز حب! صرف دو منٹ میری بات سن لو۔ میں قسم کھاتا ہوں چلا جاؤں گا۔ پھر کبھی آپ میری شکل نہیں دیکھیں گی۔“

”میں نے آپ کی کوئی بات نہیں سنی۔ میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ آپ نکل جائیں یہاں سے۔ ورنہ..... ورنہ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ پھر دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھایا۔

ہادی نے پھر اس کی کلائی تھام لی۔ اس نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ پھر چلائی۔ ”چھوڑ دیں میرا ہاتھ۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دیں۔“

ہادی نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے دوسرے ہاتھ کا زوردار طمانچہ ہادی کے زخماں پر مارا۔ طمانچہ کھانے کے بعد ہادی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ چائیس اتنی جرأت کہاں سے آگئی اس کے

ہیں لیکن اس جھیلنے سے انکل فیاض اور خالد صوفی کی مصیبتیں کم نہیں ہوں گی۔ آپ کی حالت زار کی خبریں ان تک بھی پہنچ رہی ہیں اور مزید پہنچیں گی۔ خدا نخواستہ..... خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو کیا آپ کی والدہ جیتی رہ سکیں گی۔ دوسرے پہلے ہی بستر پر ہیں۔ آپ کو یہ زنجیریں تو زنی ہوں گی حب۔"

"یہ سب کچھ میرے مقدر میں ہے۔ میں اس کو نہیں بدل سکتی۔ بس دعا کر سکتی ہوں۔"

"کوئی چیز ایسی نہیں جو بدلی نہ جاسکے۔ دیکھیں حب! یہ بات میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں اور اس کو صرف اپنے تک ہی رکھیے گا۔ میں اور ڈاکٹر عطا کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ جلال کا دیا ہوا قرض اسے لوہا یا جاسکے۔ کالی انتظام ہو چکا ہے لیکن ابھی کچھ ہونا باقی بھی ہے۔ اس میں وقت لگ سکتا ہے۔ مہینہ بڑھ کر دیکھنا پھر دو تین مہینے بھی۔ لیکن جس طرح آپ کو وہاں درس دلوانے کے لئے کھانا جا رہا ہے۔ آپ یہ وقت نہیں گزرا سکتیں۔ آپ نے شاید آئینے میں اپنی صورت نہیں دیکھی۔ دیکھیں..... یہ دیکھیں کیا ہو گئی ہیں آپ۔"

ہادی نے عقب نما آئینہ اس کی طرف پھیرا۔ اس نے آئینے کی طرف دیکھا اور چند لمحوں کے لیے وحشی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی ہادی نے بات پھر شروع کر دی۔ "حب! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ڈاکٹر عطا سے مشورے سے کہہ رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم آپ کو ایسی جگہ رکھیں گے جہاں جلال یا اس کا کوئی کارندہ آپ تک نہ پہنچ سکے گا۔ آپ وہاں سے جلال کو فون کر دیں کہ آپ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہے ہم خود سنبھالیں گے۔ اگر جلال نے کوئی اٹارنا راستہ اختیار کیا تو اس کا منہ اس طرح بند ہو گا کہ ساری زندگی اس کے گھر سے یہ سب کچھ قانونی طریقے سے ہو گا اور یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں، یہ ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔" اس نے کہا کہ آپ کو کیا آپ کے گھر والوں کو کوئی گناہ نہیں پہنچے گی۔ اور ہم نے اس سے کسی طرح کی لڑائی کرنی بھی نہیں۔ صرف ڈھائی ماہ کی مہلت مانگی ہے اس سے۔ قریباً آدھی رقم ہم اسے ابھی ادا کر دیں گے۔ آدھی دو ڈھائی ماہ بعد مل جائے گی اسے۔ یہ ساری باتیں ڈاکٹر عطا اور میرے درمیان طے ہو چکی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ڈاکٹر عطا سے آپ کی بات بھی کر سکتا ہوں۔"

ہادی نے سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "نہیں ہادی صاحب! مجھے کسی سے بات نہیں کرنی اور نہ مجھے کسی بھی طرح آپ کی مدد چاہیے۔ آپ کے پہلے ہی بڑے احسان ہیں مجھ پر اب مجھے معاف کر دیجیے۔"

"اچھا..... آپ عطا صاحب سے بات تو کیجیے۔"

"پلیز نہیں..... میں جانتی ہوں، سب کچھ اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر عطا انکل کچھ کہیں گے تو آپ کے کہنے پر ہی کہیں گے۔ جس طرح آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں۔ انہیں بھی کر دیا ہو گا۔ آپ یہاں کے حالات کے بارے میں نہیں جانتے اور نہ ہی جلال کی حیثیت کا پتا ہے آپ کو۔ آپ..... آپ مسلسل ہماری مصیبتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے آپ چھپا چھوڑ دیجیے ہمارا۔ یہ میرے پر اہل ہیں، میں انہیں خود مل کر لوں گی۔ مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ کی سب سے بڑی مہربانی یہی ہو گی کہ یہاں سے چلے جائیں اور دوبارہ اپنی صورت نہ

ہم نہیں۔ اور ایک بات اور یاد رکھیں۔ مجھے درس والی کوشش سے صرف جلال نکال سکتے ہیں یا میرے ابو نکال سکتے ہیں۔ ان کا لہجہ پھر درشت ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ وہ پھٹ پڑے گی۔ وہ بار بار ہراساں نظروں سے ہسپتال کے داخلی دروازے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی جہاں سے ارم کو لوٹنا تھا۔

ہادی نے پھر اس کی ذمہ داری رک پر ہاتھ رکھا۔ "حب! اپنا نہیں تو اپنے والدین کا خیال کریں۔ جو کچھ آپ کے ہاتھ ہو رہا ہے، آپ کو کچھ نہ کچھ ہو جانا ہے۔ کسی قیدی کی طرح کال کوٹھڑی میں گھٹ گھٹ کر ختم ہو رہی ہیں آپ۔ یاد رکھئے، آپ کو کچھ ہوا تو آپ کی امی کا کیا ہو گا۔ انہیں ابھی تک آپ کے حالات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ آپ کے ابو بھی اتنے سخت جان نہیں کہ کوئی ایسا صدمہ برداشت کر سکیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آپ کے گھر والے فی الحال اس قائل نہیں کہ آپ کے چھٹکارے کے لیے کچھ کر سکیں اور وہاں جلال کی طرف بھی کسی کو آپ پر دم نہیں آتا۔ جلال اس وقت بدلتی کی ہر حد سے گڑا ہوا ہے۔ وہ دربار باقاعدہ مجھ پر ہاتھ اٹھا چکا ہے اور یہ ارم؟ یہ زنی غرور کی جڑ ہے۔ اس کی بھی کسی ظاہری بات پر نہ جائے گا۔ یہ بات صرف اپنے تک رکھیے گا کہ اس وقت ارم کو یہاں ڈاکٹر کے پاس لے کر آئی ہے تو میرے ہی مجبور کرنے پر آئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے کسی طرح اس کی بات کرنے کا موقع مل سکے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا کہ وقت بہت کم ہے۔ معاملات بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت آپ کے پاس بہترین چوائس یہی ہے کہ آپ درس والے گھر سے اور اس خطرناک صورت حال سے نکل چلیں۔ وہ ایک ہی سانس میں بولنا چلا گیا۔

حجاب پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس کی باتوں پر ایک دم یقین کر لینا چاہتی ہے۔ کسی وقت محسوس ہوتا تھا کہ اسے ہادی کا ایک جلی بھی گاڑی میں ٹھہرنا گوارا نہیں۔

ہادی بولا۔ "وہ دیکھیں وہ سائیکل کی سڑک پر پہنچ گئی گاڑی کھڑی ہے۔ اس کا پچھلا حصہ نظر آ رہا ہے۔ میں اسی پر بیٹھ کر آ جاؤں۔ ڈرائیور بھی موجود ہے۔ ہم چندہ میں منہ منہ سے اندر بالکل محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کے لیے سب کچھ..... سب کچھ ٹھیک کرنا میری ذمہ داری ہے حب! پلیز میری بات پر یقین کیجیے۔ میں آپ کو ایک جلی سی آج بھی آئے نہ دوں گا۔" ہادی کے لب و لہجے میں سچائی و توانائی کا ایک سمندر موجزن تھا۔ یہ بے پناہ گلاب کی ہستی کو تھکا دینا لگتا تھا۔

یہی وقت تھا جب ہادی کے فون کی بیل ہوئی۔ یہ ارم کا وہی نمبر تھا جس پر وہ اس سے رابطہ کرتی تھی۔ ہادی نے گلاب کی سیو کی۔ "ہیلو کیا بات ہے؟" ہادی نے پوچھا۔

"گڑبڑ ہو گئی ہے۔" ارم کی گھبراہٹ ہوئی آواز خالی دہی۔

"کیا مطلب؟ کہاں ہو تم؟"

"میں ہسپتال کے اندر ہوں۔ انٹرنس کے پاس ہی کھڑی ہوں۔ مجھے سڑک کے پار جلال کا ایک گاڑی نظر آ رہا ہے۔ وہ اپنے سکوتر کے پاس کھڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ہاسٹل ڈھانچا کر رہا ہے جوئے یہاں پہنچا ہے۔ وہ فون پر کسی بات کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے سینئر اسٹو کو بلا رہا ہے۔ تمہارے پاس وقت نہیں۔ اگر تم نے یہاں سے

ساتھ ہی ایک کار کے ٹائر خوفناک آواز سے چڑچڑائے۔ کار کی نکر سے محجم ٹھجیم گاڑو دودھ تک لڑھک گیا۔ اس کی کمر کے ہولنر سے بسٹل بھی نکل کر سڑک پر پھسلنے نظر آیا۔ دوسرا گاڑو جو شعل سے اندین یا پاکستانی لگ رہا تھا۔ غلظت بک رہا تھا اور ہادی کو لمبے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر پختہ سڑک سے نکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی صورت کچھ جانی سی لگ رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب ہاشم ایرک اور اس کا ماتحت تھامس، ہادی کی مدد کو لپکے۔ انہوں نے حملہ آور گارڈز کو ہادی کے پاس پہنچایا اور گھبراہٹ سے منہ سڑک پر پھینک دیا۔ گاڑیاں زک رہی تھیں۔ درجنوں لوگ ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ یہاں سے کچھ اس حجم شیم گارڈز کو دیکھ رہے تھے جو کار کی نگر سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ کچھ دوسرے گارڈز کا غناشہ دیکھ رہے تھے۔ ہاشم ایرک اس کے ہاتھ پیچھے موڑ کر اسے جھکڑی پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جھکڑی دیکھ کر لوگ سمجھ گئے تھے کہ یہ پولیس آفیسر ہے۔ اسی ہنگامے میں ہاشم ایرک کے ماتحت تھامس نے ہادی کو اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ ہادی نکلتے جائے۔ ہادی نے گاڑی کی طرف مڑ کر دیکھا ہر اسال چہرے والی ارم بھی اب گاڑی میں حجاب کے پاس موجود تھی۔ اپنا دلوں نے گاڑی غائب اندر سے الٹ کر لی تھی۔ ہادی نے دیکھا دور سے ایک اور سکونر سوار گارڈز موقع پکڑ رہا تھا۔ ہادی نے تیزی سے سڑک پار کی اور ایک بھٹی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کے آخری سرے پر پھر ایک سڑک تھی۔ اسے ایک لمبے ٹھہر آئی۔ وہ سیکٹر پر نہ کھنکے کے بعد سسٹ روٹی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہادی فیک کر اس میں جا رہا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور سینے میں تان کا ای اور مایوسی کا دھواں بھر رہا تھا۔ وہ حجاب میں ہاتھ پیرا نہیں کر پایا تھا جو اسے ساتھ چلنے پر آمادہ کر دیتی۔ شاید کہیں ایک انچ کی کسر رہ گئی تھی۔

○.....○

عجب درس والے گھر میں تھی۔ جہاں میں پر چلا رہا تھا۔ اس نے تم سے ہمدردی کی بلکہ بیوقوفی کی اور تم نے اس کی بیوقوفی کا فائدہ اٹھایا۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی اور تم نے وہیں پر اس حرامی کو بھی بلا لیا۔ بتا کس طرح بیوقوف نے اسے وہاں لے آیا۔

”میں نے نہیں بلایا۔“ وہ بکلی۔ ”میں کیسے کس کو بلا سکتی تھی۔ میرے پاس کوئی فون نہیں تھا۔ ارم سارا وقت کمرے میں بیٹھ رہی ہے۔ میں چونک کر بڑی قسم کھا سکتی ہوں۔“

”تیری قسمیں اب اعتبار کے قابل نہیں رہیں۔ ارم تجھے گاڑی میں بٹھا کر کلینک میں چلی گئی۔ تم نے اس وقت سے کال کی ہوگی۔“

”میں نے تمہیں کی جلال! میرا یقین کریں!“ وہ ہنسیوں سے روئے لگی۔ ”وہ تو مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اسی لئے اسے روکنے کے لیے اسے روکنا پڑا۔“

”یہ سب کچھ تم نے اس وقت کیا جب گارڈز آگئے۔ تم بہت بڑی دھمکیک باز ہو۔ تمہارے اس نئے دھوکے کو اس طرف رکھ دیا جائے تو تمہارے پہلے فرائض کچھ کم نہیں ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں کسی دن مار دوں گا اس

لکھنا ہے تو جلدی نکل جاؤ۔ ورنہ پھر بہت تماشہ لگ جاتا ہے۔ پلیز جلدی کرو۔“ ارم کی آواز کانپ رہی تھی۔
ہادی نے مزہ کر دیکھا۔ گاڑی ایسی جگہ کھڑی تھی کہ اسے سکوتر سوار گاڑو نظر نہیں آیا لیکن ظاہر تھا کہ ارم جلدی نہیں
کہہ رہی۔ ”اوکے“ ہادی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

”کیا بات ہے؟“ حجاب نے بے حد سراپہ لہجے میں پوچھا۔
 ”حجاب پلیز امیری بات مان لیں۔ یہ موقع آپ کو پھر نہیں ملے گا۔ وہ سامنے گاڑی کھڑی ہے۔ میں بھیج
 قدم کا فاصلہ ہے۔ ہم اس مشکل سے نکل سکتے ہیں۔ پلیز حجاب!“

حجاب کا رنگ بالکل ہلکی ہو گیا تھا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ کس کا فون تھا؟“ اس نے پوچھا ہے۔
ہادی نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ ”میرا۔“ ”جب الگتا ہے کہ جلال کے ایک کاروبار میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ
اپنے ساتھیوں کو بلا رہا ہے۔ ان کے بچنے سے پہلے ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ یہ دقت ہمارے ساتھ نہیں آئے گی۔“
جب! تو بہت نقصان ہو جائے گا۔ اہم سمجھیے۔ ہم مل کر ہر چیز کو فیس کر لیں گے۔ میرا وعدہ ہے آپ سے

حجاب پیچھے ہٹ کر گاڑی کے دروازے کے ساتھ لگ بھگ آٹھ گھنٹوں میں خوف و ہراس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تین منٹ پہلے اس کے رویے میں جو تھوڑی سی چٹک نظر آتی تھی اب اس کا دور دورہ ہوتا نہیں تھا۔ وہ لہرزاں آواز میں بولی۔ ”آپ ہمیں برباد کر کے چھوڑیں گے۔ آپ چلے جاؤ یہاں سے، دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ مجھے کہیں نہیں جانا..... مجھے کہیں نہیں جانا۔“ آخری الفاظ اس نے بالکل چٹانے والے انداز میں کہے۔

حب اس نے پھر دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہادی نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ اس نے نرمی طرح ہاتھ جھٹک دیا اور بتائی۔ ”میں پولیس کو بلاؤں گی..... پولیس..... پولیس.....“

اب ہادی کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ فوراً گاڑی سے باہر نکل جائے۔ وہ جیسے بے ہوش ہو گیا۔ قریب تھا۔ ہادی نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہی وقت تھا جب دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور بھرا ایک بھاری بھر کم ہاتھ، ہادی کے گریبان پر تھا۔ اس نے ٹھک کر دیکھا۔ یہ ایک مجسم ضخیم اطالوی گاڑو تھا۔ اس کی نئی آنکھوں میں جیسے نیلے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور ہادی لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر آن گرا۔ اسی کا سڑک کے پانچ چھانچے اونچے کنارے سے نکل آیا تھا۔ یو نیفارم والا مجسم ضخیم گاڑو ہادی پر چبڑا۔ ہادی کو لگا جیسے وہ کسی جنگلی بھینسے کے نیچے دب گیا ہے۔ گاڑو نے اس کے منہ پر مکارسید کیا جواب میں ہادی نے بھی نیچے سے ایک طوفانی مکار اس کی ناک پر مارا۔ اسی کے کانوں میں حجاب کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ابھی تک گاڑی کے اندر تھی۔

تب ہادی نے دیکھا کہ ایک شخص اس پر جمپٹ رہا ہے۔ یقیناً یہ بھی حملہ آور کا ساتھی تھا۔ یہ یو پی فارم میں نہیں تھا مگر شکل و صورت سے گارڈ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی ہادی کی پیسلوں میں زوردار ٹھوکر دے سیدھی گھر پھر اس پر ہل پڑا۔ ناک پر مکا کھانے والے مخم مخم گارڈ کا منہ رنگین ہو گیا تھا اور ہادی پر اس کی گرفت قدرے کمزور ہو چکی تھی۔ ہادی نے اسے اپنی ٹانگوں کے پورے زور کے ساتھ جھیکے کی طرف اُپھمال دیا۔ وہ پشت کے بل سڑک پر گر گیا۔

مت کہتا کہ میں نے جنہیں یہاں قید کر رکھا ہے۔ دوسری شادی سے لے کر تھیں یہاں رکھنے تک میں نے کوئی نا جائز کام نہیں کیا ہے۔ تم اپنی مرضی سے ہو یہاں۔ مکمل طور پر اپنی مرضی سے ہو اور ابھی تم اس کا ثبوت بھی دو گی مجھے جب میں واپس جاؤں گا تو تم ثبوت دو گی۔“

وہ کچھ نہ بولی اور نہ کچھ پوچھا۔ اس نے ٹیبل لیپ کی روشنی میں دھیان سے اس کے زخموں کا زخم دیکھا اور کندھے کا بھی۔ غالباً وہ انہی تازہ چوڑوں کو دیکھنے یہاں آیا تھا۔ اس نے روئی رکھ کر حجاب کے زخموں سے بچنے والا خون بند کیا۔ پھر کندھے سے قمیص ہٹا کر وہاں بھی روئی کا پھا ہار رکھا۔ وہ زخموں والے زخم کے سلسلے میں زیادہ فکر مند نظر رہا تھا۔ حجاب نے اندازہ لگایا کہ یہ زخم کٹ سے زیادہ جھلنے جیسا ہے۔

جلال نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈرائیور عثمان کو فون کیا اور اسے فوراً میڈیکل سنٹر سے ایک آئکنٹیٹ لانے کو کہا۔ یہ زخموں کے لیے ایک بہت سنگین دوا تھی اور حال ہی میں مارکیٹ میں آئی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ باہر گیا اور آئکنٹیٹ لے آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے حجاب کے زخموں کا زخم پایہ ذین سے صاف کیا اور مرہم لگا کر چپکنے والی زخم بند کر دی۔

بقا پر زخمی اور ہمدردی نظر آتی تھی مگر حجاب جانتی تھی یہ کیسی ہمدردی ہے۔ یہ وہی ہمدردی اور توجہ تھی جو انسان اپنے زیر استعمال اشیاء سے رکھتا ہے۔ اگر جلال کی گاڑیوں میں سے کسی گاڑی پر بد نما خراش آ جاتی تو بھی وہ انہی ہی قدر بندی اور توجہ کا مظاہرہ کرتا۔ وہ اس کی ملکیت تھی۔ اس نے اسے استعمال کرنا تھا۔ آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو

پوسٹ یا پھر ایک دو ماہ بعد۔ آہ یہ کیا رشتہ ہے؟ حجاب کے لیے یہ کدو سے سوچا۔ بے شک آج کل حجاب کو دیکھتے ہی جلال کی آنکھوں سے آنسو کی پڑگاں چھوٹنے لگتی تھیں لیکن سوچنا کہ حجاب کے لیے ہوتی تھیں۔ اس کی جسمانی خوبصورتی اور شادابی کے لیے نہیں۔ وہ سب کچھ یقیناً اسے ابھی تک مرعوب تھا۔ اب نہ سہی، مستقبل قریب میں سہی۔ وہ ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ شاید..... شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اسے طلاق کی پُر زور دھمکی تو دیتا تھا لیکن اس دھمکی کے ساتھ اس کے اوپر گھبراہٹ کے سنگین نقصانات کو بھی قہری کر دیتا تھا۔ وہ اس کی ملکیت کھونا نہیں چاہتا تھا اور وہ اس میں کامیاب تھا۔

اس کی مرہم پٹی کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور حکم سے بولا۔ ”اٹھو۔“ وہ کسی معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ ”کدو کھو آج میں تمہیں آخری بار بالکل آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اب اگر تم سناؤ یا کیا یہاں سے جانے کی بات بھی کی تو میں تمہاری طلاق کے کاغذات تمہارے منہ پر مار دوں گا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہو گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ تمہاری ذمہ داری ہو گی۔“

دوست زدہ کھڑی رہی۔ اب فریاد کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ رات بھر کھڑا ہوا۔ ”اب مجھے اس بات کا ثبوت دو کہ میں نے تمہیں یہاں قید کر رکھا ہے۔ پھر یہ دروازہ کھولنے ہاتھوں سے بند کرو۔“

”جج..... جی“ وہ مردہ آواز میں بکلائی۔

حرامی کتے کو اور ساتھ ساتھ تجھے بھی۔ ٹوکی رعایت کے لائق نہیں ہے۔ چل نیچے..... میں کہتا ہوں چل نیچے۔“ خدا کے لیے جلال! مجھ پر یہ ظلم نہ توڑیں۔ بے شک مجھے بند کر دیں لیکن اسی کمرے میں رہنے دو۔ میں وہاں نہ لے جائیں۔“

وہ پھنکارا۔ ”مجھے تو اب دو جگہ بھی تیرے لیے زیادہ محفوظ نہیں لگتی۔ تیری جیسوں کو تو کسی کنویر میں پھینک دیا جائے۔ زنجیریں ڈال کر..... چل نیچے۔“

وہ کھینچ کھینچ کر کمرے میں اپنے کمرے میں اس جھمٹ میں جانا ہی اسے موت لگ رہا تھا۔ وہ رونے لگنے لگی۔ وہ دھواڑ ”دو ہی راستے ہیں تیرے سامنے۔ چپ چاپ جھمٹ میں چلی جایا پھر ابھی طلاق کے کمرے میں باپ کے گھر پہنچ جا۔“

وہ ایک ایسے دور رہے پر تھی جہاں سے کسی بھی طرف قدم اٹھانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے اسے یہ غلط فہمی تھی کہ شاید ہادی کی شدید مزاحمت کر کے اور اس کے ساتھ نہ جا کر اس نے جلال کی جارحانہ سامنے جس طرح سر جھکایا ہے اس کے صلے میں وہ کچھ نرمی دے گا لیکن یہاں تو ہر بات کا مطلب اٹل تھا۔ چر عا جزی کا بدل جبر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بار پھر جھمٹ کی ٹوکس سیر یہاں آئے۔ پھر پھر وہی تھی۔ وہ اس کے عقب میں آ رہا تھا۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ ایک بار پھر تڑپ گئی۔ بارہ وقت صبح چارہ وقت کے اس جھمٹ کی یہ چار دیواریں اسے موت کے چاروں طرف فزشتوں کی طرح لگتی تھیں۔ یہاں کی ہر شے ایک سہرت تھا جو اس کا خون چوسنے کے لیے لپکتا تھا۔ وہ مڑی اور دل نگار بیچانی انداز میں بولی۔ ”قار کا ڈسک جلال! زخم کو دیکھو مجھے یہاں بند نہ کریں۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتی۔ مجھے جس طرح رکھیں گے رہوں گی۔ کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔“

اب جلال کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اندھا دھند اس پر بل پڑا۔ اس کے زخمی ہاتھ اور اس کی حالی کی پردا کیے بغیر۔ اس نے اس پر ٹھوکروں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ اندر ٹائیلوں کے پھولدار فرش پر گر گئی۔ اس کے چلانے کی آوازیں دلدوز تھیں۔ اس کے پورے جسم پر جیسے ہتھوڑوں اور آتشیں طمانچوں کی بارش ہو گئی تھی۔ اسے بیدردی سے چہیت کر اس نے جھمٹ کا دروازہ دھماکے سے بند کیا اور اسے منتقل کر کے چلا گیا۔ وہ وہیں آنکھیں بند کیے پڑی رہی اور سستی رہی۔ وہ آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر کھولتی تو پھر وہی جھمٹ کے جہت نامک درد دیوار نظر آتے۔ مگر نے سے اس کا زخمی ہاتھ پھر سنستا اٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کندھے اور زخموں پر بھی چٹ آئی تھی۔ شاید الماری کا کوئی ہینڈل لگا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے زخموں پر نمی کا احساس ہوا تو پتا چلا کہ خون بہہ رہا ہے۔ مگر اس نے پھر بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد تہ خانے کا دروازہ پھر کھلا اور جلال اندر آ گیا۔ اپنی نم پلکیں اٹھا کر حجاب نے دیکھا اس کے غصے و غضب کا دریا زار سا اترتا ہوا نظر آتا تھا۔

”بیز پر ٹھٹھو۔“ وہ پھنکارا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کی طرف انہی انہی کڑی ہر لیے انداز میں بولا۔

خبری نہیں تھی۔ اس سے آخری ملاقات میں ایک بار تو ہادی کا دل چاہا تھا کہ وہ اس کی دونوں کھانسیوں کو زور سے فٹے اور ہر مصلحت ایک طرف رکھنے کے بعد پکار کر کہہ دے۔

”جباب! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شاید یہ لفظ چھوٹا ہے۔ شاید عشق کا لفظ بھی اتنا برا نہیں۔ میں اس جذبے کو تیرا نام دوں حب! جو مجھے تمہارے لیے مار چکا ہے ختم کر چکا ہے۔ لیکن وہ کہہ نہ سکا تھا۔ اور اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی کہہ بھی نہ سکے گا لیکن کیا اس نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس دیوانگی اور اس والہانہ پن کی وجہ نہیں سوچی تھی جو وہ اس کے لیے رکھتا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ڈاکٹر عطا تھے۔

”ہیلو ہادی! یہ نئی جگہ کیسی ہے؟“

”مناسب ہے عطا انکل! آپ سائیں انکل نیاز سے بات ہوئی؟“

”ہاں ہوئی۔“ ان کی آواز میں ایک بار پھر مایوسی کا عنصر تھا۔

”کیا کہتے ہیں؟“

”ہادی! اصل میں کوئی ڈھائی ہزار یورو تو انہوں نے ایک ہفتہ پہلے ہسپتال کا بل ادا کیا ہے۔ ابھی مزید خرچہ نہیں کیا۔ ابھی تو وہ اس معاملے میں ہاتھ ہی کھڑے کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی طرح وہ کجمرات والا بات بک جائے۔ چاہے کتنے کا بھی کہے۔“

”انکل! مجھے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی۔ وہ پلاٹ بکنے والا ہوتا تو اب تک بک چکا ہوتا۔ انکل! یہ ان کی نیچا معاملہ ہے۔ کیا اس سلسلے میں ان کی ساری بھاگ دوڑ اس پلاٹ سے شروع ہو کر وہیں پر ختم ہو جاتی ہے؟ یا پھر

وہ کسی طرح کی چین لینا ہی نہیں چاہ رہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے ہادی! یہ حالات بد سے کوئی دھمکے بے بس کر چھوڑتے ہیں۔ سیانوں نے ٹھیک کہا ہے کہ

نارن اور عقلمند بندے کو جال کی طرح جکڑ لیتے ہیں۔“ عطا انکل! بچپن سے ہر قلم اور ڈرامے میں ہم ایسے ہی نہیں

دیکھتے رہے ہیں۔ باب کوئی بکے دورے سے بچانے کے لیے یا ماں کی سلامتی کی خاطر اولاد ناپسندیدہ فیصلوں کی

بجائے تڑپتی ہے۔ کبھی تو لگتا ہے کہ حقیقت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ رومانی یا ازدواجی معاملات میں اکثر اولاد کو

قربائیاں دینا پڑتی ہیں۔“

”لیکن یہاں تو صورت حال واقعی مخدوش ہے ہادی! صوفیہ کی حالت ایسی ہے کہ ذرا سا صدمہ بھی نہیں سہ

سکتی۔ ابھی تک اس سے ہر بات پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ وہ ہمارے جباب سے ملنے پر اصرار کر رہی ہے۔ اسے بتایا گیا

ہے کہ وہ جلال کے ساتھ ویش میں ہے۔ جلال نے اسے گھسیٹ کر فون کرنے سے منع کیا ہوا ہے۔ اس لیے وہ فون

نہیں کر سکتی۔ جلد ہی خود آکر ملے گی۔ جلال کی دوسری شادی کا بھی ابھی موقع کوئی نہیں۔“

”لیکن کب تک انکل! کب تک آپ لوگ یہ سب کچھ چھپائیں گے۔“

”میں لاطینی نہیں بول رہا۔ میں باہر جا رہا ہوں تم یہ دروازہ خود بند کر دنا کہ جنہیں اپنے اختیار کا احساس ہو۔ چلو۔“ وہ تحکم سے بولا۔ پھر اس کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف لے آیا۔ خود باہر نکل گیا اور بولا۔ ”بند کر دو دروازہ اپنے ہاتھوں سے۔“ اس کی سانس سینے میں اٹکتے گئی۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ جلال کے سامنے ہاتھ جڑ دے۔ ایک بار پھر اس کی صحت ساجت کرے۔ مگر پھر اس نے کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اگر اس نے اس کی مرضی چوری نہیں کی تو وہ شاید پھر تشدد پر اتر آئے۔ کچھ حاصل نہیں تھا۔ اب کچھ حاصل نہیں تھا۔ اب پسپائی تھی ابھی مسلسل پسپائی۔ اس نے چکیوں کے روتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ اس نے باہر سے بولت لگا کر لاک کر دیا۔ جب دوسری دریاں جڑ کر وہاں جا رہا تھا اس کے قدموں کی چاپ میں ایک فاتحانہ دھمک تھی۔

ہاشم ایرک کے مشورے پر ہادی نے ہوٹل تبدیل کر لیا تھا۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل شہر کے وسط میں تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں جو کمرہ ہادی کو ملا وہ اس کے اصل نام سے بک نہیں تھا۔ یہ بنگلہ نے ہی کروائی تھی (اور اس کے لیے پاسپورٹ کے بغیر ہی کام چلا رہا تھا) ہاشم ایرک نے بتایا تھا کہ واسٹو نام کا جہان سٹا کارڈ لڑائی کے دوران میں کار کی نگر سے ڈبھی ہوا وہ ہسپتال میں ہے۔ اس کی دوپٹا کی نوٹ مٹی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی طرح کا مقدمہ تو درج نہیں کرایا گیا تھا مگر ہاشم کو یقین تھا کہ جلال جیسا شخص خاموش نہیں رہنے کا اور اس کے کارندے ہادی کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ ہادی نے اس دوسرے گارڈ کو پہچان لیا تھا جو واسٹو کے ساتھ مار پیٹ میں شریک ہوا۔ ہوٹل واسکوڈے کے سامنے کچھ عرصہ پہلے ہادی پر جو حملہ ہوا تھا یہ شخص اس میں شریک تھا۔ لیکن اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ہادی کے ساتھ دو مار پیٹ بھی جلال نے ہی کروائی تھی۔

ہادی اس پراڈونامی ساحلی ہوٹل میں خاموش بیٹھا تھا۔ اسے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر اس نے سگریٹ تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ بات انکل یا سگریٹ کی ہی نہیں تھی۔ ان دو چار ماہ میں اس کے اندر حیرت ناک تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ ایک بدلا ہوا شخص بن گیا تھا اور ان تبدیلیوں کی بنیاد کسی کی خاموش محبت تھی۔ وہ عشق تھا جو کسی نایاب خوشبو کی طرح اس کے رویوں میں روکیں میں سا گیا تھا۔ کسی نے کہا تھا۔

تم عشق کی منزل میں قدم سوچ کے رکھنا

درپائے محبت کے کنارے نہیں ہوتے

اس دقت بھی ہادی کے دل و دماغ میں جباب کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کا زرد چہرہ وحلی وحلی آنکھیں اور مخمف آواز۔ یہ سب کچھ اس کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا۔ کہاں تھی وہ روشن پیشانی، کہاں تھے وہ ہنسنے والے ہونٹ جنہیں وہ نرمی سے دانتوں کے دباتی تھی اور ایک حسین ادا کو جو دیتی تھی۔ وہ دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی طرح پگھل رہی تھی۔ ختم ہو رہی تھی اور وہ اس کے لیے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اس کے سینے میں دھواں بھرنے لگا۔ اسے لگا کہ جباب کو کچھ ہو گیا تو وہ بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ بڑی تیزی سے بہت دور جا چکا تھا وہ۔ کسی کے عشق میں خود کو گم کر چکا تھا۔ وہ اس کی جان بن چکی تھی اور یہ لفظی بات نہیں تھی۔ اسے حقیقت میں یہی لگتا تھا اور ختم کی بات یہ تھی کہ اسے کچھ

"کم از کم حجاب اس قلعے سے تو نکل آئے جس میں پھنسی ہوئی ہے۔ جلال سے رہائی مل جائے اسے۔"

"کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے انگل کہ وہ اسے آزاد کرنا ہی نہیں چاہتا۔ قرض چکا بھی دیا گیا تو وہ رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے لیکن قرض کی ادائیگی کے بعد اس کی پوزیشن بہت کمزور ہو جائے گی۔ دو دن کے اندر پولیس اس کے گھر کا دروازہ کھٹکنا دے گی۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔"

"لیکن انگل! وہ تب تک زندہ رہے گی تو پھر ہے نا۔ آپ نے اسے نہیں دیکھا لیکن میں نے دیکھا ہے۔ برسوں کی بیمار نظر آتی ہے۔ مجھے تو لگتا تھا کہ کسی بھی وقت گاڑی میں ہی بے ہوش ہو جائے گی۔ کاش... میں کبھی طرح..... اسے ساتھ لاسکتا۔ بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔"

"اس نے نہیں آتا تھا ہادی! میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا۔ وہ نہیں آئے گی۔ اس کے باپ نے اسے جہاں کھڑا کیا ہے وہ وہیں کھڑی رہے گی۔ چاہے جان چلی جائے۔ اب وہی کہے گا تو وہ وہاں سے بے گھر ہو جائے گی۔"

"لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی ہادی۔"

"جی فرمائیں۔"

"یہ ارم تیار کیسے ہو گئی؟ حجاب کو درس والے گھر سے نکالنے کے لیے؟"

"ہاں اس کی ایک ڈھکتی رگ میرے ہاتھ میں تھی۔ اس سے فائدہ اٹھایا میں نے۔ میں فیسوس کہ حاصل کچھ نہ ہوا۔"

ہادی نے گول مول سا جواب دیا تھا۔ دوسری طرف عطا صاحب یقیناً سمجھ گئے کہ وہ قلعے میں چاہتا تھا۔ ہادی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "عطا انگل! جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد لگتا ہے کہ شاید حجاب کو وہاں پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس پر سختی بھی بڑھادی جائے۔ ہم اس معاملے کو زیادہ Delay کر سکتے ہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔ میں ابھی ہجرات میں ایک جاننے والے کو فون کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پلاٹ لینے پر راضی ہو جائیں۔ ان سے تمہارا بہت ادھار بھی لیا جاسکتا ہے۔"

"میں بھی اپنے طور پر پوری کوشش کر رہا ہوں۔ ہمارے اختیار میں کوشش کرنا ہے۔ کامیابی دینا اور والے کا کام ہے لیکن اب ایک بات تمہارے دھیان میں رہے۔ جلال یا اس کے کسی کارندے سے تمہارا براہ راست ٹھکانہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں بہت احتیاط رکھو۔"

ڈاکٹر عطا سے بات ختم کرنے کے بعد ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کا دھیان وہ رو کر ارم کی طرف جاسکتا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ ارم پر دباؤ ڈال کر اس سے ایک بڑی رقم حاصل کر سکے۔ لیکن چاہئیں کیوں یہ سب کچھ اسے گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ کیا وہ حجاب کو بلیک میلنگ کے روپے سے رہائی دلائے گا؟ کیا اس کی جان سے پیار ہی اتنی آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے بلیک میلنگ کی مرہون منت ہوگی۔ اس سوال کا جواب ہادی کے دل نے ہر بار ہائی میں دیا تھا۔ وہ سواتین کروڑ روپے کی اس رقم میں بلیک میلنگ یا غیر قانونی طریقے سے حاصل کیا ہوا ایک چھوٹا سا حصہ بھی شامل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جو پھولوں اور شبنم کی طرح پاک تھی اس پر غلامت کا ایک جھینٹا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

تو پھر کیا وہ اپنا مکان فروخت کر دے؟ وہ حجاب کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا۔ ہر بڑی سے بڑی آزمائش سے گزر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے بھائی فہد سے مکمل کربات کرے گا۔ ایک دوست کی طرح اسے اپنی ہر قسمی واردات سے آگاہ کر دے گا۔ اسے بتا دے گا کہ پچھلے چند ماہ میں اس کی زندگی کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ چاہئیں کیوں اب اسے رو رہے کہ انگل فیاض اور فیصل کا خیال بھی آ رہا تھا۔ ان سے وابستہ توقعات ہرگز پوری نہیں ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ڈر سم کر دیک گئے ہیں۔ وقتی طور پر ہی اتنی گھبراہٹوں نے حجاب کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انگل فیاض تو چلو بوڑھے اور کمزور سی لیکن کیا فیصل بھی بالکل لاچار ہو گیا تھا۔ اُس بے چاری کا تو منہ نہ کھٹکا تھا۔ فیصل اور ابو کا نام لیتے ہوئے۔ خاص طور پر اپنے ابو پر تو بڑا مان تھا اسے۔ ان بدترین حالات میں بھی اس کی آنکھیں گواہی دیتی تھیں کہ اسے اپنے ابو اور بھائی کے قدموں کی چاپ کا انتظار ہے لیکن وہ چاپ کہیں نہیں تھی۔

اس رات اس نے درمیں ڈوب کر ایک اور یادگار نظم لکھی۔ اس نظم کا ماخذ جولائی 1798ء کو پیش آنے والا ایک یادگار واقعہ تھا۔ یہ واقعہ پہلے بھی "کاسا بیا نکا" کے عنوان سے منظر ہو چکا تھا۔ ہادی کی نظم کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

اور نہ جانتے ہو کاسا بیا نکا کون تھا کاسا بیا نکا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ دو فرنگی بحری جہاز کے فائر کا لخت جگر تھا اور جب کھلے ویران پانیوں میں انگریزوں نے حملہ کیا۔ جب جہاز کو آگ لگی اور ہر طرف شہلک چا لڑائی کی آواز اٹھائی۔ عرشے لرزنے لگے تو باپ نے کاسا بیا نکا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا۔ "کاسا بیا نکا کھڑے رہنا، جب تک میں نہ کہوں۔"

اور وہ کہہ کر چلا گیا اور وہ ہانڈو کی بارش میں موت کا شکار ہوا اور بیٹا باپ کے حکم پر اسی جگہ ٹھہرا رہا۔ اس کے گرد موت نے اپنے گھیرے تنگ کیے۔ وہ بھلا نہیں وہ کیسے جتا۔ ابھی اس کے باپ کا حکم نہیں تھا اور وہ اسی جگہ کھڑا کھڑا تھا اور وہ اطاعت کی لازوال مثال تھا۔

میں نے کاسا بیا نکا کو نہیں دیکھا لیکن میں نے وہم کی روشنیوں میں چمکتی دیکتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ مجھے اپنے باپ کے حکم پر ایک جلتی ہوئی چادر یواری میں کھڑی رہی۔ اس کے نازک پاؤں جل گئے۔ اس کا کوئل بدن جل گیا۔ وہ درد سے کہا جی رہی اور کراہتی رہی۔ ہاں میں نے کاسا بیا نکا کو نہیں دیکھا لیکن روم کی اس لڑکی کو دیکھا ہے۔"

نظم لکھنے کے بعد اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے پارکر کا قلم اپنے ہونٹوں سے نکالا اور سوچے لگا ہمارے اور وہ حجاب جیسی نہ جانے کتنی لڑکیاں ہوں گی جن کے پاؤں جل رہے ہوں گے، جن کی سانسیں زک رہی ہوں گی۔ مگر وہ اپنے والدین کو دکھوں اور مصیبتوں سے بچانے کے لیے اپنے سرانی گھروں میں سب کچھ سہہ رہی ہوں گی۔

ابنہ آن بان، انا اور پندار کی قربانی دے رہی ہوں گی۔ یہ میرے روز کی بات ہے وہ فون پر عطا انگل سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا مگر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں گھڑائی کی کال آ گئی۔ بات شروع کرتے ہی اس نے فلیٹ کے کرائے اور اجی بائیک کی خرابی کا رونا روتا شروع کر دیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا اس کے پاس کوئی اہم خبر تھی اور وہ خبر ڈیر کرنے سے پہلے بے منت کی راہ ہموار کر رہا تھا۔ ہادی نے اسے اس حوالے سے تسلی دی تو وہ اصل موضوع

نہیک ایک گھنٹے بعد وہ ترک کیفے میریا میں ایک آرام دہ کرسی پر فیصل کے زور و جیسا تھا۔ فیصل تھری چیں سوٹ میں تھا۔ سنہری فریم والی عینک میں بڑا نفیس سا لڑکا لگ رہا تھا۔ وہ یوں بادی کو اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ "آپ یہاں کس لیے آئے ہیں۔ آپ کو ہوتا ہے ہم سب آپ سے دور رہنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں دور رہنا چاہتے ہیں؟" بادی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

"اس سوال کا جواب بڑا سچ ہے۔ آپ چپ ہی رہیں تو بہتر ہے۔"

"میں چپ رہنے کے لیے نہیں بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"میں بات کروں گا تو پھر بات بہت بڑھ جائے گی۔ آپ کو شرم آتی چاہیے اس پر..... جو کہا جا رہا ہے آپ سے بارے میں۔"

"یعنی تمہیں دنیا کی باتوں پر یقین ہے۔ اپنی بہن پر یقین نہیں ہے۔"

"آپ نے بدنام کیا ہے اسے۔ اس کی گھریلو زندگی خراب کی۔ اس کی منت حاجت پر بھی اس کا بیچا نہیں چھوڑا۔ کیا نہیں کیا آپ نے۔ آپ نے چوری چھپے اس کی تصویر بنائی اور اس ایک تصویر کی وجہ سے ہم سب کے شرم سے بچ گئے۔"

"تم لوگوں کو میں ایک تصویر نظر آئی۔ ایک جیتی جاگتی لڑکی نظر نہیں آئی۔ اس کی پوری زندگی اس کا سردار، اس کی سچائی اور کچھ نظر نہیں آئی۔" بادی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں بند کر لی ہیں۔ راتھ فیصل سے ڈر کر بچہ گئے ہو۔ جلال سے سہم کر چپ ہو گئے ہو۔ میں تمہیں اتنا گیا گزرا نہیں سمجھتا تھا فیصل اور اتنا ہے جس۔ وہاں تھادی بہن سسک سسک کر ختم ہو رہی ہے اور یہاں تم سب کچھ بھول کر عیاشیاں کر رہے ہو۔"

"آپ اپنی زبان بند رکھیں تو اچھا ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر کر سکتے تو بہن کے دل پہ کچھ کرتے۔ وہاں سسرال میں اب اس کے لیے کچھ نہیں ہوا۔ وہاں اگر وہ جلال کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہے تو صرف اس لیے کہ تم نے قرض اٹھا رکھا ہے۔ وہ تمہیں سمجھڑیوں اور بدانتوں سے بچانا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی گناہ نہیں اس کا۔"

فیصل پڑھ کر۔ "تم اس کی صفائیاں پیش کرنے والے کون ہوتے ہو۔ تمہیں کس نے اجازت دی اس کے بارے میں بولنے کی۔ وہ میری بہن ہے۔ میں اس کا نام سننا نہیں چاہتا تمہاری زبان سے۔" وہ آپ سے تم پر آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

بادی بولا۔ "اتنا دم نہیں کہیں اور دکھایا ہوتا تو کچھ کہہ دیتے۔ تم لوگ۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ تم نے جلال کے ذریعے اسے گھر میں گھسنے نہیں دیا۔ دیکھو اسے کتنا دکھ دیا۔"

"تم اپنی زبان بند کرو۔" فیصل غصے سے لرزتے ہوئے بولا۔ "چند لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ بادی پر جھپٹ پڑے گا مگر پھر اچانک ایک شخص آ کے آیا۔" کیا کرتے ہو؟" وہ

کی طرف آگیا۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ بتایا کہ جلال اور ارم میں لڑائی کی اطلاع ہے اور ارم کو پہلی بار جلال کی ڈانٹ پونگا رہنا پڑی ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ ارم کی وہی بیوقوفی تھی جو اس نے حجاب کو اس کے زندان سے نکال کر کی تھی۔

گزارش کی دوسری خبر زیادہ اہم تھی۔ اس نے بتایا۔ "آج کل حجاب کا بھائی ایک گرل فرینڈ کے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ میں نے اس کو دو تین بار گزری میں اکٹھے دیکھا ہے۔ لڑکی انڈین یا پاکستانی ہے۔ پرسوں دونوں نے میں اسکو اڑ کے قریب ایک آئینہ کریم پارلر کے باہر کار پارک کر رکھی تھی اور اس کریم کھا رہے تھے۔ کافی شوخی میں تھے دونوں اور لڑکی اسے چٹکیاں دے رہی تھی لیکن بات صرف چٹکیوں کی ہی نہیں تھی۔ وہ دونوں مقرب ایک دوسرے کو ایک بہت بڑی چٹکی بھی کالنے والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"نکاح کر رہے ہیں دونوں۔ بالکل کفرم اطلاع ہے مگر اپنے خاص ذریعے سے ملی ہے مجھ کو۔" وہ اس وقت اسلامک سینٹر میں۔ پھر تین بجے ان کا نکاح ہو رہا ہے۔ بالکل مساوی والا کام ہے۔ بس آٹھ دس قریبی لوگ شرکت کریں گے۔"

گزارش نے واقعی حیران کن خبریں سنائی تھیں۔ نکاح والی خبر وہ پورے مرقی اور ساری جزئیات کے ساتھ دے رہا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ایک طرف ماں بیمار پڑی تھی۔ دوسری طرف بہن کا کردہ گناہوں کے خلاف جھگڑ رہی تھی اور بھائی صاحب بیاہ رہا ہے۔ ہاں نہیں کہ عطا انکل کو بھی خبر تھی یا نہیں۔ فیصل کے حوالے سے بادی نے اس میں عجب سا غم و غصہ جمع ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر تک گزارش کے اس موضوع پر بات کی پھر پوچھا کیا فیصل کسی طرح ملاقات ہو سکتی ہے۔

گزارش بولا۔ "ہو کیا سکتی ہے۔ ابھی ہو جائے گی اگر آپ چاہیں تو اس وقت ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ جناب فیصل صاحب لچ فرمانے کے لیے نکلتے ہیں۔ میں اپنے آفس سے۔ آفس کے بالکل پاس ہی ترک کیفے میریا ہے جلال نوڈ والا۔ آپ ابھی آجائیں تو ابھی کے ابھی شرف ملاقات حاصل ہو جائے گا۔"

"واقعی؟"

"بند رڈ پر سینٹ جی۔"

بادی نے چند لمحے کے لیے سوچا۔ انکل عطا نے اسے ایسی جگہوں اور لوگوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا جن کی وجہ سے جلال یا اس کے کسی کارندے سے نہ بھیڑ ہو سکتی تھی۔ مگر وہ کمرے میں بند ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے سینے میں آگ سی سگ رہی تھی۔ وہ انکل فیاض سے تو نہیں مل سکتا تھا لیکن فیصل سے تو مل سکتا تھا اور اسے سمجھ سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

بھی۔ حجاب کی خاطر اس نے نمرہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور شاید اس سے بھی بڑی قربانی فیاض کی ہے۔ فیاض نے زندگی میں کسی کے سامنے سر نہیں جھکا یا تھا۔ روپے پیسے پر ہمیشہ آن ہاں کو ترجیح دی تھی۔ لیکن بنی کی خاطر اس نے بھی اپنا سر جھکا یا ہے۔ صلح کے لیے اس کی بھابھ کی شرط بھی کہ فیاض اس سے باقاعدہ معافی مانگے۔ فیاض نے معافی مانگی ہے اور رشتہ بھی قبول کیا ہے۔ شاید تم نہ سمجھ سکو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس کے لیے کتنا مشکل تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مارا ہے ہادی! اپنی بچی کی خاطر خود کو منایا ہے۔ وہ سب سمجھتا ہے کہ اس کی بچی اب جلال کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی لیکن رہنے پر مجبور ہے۔“

ہادی سناتے میں تھا۔ فیصل کا چہرہ اس کی نگاہوں میں محسوس رہا تھا اور انکل فیاض کا بھی۔ اس نے عطا انکل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تو آپ کا مطلب ہے، انکل فیاض کی بھابھ مکان فروخت کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔“

”نہ صرف آمادہ ہو گئی ہے بلکہ انہوں نے اسے خود ہی خرید لیا ہے۔ یعنی اب وہ آدمی کی نہیں پورے حصے کی مالک ہوں گی۔ یہ کاغذات وغیرہ اسی سلسلے میں تیار ہو رہے ہیں۔ پچھلے منٹ میں تمہاری سی کی تھی وہ بھی آج آگئی۔ فیاض کو پاکستانی کرنسی کے حساب سے قریباً سو سو کروڑ روپے ملے ہیں۔ اس میں سے قریباً ساٹھ لاکھ تو وہ پہلے ہی روپیہ حاصل کر چکا ہے۔ اب لگ بھگ ایک کروڑ بیس لاکھ اس کے ہاتھ میں آ جائیں گے۔ امید ہے کہ کل پچاس لاکھ بچہ بھاری گاڑی کا ہوائی ٹکٹ مل جائے گی۔“

انکل فیاض اور فیصل کے حوالے سے ہادی کے ذہن میں جو خیال برپا آ گیا تھا وہ ایک حوصلہ بخش ہوا کے جھونکوں سے آبل ہوئے لگا۔ عطا انکل کی باتیں ہر غلط جہمی کا خاتمہ کر رہی تھیں۔ ہادی کے دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگنے لگیں۔ اس نے ایک بار پھر تصویر کی نگاہ سے حجاب کی کوئل کلائیاں دیکھیں اور ان کلائیوں سے نوٹ کر گرتی ہوئی ہنسیوں کو دیکھا۔

وہ سب معمول فرسز پر لپٹی تھی۔ اس کے نیچے غائب تھا جو بیسٹ کے دروازے کے بالکل پاس بچھا تھا۔ وہ اپنا چہرہ دروازے کی چمکی دروازے کے بالکل پاس کر لیتی تھی۔ یہاں سے اسے نسبتاً تازہ ہوا کی آمد محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ”اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس درز میں باہر نکال دیتی۔ اسے لگتا کہ اس کی انگلیاں تازہ کی کلس محسوس کر رہی ہیں۔ اس بیسٹ کی ایک آہستہ آہستہ آہستہ کی طرح اس کے ذہن پر کندہ ہو چکی تھی۔ چھوٹا دار کھیلوں کی حالت، ان کی ترتیب، ان کے پھولوں کی تعداد، ان کی انگوٹھوں کے نقش و نگار، رینفریزر کا رنگ اور اس کے دروازے پر کھنی کا زرد دھونو گرام۔ منو گرام کے تین حروف۔ ہر چیز اسے ہرٹ کرتی تھی۔ اور اس کے حافطے پر نقش ہو چکی تھی۔ وہ ان میں سے کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ دو دھونو گرام آئینے بند کیے پڑی رہتی تھی۔ اس دن میں وہ بمشکل پانچ چوتھے لپٹی اور باقی کھانا کھونچ کر دروازے کی گز میں سے اٹھا کر لے جاتی تھی۔ نقابہت مل بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ سانس کا تھا۔ اس کا سانس بھٹک لگتا تھا۔ کبھی کم اور کبھی بہت زیادہ لپٹے میں جسم سے جان نکلتی محسوس ہوتی اور غصہ سے سینے آتے تھے۔ اب کبھی کبھار ایسی ہی کیفیت تھی۔ اسے لگا وہ بے

دونوں کے درمیان رکاوٹ بننے ہوئے ہوا۔ وہ براؤن سویٹر والا ایک اوجیز عمر شخص تھا۔ ہادی نے غور سے دیکھا اور حیران ہوا وہ عطا انکل تھے۔ وہ نہ جانے یہاں کیسے آن پہنچے تھے۔ انہوں نے فیصل کو دھکیل کر پیچھے ہٹایا۔ پھر ہادی کو بھی چند قدم دور کر دیا۔ دونوں پڑھے لکھے ہو۔ یہ کنواروں جیسی حرکتیں کیوں کر رہے ہو۔“ وہ بلند آواز سے بولے۔

فیصل، ہادی کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ”اس شخص کو میری نظروں سے دور کر دیں۔“

ہادی نے کہا۔ ”ہاں جی، اور ذکر دیں۔ اس کو میری وجہ سے اوقات یاد آ رہی ہے۔“

انکل عطا نے دونوں کو ڈانٹا سمجھا۔ پھر عجیب جو شیلے لہجے میں بولے۔ ”تم دونوں ہی طرح کیوں جھگڑے ہو۔ تم دونوں دراصل ایک ہی کام میں لگے ہوئے ہو۔ ایک ہی مسئلے کو حل کر رہے ہو۔ ایک دوسرے کو جانو گے تو تعریف کرو گے ایک دوسرے کی۔ سراہو گے ایک دوسرے کو۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا ڈاکٹر انکل؟“ فیصل نے پوچھا۔

”تم ابھی چپ رہو فیصل! جا کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پو اور پھر ٹھنڈا کر لو۔“

اس کے بعد انہوں نے ہادی کو ساتھ لیا اور ریسٹوران سے باہر نکل آئے۔ سائبران کی نو بونہ کار کھڑی تھی۔ انہوں نے ہادی کو اپنے ساتھ اگلی نشست پر بٹھایا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر کچھ کاغذات رکھے تھے۔ عطا کوئی رجسٹری وغیرہ تھی۔

وہ گاڑی چلا کر ایک کشادہ سڑک پر لے آئے اور پھر ایک پارک کے سامنے روکے ہوئے تھے۔ عطا انکل آگے ادر نکل آیا۔ وہ نہ تم دونوں پتا نہیں کیا کر بیٹھے۔ یہ لڑنے کا موقع نہیں بھائی! خوش ہونے کا اور ایک دوسرے کی ستائش کرنے کا موقع ہے۔“ ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”کیا مطلب انکل؟“

”سمجھ ہمارا مسئلہ تقریباً حل ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ پرسوں تک ہم اس قابل ہوں گے کہ جلال کی رقم بحشت اس کے منہ پر مار سکیں۔ کتنی کی آ رہی تھی ہمارے نوٹل میں؟“

”بھئی کوئی ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپہ۔“

”یہ تقریباً ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

”لل۔۔۔۔۔ لیکن کیسے؟“

عطا انکل نے نشست کی پشت سے ایک لگائی اور ذرا ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ”مجھے کے روز فیصل کا 50 ہے، اپنی تازہ انداز سے وہ لوگ چھ سات روز پہلے ہی پاکستان سے یہاں پہنچے ہیں۔“

ہادی حیرت زدہ تھا۔ ”آپ اس لڑکی کی بات کر رہے ہیں میرا مطلب ہے، جس کے بارے میں آپ نے اتنا

تھا کہ عمر کی بڑی ہے اور شکل صورت بھی۔۔۔۔۔“

”ہاں ہادی وہی۔“ عطا انکل کی آواز ذرا بھرا گئی۔ ”میں سمجھتا ہوں فیاض نے بڑی قربانی دی ہے اور فیصل نے

پھر فیصل کا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ "فیصل! مجھے معاف کرنا۔ میں تمہارے لیے شرمندگی کا باعث بنی۔ میری وجہ سے تمہیں دکھ پہنچے۔ اپنی باجی کی پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر یہ سب معاف کر دینا۔ اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو بھول جانا مجھے۔ سنبھال لینا خود کو۔ مجھے پتا ہے تم اندر سے بہت مضبوط ہو، خود کو سنبھال سکتے ہو۔ تم خود سنبھلو گے تو وہی بڑا سنبھالو گے تاہم بڑی باجی کو بھی اور..... بہت دنوں تک اکی کو کچھ نہ بتانا اور جب بتانا تو بہت آہستہ سنبھال کر مجھے پتا ہے تم ایسا کر سکتے ہو....."

اس کے تصور نے منظر بدلایا۔ ایک دم ایک ہیولا اس کے سامنے آ گیا۔ ایک سایہ سا، چوڑے شانے، لمبرائے بال، سنبھلے، اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن وہ وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا: "تم مرنے کی بات کیوں کرتی ہو۔ جینے کی بات کیوں نہیں کرتی ہو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ تمہیں آزاد ہونا ہے۔ ہم سب کے لیے۔ کیونکہ ہم سب کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے قدم تمہاری طرف اٹھ رہے ہیں۔ ہماری نگاہیں اس تسمت کے دروازے کو تلاش کر رہی ہیں۔ ہم تم تک پہنچنے والے ہیں۔"

"کون ہو تم؟" حجاب نے پوچھا۔
"تمہیں پتا ہے۔ میں کون ہوں۔ تمہیں پتا ہے۔ ہم ہمیشہ ملتے رہے ہیں۔ ہر زمانے میں ہر خطے میں۔ ہزار ہا روایتیں تو دلہن۔ اس نے کہا اور اوجھل ہو گیا۔

وہ سکتہ زدہ لکھی رہی۔ یہ آواز جانی پہچانی تھی۔ یہ آواز اس نے دہش کی جھللاتی شب میں سنی تھی۔ اور بحیرہ روم کے تیلے ساحل پر اور تو مسلم عالم کے اس قدیم جنگی اکھاڑے کی میز میوں پر۔

لیکن یہ آواز یہاں کیوں سنائی دے رہی تھی۔ اور یہ آخر میں اس نے کیا الفاظ کہے تھے۔ وہ کیا جانتا تھا؟
"اس سلسلے اس کے تعاقب میں تھا۔ سیمینٹیل جھیل دہا تھا۔ دھم کھار ہا تھا۔ تو جین برداشت کر رہا تھا۔ پھر بھی من نہیں لہر رہا تھا۔ وہ اسے کیا دے سکتی تھی۔ وہ اس سے کیا لے سکتا تھا؟ پھر بھی..... کیسا دیوانہ تھا وہ۔ اسے اس پر ہند۔ یا اور ترس بھی۔ بیک وقت وہ اسے بہت برا لگا اور اچھا بھی۔ اسے وہ طمانچہ یاد آیا جو اس نے اس کے منہ پر ملا تھا اور وہ پوری جان بے لرزگی۔ اسے وہ دکھ آمیز حیرانی یاد آئی جو طمانچہ کھا کر اس کی نم آنکھوں میں ابھری تھی۔ اس نے کیوں کیا ایسا؟ اس نے تو زندگی میں کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس کے ہاتھ بازو سے نہیں اٹھ رہی ہیں۔ یہ وہی بازو تھا جس کے ہاتھ پر چوٹ لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہ نہیں کیا اس چوٹ کی وجہ سے نہیں آگے سے محسوس ہوا کہ اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔

ہادی نے اپنے جسم کی ساری رقم عطا اٹھل کو فراہم کر دی تھی۔ دھیری طرف ایک قریبی اسلامک سینٹر میں بڑی کاوشی سے فیصل اور نمرہ کا نکاح ہو گیا تھا۔ اب وہ گھر جو فیاض صاحب نے بڑی چاہتوں سے بنوایا تھا۔ ان کی ملاقات یعنی نمرہ کی والدہ کا تھا۔ بہر حال ابھی نہیں اسی گھر میں رہائش پذیر ہونا تھا۔
اٹھل فیاض اور فیصل نے یقیناً حجاب کے لیے اپنی ملاقات سے بڑھ کر کربانی دی تھی۔ بیٹیوں کے سکھ کے لیے

بوٹی کے کسی ایسے طویل دورے میں جانے والی ہے جس کے بعد شاید آنکھیں ہی نہ کھل سکیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں چاہیں لیکن بھروی منحوس چھت نظر آئی جو کسی مغربیت کی طرح اس پر چمکتی چلی جاتی تھی اور اپنے پنجے اس میں گاؤ کر اس کا خون چوسنے لگی تھی۔ اس نے اپنے زخمی ہاتھ کو ہولے سے سینے پر رکھا اور آنکھیں پھر بند کر لیں۔

"ابو! کہاں ہیں آپ کیوں مجھ تک نہیں پہنچتے؟ آپ نے تو کبھی مجھے اس طرح تہانہ چھوڑا تھا۔ اسی مجھے سوا کے طور پر دو منٹ کے لیے بھگدو کر دیتی تھیں تو آپ ہفتوں ان سے خفا رہتے تھے۔ اب تو مجھے سزا کانتے پختے گزرو پکے ہیں آپ کی بیٹی مر رہی ہے اب کیا آپ اس کی پیشانی نہیں چومیں گے۔ اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں ابو؟"

وہ سوچتی رہی اور آنکھوں کے گوشے نم ہوتے رہے۔ ابو کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ بالکل جہاں جاتے۔ جیسے وہ سامنے کھڑے ہوں۔ چہرے پر پھر مایاں، آنکھوں میں نقابت، کمر خیدہ اور ہوشیار شک۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اپنا حال اسے سنا رہے تھے۔

وہ ترپ اٹھی۔ "منیں ابو! میں تو صرف اپنا دکھ بیان کر رہی تھی۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ میں جانتی تھی کہ آپ نے میرے لیے اپنی سی کوشش ضرور کی ہوگی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر حجاب والی سیاہ ڈائری میں سر کھپایا اور گاہ خود کو دیکھتے ہوئے دوستوں کے دروازوں تک بھی گئے ہوں گے۔ ان سخت فحش کالیں کی ہوں گی۔ وہ سب کیا ہو گا جو کر سکتے ہیں۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ اگر کوئی شکوہ ہے تو صرف ایک بات کا ہے ابو! آپ نے مجھ سے بات کیوں نہ کی۔ مجھ سے منہ کیوں پھیرا ابو! ایسا تو نہیں کرنا تھا آپ نے۔ آپ کو پتا ہے آپ کی بیٹی یہ نہیں سمجھ سکتی۔ اب اگر وہ مر گئی تو کیا کریں گے آپ؟ کس طرح ادا کریں گے۔ اس کی میت کے سر ہانے بیٹھ کر کتنی بھی باجی نہیں گئے آپ لیکن وہ کی تو پوری نہ ہوگی۔ مجھے اتنا اپنا نہیں جتنا آپ کا غم ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو آپ جیسے ہیے

سب..... وہ سسکنے لگی۔ گرم آنسوؤں کی زخموں پر پرینے لگے اور آنسوؤں میں ٹپک ہوتا ہے۔ وہ فریادیں کرتی رہتا ہے۔ یعنی تکلیف سے آنسوؤں سے تپتے اور آنسوؤں سے تکلیف ہو رہی تھی۔

پھر وہ دل ہی دل میں خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "ہاں ابو! مجھے خود سے زیادہ آپ کی اور امی کی فکر ہے۔ آپ کو بہت زیادہ برداشت کرنا پڑے گا۔ آپ کو بہت زیادہ دکھ ہوگا۔ میری یاد آئے گی۔ میری باتیں اور میری بد نصیبیاں آپ کو زلائیں گی۔ ہاں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو یہی سب کچھ ہو گا نا۔ بولیں ابو۔"

ابو خاموش رہے۔ اسی طرح خشک ہونٹوں کے ساتھ سر جھکائے کھڑے رہے۔ وہ بولی۔ "اگر..... کچھ ہو گیا تو آپ ایسا کیجیے گا۔ میری ساری نشانیاں ختم کر دیجیے گا۔ اپنے گھر سے میرا ہر نشان مٹا دیجیے گا۔ آپ کے گھر میں میری جو کتابیں پڑی ہیں اور میرے کپڑے اور میرے بچپن کے کھلونے سب کسی کو دے دیجیے گا۔ پھینک دیجیے گا اور میری وہ چھوٹی الماری جسے آپ نے اپنی اسٹڈی میں سجا کر رکھا ہوا ہے اسے بھی گھر سے نکال دیجیے گا۔ وہ بھی بہت برٹ کرے گی آپ کو بہت زیادہ برٹ کرے گی۔ اور پھر ابو! آپ ایسا کیجیے گا آپ فیصل اور امی کو لے کر کچھ دور سے لیے روم سے کہیں دور چلے جائیے گا۔ کسی ایسی جگہ جہاں ہم اکٹھے کبھی نہ گئے ہوں۔ بہت دن وہاں رہے گا۔ بہت زیادہ دن۔"

”ہلو..... کیا بات ہے اب؟“ وہ چومنے ہی بولی۔

”ایک کام کرنا ہو گا تمہیں۔“

وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم اب بھی یہاں ہو۔ تم ضرور کوئی بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔ جو کچھ وہاں ہسپتال کے سامنے ہوا ہے۔ اس کے بعد تمہیں اب پاکستان میں ہونا چاہیے تھا۔

تم۔ اب بھی..... ٹھیک سے جاننے نہیں ہو جلال کو۔“

”ہمردی کا شکریہ..... لیکن میں اپنے وقت پر ہی جاؤں گا۔ فی الحال تم مجھے حجاب کے بارے میں بتاؤ، وہ

کہاں ہے؟ اور کس حال میں ہے؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں۔ جلال ناراض ہیں مجھ سے۔ بات نہیں کرتے۔ تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔“

”تمہارے لیے اسے مارل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ نو یا بتا بیوی ہو پسند کی شادی ہے۔ دو چار ادائیں دکھاؤ گی تو

سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے ایک گھنٹے کے اندر معلومات چاہئیں۔ پتا کرو کہ کہاں ہے حجاب! روم میں ہے یا روم سے

دور۔“

وہ لمبے توقف کے بعد بولی۔ ”کوشش کرتی ہوں لیکن اس کے بعد مجھ سے کچھ اور نہ کہنا۔ تم نے جو کہا تھا وہ میں

نے کر دیا اب مجھے آدرا کا تنوں میں نہ ٹھہینو۔ میں بہت آپ سیٹ ہوں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں بہت آپ سیٹ ہوں۔“

اس کی آواز بلند ہو گئی (حالا کہ وہ سرگوشیوں میں بولتی تھی۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ بھی تھی۔ جیسے کوئی نشہ آور دوا لی

ہو۔)

”تم تو صرف آپ سیٹ ہو جین کچھ بے گناہ ایسے بھی ہیں جن کو تم نے تقریباً برباد کر چھوڑا ہے۔ تمہارا بہت تو

ان کے درد کا احساس ہو رہا ہو گا تمہیں۔ اگر تم فن دکھاؤ گی تو یہ احساس اور بڑھانا پڑے گا۔“

”دیکھو تم حد سے گزر رہے ہو۔ میں زیادہ برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں سچ کہتی ہوں زیادہ برداشت نہیں کر

پاؤں گی۔“ اس کی آواز میں طیش کی بلند لہر تھی اور اس نے اس کی آواز کو بھی بلند کر دیا تھا۔

”مجھے ویک ڈو مینٹ میں معلوم کر کے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے..... بس۔“ اس کے ساتھ ہی ہادی نے فون بند کر دیا۔



موسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ حجاب کی بنیادیں کمزور پڑتی جا رہی تھیں۔ کسی وقت دو غالیچے سے اٹھتی تو اس کا سر نہی

خرج پکڑنے لگتا۔ کسی وقت اسے ڈولالے کے قریب پڑے پڑے اچانک لگتا کہ کوئی میز حیاں اتر رہا ہے۔ اس

کی مدد کے لیے آ رہا ہے۔ اس کے ابو، بھائی فیصل، ماموں یا زاکر انگل۔ دوسرا تا انتظار بن جاتی۔ مگر پھر قدموں کی

چاب میز صیوں کے قریب آ کر دور چلی جاتی۔ یا پھر اسے پتا چلا کہ یہ تو کلثوم تھی جو کسی کام سے جھسٹ کی طرف آئی

تھی۔

جھسٹ میں حرارت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ حجاب کے جسم پر وہی بوسیدہ سے کپڑے تھے جو چند روز پہلے جلال

نے اسے صبا کیے تھے۔ پہلے تو کھانا بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب دو تین دن سے نہایت بہتر کھانا آ رہا

باپ اور بھائی ہمیشہ سے ایسے ہی غلام ہوتے رہے ہیں۔ اور کچھ پھر بھی کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔ یہاں بھی کچھ نہیں کیا تھا سکتا تھا کہ حجاب کی زندگی کی تاریخ اختیار کرے گی۔ ہادی کے انداز سے۔ کہ ملائی دس کے لیے ایک ایک کو جیتی تھی وہ شدید ترین ڈپریشن کا شکار اور نئی حالت میں تھی۔ کوشش کے باوجود اس کے بارے میں کسی طرح خبر نہیں مل رہی تھی۔

کانڈی کارروائیں سنیں دو دن مزید لگ گئے۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب جلال کو اس کی رقم ادا ہونا تھی اور تنازعہ ختم ہونے کے بعد اسٹامپ کیے ہوئے وغیرہ پر دستخط ہونے تھے۔

ہادی ہونٹ کے کمرے میں تھا پھر ایک ایک مل گن کر گزار رہا تھا۔ اسے عطا انگل کی کال کا انتظار تھا۔ یہ کال

دو پہر ایک بجے کے لگ بھگ آئی تھی۔ مگر جن بجے کے قریب آئی۔ عطا انگل نے بتایا کہ سارا معاملہ اچھے طریقے سے

ہو گیا ہے۔ وکیل کی موجودگی میں کاغذات پر سائن وغیرہ ہو گئے ہیں۔ فیاض اور فیصل بھی موقع پر موجود تھے۔

ہادی نے پوچھا۔ ”حجاب کے بارے میں کیا بات ہوئی؟“

”جلال کا کہنا ہے کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ بس ایک بار تھوڑی سی بے چینی ہوئی تھی اسے۔ اب وہ ٹھیک

لے رہی ہے۔ وہ اسے چند روز کے لیے روم سے میلا نوٹے کیا ہے تاکہ اس کی طبیعت بہتر ہو سکے۔“

”جموت بول رہا ہے۔ بکواس کر رہا ہے۔ وہ یہیں ہوں گی۔ وہیں درس داسکے پھر میں۔ آپ اس سے کہیں کہ

وہ ان سے فون پر بات کرائے۔“

”ہاں۔۔۔ اس نے کہا ہے کہ آج رات وہ فون پر بات کر کے اپنی خیریت کا بتا دے گی۔“

”رات کو کیوں؟ اب کیوں نہیں۔ یہاں سے میلا نوٹ کی فنانٹ اتنی لمبی تو نہیں۔“

”چلو رات ہونے میں کون سی دیر ہے ہادی! ایک دفعہ فیاض اور فیصل سے اس کی بات ہو جائے تو صورت

حال بڑی حد تک سامنے آ جائے گی ویسے جلال کا رویہ بھی بہت بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اسے پتا چل گیا ہے کہ وہ اب

زبردستی حجاب کو روک نہیں سکتا ہے۔“

”مجھے نہیں لگتا جی کہ حجاب روم میں نہیں ہوں گی۔ شاید وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہ رہا ہے۔“

”نہیں..... میرے خیال میں ایسی بات نہیں۔ بہر حال جیسے ہی حجاب کی بات فیاض وغیرہ سے ہو جاتی ہے۔

میں تمہیں فون کرتی ہوں۔“

عطا انگل سے گفتگو کرنے کے بعد ہادی بے چینی سے کورینڈور میں ٹھہرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ حجاب جتنی جلد سے

جلد آزاد فضا میں سانس لے اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ انگل عطا اور انگل فیاض وغیرہ نے اسے دیکھا نہیں تھا۔

ہادی نے اسے دیکھا تھا اور اس کی اتر حالت کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ جیسے کسی آہنی تابوت میں بند تھی اور

تازہ ہوا کے لیے تڑپ رہی تھی۔

ہادی نے ارم کو اس کے خاص نمبر پر ایس ایم ایس کیا کہ وہ اسے کال کرے۔ دس پندرہ منٹ بعد اس کی کال آ

گئی۔ ارم کی ساری اکڑ فون ختم ہو چکی تھی اور ہادی سے بات کرتے ہوئے اس کی آواز پر خوف کا غلبہ رہتا تھا۔

رہا ہوں۔ میں نے جو کہا ہے وہ سب ذہن میں رکھنا۔ تم میلاؤ میں ہو اور ایک دوست کی فیملی کے ساتھ ان کے اپارٹمنٹ میں ٹھہری ہوئی ہو۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ صرف آڈیو کال ہوگی۔"

حجاب نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ اسے لگا کہ وہ کئی برسوں بعد اپنے کسی پیارے کی آواز سننے والی ہے۔ وہ سوچنے لگی کیا ابو سے بات کرتے ہوئے وہ اپنے آنسوؤں کو روک سکے گی۔ اور اگر نہ روک سکی تو جلال کا رویہ کیا ہوگا؟

کچھ ہی دیر بعد لیپ ٹاپ کے اسکرین پر اس کے ابو کی آواز ابھری۔ "ہیلو....."

"ہیلو انکل! میں جلال بول رہا ہوں۔ کیسے ہیں آپ؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ حجاب کہاں ہے؟" ابو کی لرزتی آواز حجاب کے کانوں میں پڑی اور اس کے پورے جسم میں پھیری دوڑ گئی۔

جلال نے حجاب کو اشارہ کیا۔ حجاب نے خود کو بمشکل کیپڑ کیا اور آگے جھک کر کہا۔ "ہیلو..... ابو جی! میں حجاب ہوں۔"

"چند سیکنڈ دونوں طرف ایک نہایت جذباتی خاموشی طاری رہی۔ پھر حجاب کو ابو کی آواز آئی۔ "کیسی ہو بنی؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں..... اور آپ؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم مجھے بہت دکھ ہے۔ اس دن میں تم سے بات نہ کر سکا۔ میری طبیعت بالکل اچھی نہیں تھی۔ مجھے معاف کرنا حسب۔"

حجاب کو لگا کہ وہ بلند آواز سے رونا شروع کر دے گی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا۔ موضوع بدل کر بولی۔ "اوی کیسی ہو بنی؟"

"وہ اب بہت بہتر ہے۔ ہسپتال سے گھر آ چکی ہے۔ طبیعت کچھ اور سنبھلے گی تو پھر تم سے بات بھی کر اؤں گا۔ جلال تیار رہنا کہ تم میلاؤ میں ہو۔ وہ ابھی کب تک ہے؟"

"ابھی ٹھیک سے ہوا تو نہیں..... مگر آٹھ دس دن تو رہیں گے۔"

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

"ان کے دوست کی فیملی کے کافی بڑے اپارٹمنٹ ہے۔" حجاب نے کہا۔

"چلو..... تم واپس آتی ہو تو پھر تفصیل سے بات کریں گے۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں حسب! انھیں انسانوں سے ہوتی ہیں اصل بات یہی ہے کہ انسان غلطیوں سے سبق سیکھے۔ کچھ وقتی پریشانیاں ہیں۔ اللہ نے اب اسے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ تم نے بڑا بڑا سبق سیکھا۔ تم جس طرح چاہو گی، ویسا ہی ہو گا ان شاء اللہ۔"

"آپ بھی پریشان نہ ہوں ابو! امی اور فیصل بھائی کو میری طرف سے تسلی دیں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"مگر آواز سے بہت کمزور لگ رہی ہو۔ کتنا ہے کوئی اور بول رہا ہے۔"

تھا۔ کمزوری بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا دوپہر کے بچے ہوئے چادلوں میں سے ایک دونوں لے لیے۔ کی کوشش کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ میزچیوں کی طرف پھر قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ اپنے سلامت ہاتھ پر زور دے کر بیٹھ گئی۔ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ چاپ میزچیوں پر آئی اور پھر دروازے کے بالکل پاس پہنچ گئی۔ اس کی امید کے چراغ ایک بار ٹٹھا کر بجھ گئے۔ یہ جلال تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ جلال نے اسے دروازے کے قریب غالیے پر لیٹنے سے منع کر دکھا تھا۔ ایک دم اٹھ کر بستر پر آنے سے اسے شدید جھکرایا اور سانس پھولنے لگی۔

وہ اندر آ گیا اور دروازہ بولت کرتے دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا آج اس کا موڈ عجیب تھا۔ شاید ڈانٹ ڈپٹ والا۔ شاید جارحیت والا۔ کچھ دیر کے لیے تو حجاب کو لگا کہ وہ ایک بار پھر اس پر بل پڑے گا۔ مگر بالکل خیر حال دے گا لیکن پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور اس سے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بمشکل اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس لیپ ٹاپ بھی تھا جو اس نے میز پر رکھ دیا۔ اس نے اس کے زخموں کی چوٹ دیکھی اور تسلی بخش انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے ابو تم سے میٹ پر بات کریں گے۔"

"مجھ سے بات کریں گے؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں تھا۔

"ہاں..... لیکن ان کے ساتھ کوئی رونے دھونے والی بات نہ کرنا۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟ تم اس کا لہجہ ہے حد تک مانتا تھا۔"

"جج..... جی..... جیسا آپ کہیں گے۔"

"ان سے خوش ہو کر بولنا۔ ان سے یہی کہنا ہے کہ تم میرے ساتھ کچھ دنوں کے لیے میلاؤ آئی ہوئی ہو۔ دس دن کے لیے ہو سکتا ہے کہ زیادہ دن بھی لگ جائیں۔ اپنی طرف سے انہیں پوری تسلی دینی ہے۔"

"جیسے آپ کہتے ہیں۔"

جلال نے اپنی سیاہ شیر وانی کے کالر کو حسب عادت درست کرتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم اپنا رویہ درست کر دو تم میں بھی رویہ بدل سکتا ہوں۔ لیکن اگر کراؤ کی کوشش کر دو گی تو پھر وہ اچھا نہیں ہوگا۔ دونوں طرف کا نقصان ہوگا۔"

"میں نے آپ سے کہا ہے جلال! میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔ آپ مجھے جس طرح رکھیں گے میں رہوں گی۔ بس..... مجھے یہاں سے نکال لیجیے۔ یہاں میرے لیے ایک ایک پلی گزانا مشکل ہے۔"

جلال کی تیوری چڑھ گئی۔ لگا کہ وہ کچھ بہت سخت بولے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ "دیکھو حسب! کب کیا کرنا ہے۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ مجھے زچ کر دو گی تو پھر تمہیں بھی تکلیف ہوگی۔ ابھی چپ چاپ رہو یہاں۔ جب وقت آئے گا تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد جلال نے لیپ ٹاپ آن کیا اور بکاپر کھول کر بیٹھ گیا۔ حجاب کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میں کال مانتا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پھر دروازہ لاک ہوئے کی منٹوں آواز سن رہی تھی۔ یہ کسی آواز تھی جو سیدھی اس کے دل پر اثر کرتی تھی۔ اس کی ہاتھیں بتدریج بڑھتی چلی گئیں۔ بازو میں ٹیسس اٹھنے لگیں۔ منہ خشک ہو رہا تھا بالکل خشک۔ یہاں اسے کس نے پانی پلا تھا۔ اس نے خود ہی پانی کا گلاس لینے کے لیے سائینڈ نیکل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن گلاس اس سائینڈ نیکل پر نہیں تھا۔ وہ شاید دوسری سائینڈ نیکل پر تھا لیکن بیڈ پر کھسک کر دوسری نیکل کی طرف جانا اسے بہت دشوار محسوس ہوا۔ جیسے کوئی طویل سفر ہو۔ وہ وہیں پڑی رہی۔ اس پر ایک بار پھر رات بہت آمیز غنودگی طاری ہونے لگی۔ جسمت کی تاریکی اس کے دل و دماغ میں گہرائی تک اتر رہی تھی۔ بیداری اور غنودگی کی درمیانی کیفیت میں اس کا تصور اسے کہیں سے کہیں لے گیا۔ وہ ایک خشک ویران گہرے کنویں میں تھی۔ اس میں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ پھر کسی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ اس نے دیکھا۔ تاریک کنویں سے باہر نیلا آسمان ہے، خوشگوار ٹھنڈی ہوا پس رہی ہے۔ وہ اپنے گھر کے لان میں ہے۔ بچپن لوٹ آیا ہے۔ وہ دس بارہ سالہ لڑکی کے روپ میں ہے۔ اس نے بیٹون شرٹ پہن رکھی ہے۔ اس کے ریشمی بال ہوا میں لہر رہے ہیں۔ وہ فیصل سے لڑ بھگڑ رہی ہے۔ امی آواز دیتی ہیں چائے چاہے۔ آجاؤ۔ وہ سب لان کی میز کے گرد بیٹھ کر کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

امی، ابو، باجی، فیصل۔ سب کے چہرے بارونق ہیں۔ مسکرائیں، ہنسون سے ہنکی پڑ رہی ہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گی۔ میں بیٹون لوں گی۔ وہ ٹھٹک کر کہتی ہے۔ ابو اسے لاڈ سے اپنے ساتھ لگاتے ہیں۔ سر چومتے ہیں۔ ٹھنڈے سے جوس کا گلاس اس کے ہنسون کی طرف بڑھاتے ہیں۔

وہ جیسے تڑپ کر اپنے حواس میں واپس آگئی۔ گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ زبان منہ میں سوکھے پڑے۔ کانکڑا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے حلال جسم کو، مشکل دوسری سائینڈ نیکل کی طرف بڑھایا۔ یہاں پانی کا گلاس موجود تھا۔ نیم تاریکی میں اس نے گلاس پکڑا جابا۔ ہاتھ گلنے سے گلاس پھولدار ٹائیلوں پر گرنا اور پکنا پورا ہو گیا۔ اس کے سینے میں درد بڑھتا جا رہا تھا۔

○ چہرہ ○

بادی کا دل گہرائی کے ساتھ خست مصیبت میں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ اس نے اس کی حالت دیکھی تھی اور وہ حالات اس کے حافطے پر نقش تھی۔ رات گیارہ بجے کے قریب عطا انکل کا فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ حجاب میلاؤ میں ہے۔ قیامی کٹے ہوئے پر اس سے بات کی ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ ایک دو دن بعد وہ پھر بات کرے گی۔

بادی یہ سب مانتے کو تیار نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے ذہن میں بار بار یہی آ رہا تھا کہ حجاب روم میں ہی ہے۔ بہت مشکل میں ہے۔ کوئی بادی کے دل کو کسی میں لگا رہا تھا۔ دوس والی کوئی کی طرف کھینچ رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر ارم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی کچھ ناگامی ہوئی۔ اس کا فون آف تھا۔ کل شام اس نے بتایا تھا کہ اسے حجاب کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے جب بادی نے ایک اہم فیصلہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاشم امیرک کا نمبر پر نہیں کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس سے اس اہم موضوع پر بات کر

”بب..... بس ایک دو دن بخار ہوا تھا۔ اب اچھی ہوں۔ مجھے زیادہ لگرائی کی ہے۔ ان کا بہت خیال رکھیں۔“
”وہ بھی اب ان شاء اللہ بہتر ہوتی جائے گی۔ جو تھوڑی بہت مالی پریشانیوں آگئی تھیں وہ بھی اب دور ہو رہی ہیں۔ تمہارے ڈاکٹر انکل توقع سے زیادہ تعاون کر رہے ہیں اس سلسلے میں۔ وہ بھی تم سے ملنے کے لیے سب قریب ہیں۔ تم روم واپس آتی ہو تو پھر بات ہوتی ہے ان سے بھی۔“

جلال نے حجاب کو کھانکنا اشارہ کیا کہ وہ اب بات ختم کر دے۔ حجاب نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور کھٹکھٹ کر جلدی سے اختتام کی طرف لپکتی گئی۔ یہی کلمات کی اداسگی کے بعد باپ بیٹی نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔
بات ختم کر کے حجاب بے دم لی ہو گئی۔ اس کا رنگ ہلکا ہوا تھا۔ جیسے کوئی اداکار کوئی مشکل مشاٹ دینے کے بعد غمناک حال سا ہو کر گر جائے۔ اسے کھانسی کا شہید پڑا۔ جلال جلدی سے پانی لے آیا۔ ”کوئی بھی“
اس نے چند گھنٹے لیے اور نیچے سے سر نکال کر کرسی پر گھسیٹ لیتے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ”دیکھ حجاب! میں نے دوسری شادی کر کے کوئی غیر شرعی کام اخلاقی کام نہیں کیا ہے۔ اگر اس وجہ سے تم مجھ سے علیحدہ ہو جا سکتی ہو تو میں یہ آسانی سے نہیں ہونے دوں گا۔“
کچھ مجھ سے بن پڑا کروں گا۔ میری بات سمجھ رہی ہونا تم؟“

حجاب اثبات میں سر ہلانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔ حالانکہ وہ پوچھ سکتی تھی کہ دوسری شادی کہہ کے تو تم نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا لیکن زبردستی مجھے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر کے تو ناجائز کام کر دے۔
وہ شیروانی کا کالہ درست کر کے اور گردن کو ذرا تان کر بولا۔ ”تمہاری دہلیہ نیلی نے مجھے ایک شہینہ

کیا ہے۔ اب اگر وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ادھر ادھر سے رئیس پکڑ کر میرا قرضہ اٹا دیں گے اور پھر تمہارے ساتھ سن مالی کرنے کے لیے آزاد ہوں گے تو ایسا نہیں ہو گا۔ یہ معاملہ عدالتوں میں پہنچے گا۔ اور تمہیں پتا ہی ہے عدالتوں میں عورت کی کتنی مٹی پلید ہوتی ہے۔ تمہارے لیے طلاق حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہو گا حجاب! اس لیے میرا خلصانہ مشورہ ہے تمہیں، حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو کچھ ہوا میں سب بھولنے کو تیار ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ۔ میں تمہیں ارم سے بہت دور رکھوں گا۔ تم ایک بالکل مختلف اور اچھی زندگی گزارو گی۔ اس سارے معاملے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو۔“

”میں کیسے غور کروں جلال۔“ وہ سسکی۔ ”اس بند قبر میں، نہیں سوچنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ پلیز پہلے مجھے یہاں سے نکالیں۔“

”میں نہیں نکال سکتا۔“ وہ ایک دم گرج کر بولا۔ ”ابھی نہیں نکال سکتا۔ وہ حرامی..... خنزیر کا بچہ..... جب تک یہاں ہے میں کوئی رسک نہیں لوں گا۔ اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ پھر اس بارے میں کچھ اس نہ کرنا۔ میں نے کہا تھا کہ نہیں؟“ اس نے مشتعل ہو کر اس کے بال پکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے منہ کو اتنے زور سے دبا دیا کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ دوسری طرح کرا بنے گی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے زخموں سے خون رشنا شروع ہو گیا ہے تو اس نے اسے چھوڑ دیا اور غصے میں کھولتا ہوا باہر نکلتا گیا۔ اس کی ذہنی حالت عجیب تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ ایک

رہا تھا۔

وقت قمارات ایک بج کر چالیس منٹ۔ وہ درم کی ایک فبٹا سردرات می۔ سزیس ٹریفک سے خالی نظر آرہی تھیں۔ ہادی اور ہاشم ایک گاڑی پر سوار تیزی سے "ایون نیو" کے علاقے میں داخل ہوئے۔ یہ سرکاری گاڑی تھی۔ وہ ایک بڑا جوا کھینے جا رہے تھے۔ اگر درس والی کوٹھی میں حجاب مل جاتی تو اور بات تھی ورنہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔ (ہاشم حجاب مل جاتی اور ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیتی تو بھی وہ مشکل کا شکار ہو جاتے) ہاشم ہاتھ دھو بیٹھارم میں تھا۔ اس کا ماتحت تھامس بھی ساتھ تھا۔ گاڑی وہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ انہوں نے گاڑی میں دوس والی کوٹھی کے سامنے کھڑی کی۔ تیسری چوٹی میں پرچھونا گیت کھلا اور اس میں سے گاڑی نے اپنی صورت دکھائی۔ پولیس کو دیکھ کر وہ الٹ ہو گیا۔ ہاشم اور ہادی بھی باہر آ گئے ہاشم ایک نے گاڑی سے کہا۔ "ہمیں گھر کی تلاش لینا ہے" "وہ کیوں جناب؟" گاڑی نے بھی انکس میں پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے یہ مسٹر ہادی یہاں آئے تھے۔ یہاں سے مسٹر جلال الدین سے ملنے کے لیے ابھی انہوں نے کال بل نہیں دی تھی کہ اندر سے کسی خاتون کے چلانے کی آواز میں آگئی وہ دھڑکے لیے پکار رہی تھی۔ انہوں نے ہمیں رپورٹ کیا ہے۔"

"یہاں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ نہ کوئی خاتون ہے سر۔"

"ہمیں یہ تو دیکھنا ہے کہ خاتون ہے یا نہیں۔" ہاشم ایک نے اندر داخل ہونا چاہا۔ گاڑی نے دھڑک دیا۔

"سر! آپ کے پاس سرچ وارنٹ ہے؟" دوسرے گاڑی نے پوچھا۔

"چھپے ہو۔ یہ بنگالی صورت حال ہے۔ خاتون کی جان خطرے میں ہے۔"

"آپ مسٹر جلال الدین سے فون پر بات کر لیجیے۔" پہلا گاڑی بولا۔

"ہمیں کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم راستہ دو۔" گرائڈ بل ہاشم ایک گاڑی کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ تھامس اور ہادی بھی اس کے پیچھے تھے۔ گاڑی بہت جزیب نظر آ رہے تھے لیکن پولیس سے مزاحمت کا مطلب بھی وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

ہاشم ایک، تھامس اور ہادی نے تیزی سے کوٹھی کو سرچ کرنا شروع کیا۔ ٹہلی منزل میں گاڑی کے علاوہ ڈرائیو اور خانساں وغیرہ تھے۔ بالائی منزل پر وہ ملازمائیں بھی نظر آئیں۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد وہ ہر اسکا دکھائی دے رہی تھیں۔ ہادی نے دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں سے ایک بہن کئی کلوٹم تھی۔ شریقاں کی اطلاع کے مطابق کلوٹم یہاں حجاب کی سخت گیر نگہبان کا کردار ادا کر رہی تھی۔

ہادی کے اشارے پر ہاشم ایک نے کلوٹم کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس نے شور مچانے والی خاتون کے بارے میں پوچھا۔

کلوٹم نے صاف انکار کیا اور کہا کہ یہاں ان دونوں کے سوا کوئی عورت موجود نہیں۔ دوسری ملازمہ نامید ہوئی۔ "آپ تلاش لے لیجیے جی۔ پوری کوٹھی آپ کے سامنے ہے۔" نامید ٹری سٹی انکس بول رہی تھی۔

تھامس گاڑی اور ملازمین کے پاس کھڑا رہا۔ وہ کسی کو فون مانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ ہاشم ایک اور ہادی ایک بار پھر کوٹھی میں گھومنے لگے۔ پانچ دس منٹ میں انہوں نے چھت سمیت ہر جگہ دیکھ لیا مگر کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔

ہاشم ایک کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے ہادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو کوئی نہیں۔"

"یہ ملازمہ کلوٹم ضرور چھت جاتی ہوگی۔ اس پر تھوڑی سی سختی کر کے دیکھا جائے۔"

"نہیں۔۔۔ یہ میرے اختیار میں نہیں۔ ہم حدت تجاوز کر جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ہم زیادہ دیر یہاں ایک بھی نہیں سکتے۔" ہاشم نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔

چار پانچ منٹ بعد وہ پوری طرح باپوس ہو چکے تھے۔ ہاشم ایک نے اسے اور تھامس کو اشارہ کیا کہ اب چلنا چاہیے۔ وہ میز حیاں اتر کر گراؤنڈ فلور پر آ گئے۔ ہادی سب سے پیچھے تھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں اب بھی چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل جکڑا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ باہر نکل آئے۔ ہاشم اور تھامس عین میں تھے جبکہ ہادی کھن میں بیٹھنے والا تھا۔ اچانک اسے ایک مدھم آواز سنائی دی۔ جیسے کسی نے کسی دروازے پر زور دیا ہو۔ وہ ٹھٹھک کر ڈک گیا۔ چند لمحوں بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ یہ آواز دستک جیسی ہی تھی۔ ہاشم کو پتہ چلے گا۔ وہ ابھی مڑا اور آواز کی سمت بڑھا۔ آواز ایک چوٹی دروازے کے عقب سے آئی تھی۔ یہ دروازہ وہ ڈب۔ پہلے بھی کھول کر دیکھ چکے تھے۔ اندر ولی لائٹ آن کی۔ مدھم آواز پھر ابھری ہادی کو اندازہ ہوا کہ ایک الماری کی اوٹ میں تنگ سائینہ بھی ہے جو نیچے اتر رہا ہے۔

"مسٹر ہاشم! ادھر آئیں۔" زور پکا کر کہہ دیا۔

ہاشم دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔ آوازیں تو پیچھے کی گئیں نچلے سرے سے آئی تھیں۔ ہاشم نے اپنا سرکاری پستل نکال لیا۔ وہ دونوں چوٹی سے زینے اتر کر نیچے پہنچے۔ یہاں ایک قیسمت کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔

اندرونی سے اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہی کے بعد جو کچھ ہوا بڑی تیزی سے ہوا۔ دروازہ کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہاشم ایک کو دروازہ آن لاک کرنے کے لیے پستل سے تین فائر کرنا پڑے۔ دھماکوں سے دروازہ گونج اٹھا۔ وہ ایک تنگ کمر کا ایک نیم سرورج صوف میں داخل ہوئے۔ ہادی کی حیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ اس نے دیکھا۔ صوف کے دروازے کے بالکل پاس حجاب ایک غالیچے پر بے سندھ پڑی تھی۔ اس کے جسم میں کوئی نزکت نہیں تھی۔ بند کے پاس ایک گھڑی کے ٹوکے پڑے تھے اور پانی پھیلا ہوا تھا۔ "حجاب۔۔۔ حجاب" ہادی نے استغھوڑ ڈالا۔

ہاشم اور ہادی نے اسے اٹھ کر بستر پر ڈالا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کی نبضیں اور سانس بہت دھیمی پڑ چکی تھیں۔ ہاشم نے اپنے دونوں ہاتھ بے ہوش حجاب کے سینے پر رکھے اور اسے ایڈوائس ملٹی امداد دینے لگا۔ وہ اس کے دل کو ہسپ کر رہا تھا۔ پھر اس نے اسے ماؤتھ ٹو ماؤتھ مہیلپ دی۔ اس دوران میں تھامس نے ایبولینس کو کال کر دی۔ ہاشم کی کوششیں رنگ لائیں اور حجاب کسمائے لگی۔ وہ نیم بے ہوشی میں بیڑائی۔ "پلیز حلال۔۔۔ پلیز۔۔۔"

ہائے گا۔ اس نے دیو مالائی کہانیوں میں پڑھا تھا کہ عشق سمندر میں ڈوب جانے والے کسی اور ہی روپ میں داخل جاتے ہیں وہ اپنے محبوب کے نام کی تسبیح پھیرتے ہیں اور جنکلوں میں اٹھ جاتے ہیں۔ اس نے تسبیح تو نہیں پھیری تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ آتی جاتی ہر سانس کے ساتھ حجاب کا نام بھی اس کے سینے میں داخل ہوتا اور نکلتا تھا۔

وہ جانتا تو سب سے پہلے اسی کا خیال ذہن میں آتا۔ اس کے ذہن میں ہر وقت وہی دمسمت کے اور ایسبونس کے مناظر گھومتے رہتے تھے۔ پچھلے چند ہفتوں میں حجاب نے اس دمسمت میں جو کچھ عجیلا وہ ناقابل بیان تھا۔ اس کے والد نے اسے اپنے سرسراہٹ والہاں جانے کا حکم دیا اور وہ چلی گئی۔ اپنی جان پر ہزار ہا مصیبتیں جھیل لیں نہیں وہاں سے ملی نہیں۔ یہاں تک کہ موت کے سایوں نے اسے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ وہ شبنم تھی اور دھوپ کی زد میں آگئی۔ پھول تھی اور ٹوٹ کر جھلس گئی۔ وہی لقمہ اور حبس معلوم ہے کا سایا نکلا کون تھا۔ کا سایا نکلا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ وہ بحرِ جہاز کے آفسر کا لخت جگر تھا اور جب ویران پانیوں میں انگریزوں نے نڈ کیا۔ جب جہاز کو آگ لگی اور ہر طرف تہلکہ مچا تو حجاب نے کا سایا نکلا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا۔ "کا سایا نکلا" یہاں کھڑے رہنا جب تک میں نہ کہوں۔

ایک روز عطا اٹھل کا فون آیا۔ انہوں نے کہا۔ "ہادی! ڈاکٹر بڑے پریشان ہیں حجاب کی بیماری انہیں الجھا رہی ہے۔ وہ دس بارہ گھنٹوں کے لیے بہتر ہو جاتی ہے لیکن پھر طبیعت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ سانس کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر کو جیشیت سے جہاں تک میں سمجھا ہوں اس کی تکلیف نہ صرف کارڈک (قلبی) ہے بلکہ ریٹیکولو جیکل بھی ہے۔ دونوں طرح کے مسائل اس طرح الجھ گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔"

"سایکا ٹرنس کیا کہتے ہیں؟"

"انڈیا کا ایک معروف سایکا ٹرنس ڈاکٹر فرانسس جاب سے کونسلنگ کر رہا ہے۔ کل بھی حجاب سے اس کی ایک لمبی نشست ہوئی ہے۔ وہ آزاد گفتگو کے ذریعے اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ درحقیقت ان جذباتی طبعیتوں میں حجاب نے جلال کا اتنا دباؤ رواشت کیا ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہے۔ چھوٹی بڑی باتیں اس کے ذہن میں سمجھنے کی طرح گڑی ہوئی ہیں۔ وہ خود کو اب بھی جلال کے قبضے میں سمجھ رہی ہے۔ کبھی کبھی ایک ڈری کئی چھوٹی سی بچی کی طرح سوچنے لگتی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی ہوئی ہے کہ وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔ اسے اور اس کے گھر والوں کو عدالتوں میں بھیجے گا۔ ڈاکٹر فرانسس نے کہا کہ وہ یہ طلاق والا عمل جلد مکمل ہو جائے اور حجاب کو یقین ہو جائے کہ وہ جلال سے آزاد ہو چکی ہے تو اس کی حالت سنبھل سکتی ہے۔"

"اس سلسلے میں آپ نے اٹھل فیاض دیکھتے ہیں؟"

"ہاں..... بلکہ میں اور فیاض نے اسے ہی جلال سے ملاقات کی تھی۔ دونوں باتیں ہوئی ہیں۔ وہ پس و پیش سے کام لے رہا ہے۔"

"اب پس و پیش کیوں؟" ہادی نے تڑخ کر کہا۔ "اب وہ حجاب کو اس طرح زبردستی ساتھ رکھ سکتا ہے۔"

"ہاں..... اس کی پوزیشن تو اب بہت کمزور ہے۔ مگر اپنی اوقات ظاہر کر رہا ہے۔ عدالتی کارروائی سے ڈرانے

مجھے نکال دیں یہاں سے۔ میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گے۔ میں دعوہ کرتی ہوں۔"

ہادی نے اس کا ہاتھ تھاما۔ "حوصلہ کرو حب! ہم نکال رہے ہیں تمہیں۔ ابھی نکال رہے ہیں۔"

اس نے ہادی کی آواز سنی ہی نہیں۔ یاسی تو پیچانی ہی نہیں۔ وہ جلال کو ہی پکارتی رہی۔ "دروازہ کھول دیں جلال! میرا سانس ٹک رہا ہے۔ مجھے نکال لیں پلیز۔ میں مری جاؤں گی۔"

اسی دوران میں اوپر کونکلی کے پارچ کی طرف ایسبونس کے تیز سائرن سنائی دینے لگے۔ یہ آواز بے آسانی اس تہ خانے تک بھی پہنچ رہی تھی۔

حجاب نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ جیسے کسی نئے خیال سے ڈر گئی ہو۔ جسم بے ہوشی میں کرا رہا۔

"..... اور..... میرے امی ابو کو کچھ نہ کہنا جلال! پھر سے بھائی کو کچھ نہ کہنا۔ وہ بڑے کمزور ہیں۔ میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں جلال!"

دو منٹ بعد اسٹریچر دمسمت میں پہنچ گیا۔ ہادی نے حجاب کو ہاتھ میں بھر کر اسٹریچر پر لٹایا۔ وہ لوگ بڑی تیزی کے ساتھ اسٹریچر کو ایسبونس کی طرف دوڑاتے چلے گئے۔

حجاب کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ہسپتال کے سی سی یو میں تھی۔ دس بارہ گھنٹے میں اس کے درجنوں نمٹ ہوئے تھے اور ابھی مزید بور ہے تھے۔ ہادی اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ ہسپتال میں جا سکتا۔ اس کا رابطہ بس عطا اٹھل سے تھا اور وہ اسے ہر پل کی خبر دے رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے ہارٹ پر ایف ایف ڈی کیا تھا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ شدید ترین Anxiety اور ٹھنکن کا شکار ہونے کے بعد وہ بے ہوش ہوئی ہے اور اس کے دل کا ایک حصہ درست فنکشن نہیں کر رہا۔

ڈاکٹر کسی سرجری کی بات کر رہے تھے۔ کبھی پس میکر لگائے جانے کا امکان ظاہر کر رہے تھے سب سے بڑا مسئلہ حجاب کے سانس کی بحالی کا تھا۔ اس کی سانس ٹھیک نہیں تھی۔ وہ جیسے اب بھی خود کو اسی دمسمت میں محسوس کرتی تھی اور تنہی تنہی کمرہ 11 اپنے پیچھے پروں میں لے جاتی تھی اسے اس سنگین ڈس آرڈر سے نکالنے کے لیے سایکا ٹرنس کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔ مگر ابھی تک بے سود تھا۔

عطا اٹھل کے مطابق جلال بھی میاٹو سے روم پہنچ چکا تھا۔ اسے پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے بلایا تھا۔ وہ وہ تین گھنٹے پولیس اسٹیشن رہنے کے بعد فی الحال واپس آ گیا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ حجاب اس کی منکوحہ ہے اور وہ اپنی مرضی و رضا سے اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ چونکہ وہ آج کل بہت ڈپریشن میں تھی اور بالکل خاموش اور بے سکون جبکہ پر رہنا چاہ رہی تھی اس لیے اپنی مرضی سے دمسمت میں شفٹ ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی چوٹ کو بھی جلال نے حادثاتی قرار دیا تھا۔ لیکن حقیقت کیا ہے یہ سب کو نظر آ رہا تھا۔

ہادی کو حجاب کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ ہر طرف بس وہی تھی۔ اس نے حسن و عشق کے آن گھٹ پہلوؤں کو اپنے ہزار ہا شعروں میں لقمہ کیا تھا۔ لیکن یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ ایک دن وہ خود بھی کہانیوں جیسے بے پناہ عشق کی زد میں آ

کرتے ہوں گے۔ ابھی اسی وقت۔“

”تم مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہو۔“ وہ پوچھا۔

”میں وہ ہوں جو آج..... ابھی..... اسی جگہ..... تمہیں قتل کر سکتا ہے اور قتل ہو بھی سکتا ہے۔“ ہادی نے خونخوار انداز میں کہا۔

اس کے لمحے میں کچھ ایسی بات تھی کہ آفس کے در و دیوار میں ایک پڑھول گونج پیدا ہوئی اور اس گونج نے جال جیسے دنگ بندے کو بھی بنیادوں سے ہلا دیا اور تو اور اپنے لمحے کے آہنگ پر وہ خود بھی حیران ہوا۔ کہاں سے اتنی تھی یہ بے پناہ توانائی، کہاں سے آیا تھا یہ بے امان دبدبہ، یہ محبت کی دین تھا۔ یہ عشق کا معجزہ تھا۔ وہ تو ایک شاعر تھا۔ ایک خاموش طبع نرم شخص، اس نے زندگی میں کسی سے جھگڑا نہیں کیا تھا۔ لیکن آج وہ بولا تھا تو اس کی آواز میں نہ زور و طوفانوں اور بھرے سمندروں کی وحشتیں سم آئی تھیں۔ جلال اس کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ نیچے جھکا۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ کسی کو بلانے کے لیے کال بیل کا بزن دانا چاہتا ہے۔ ہادی نے جیب میں سے بھرا ہوا پستول نکالا اور جب در بلیغ جلال کی چوڑی چٹکی چھاتی پر رکھ دیا۔ عین دل کے مقام پر (یہ پستول گزاری نے فراہم کیا تھا۔)

”جلال! میں تجھے کہہ رہا ہوں۔ میں مار دوں گا تجھے۔ ابھی اسی وقت، اس قالین پر تیری لاش گرے گی۔ ابھی اسی وقت.....“ وہ خونخوار انداز میں بولا۔

جلال کا رنگ بالکل ہلکی ہو گیا۔ وہ ڈرنے والا شخص نہیں تھا مگر ہادی کا لہجہ پتھر کو پانی کر دینے والا تھا۔ اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور انگی ٹریگر پر تھی۔ ”تم بھی بچ نہیں سکو گے۔“ جلال کمزور آواز میں بولا۔

”میں بچتا چاہتا بھی نہیں ہوں۔ بالکل تیار ہو کر آیا ہوں۔ مجھے پتا ہے ہم دونوں کی لاشیں گریں گی۔ لیکن پہلے تیری لاش گرے گی۔ پہلے تیری گرے گی۔“ ہادی وحشی لمحے میں پتھر کا اور پستول والا ہاتھ اتنے زور سے جلال کی گردن پر مارا کہ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا اور دم بخود ہو گیا۔ اس کا پتا پانی ہو چکا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اگلے چند سیکنڈ میں وہی جھوکا جو ہادی کہہ رہا ہے۔ اس نے خوفزدہ ٹھکروں سے سیاد پستول کے خم دار ٹریگر پر رکھی ہوئی انگی کو دیکھا اور اپنا بدن ڈھکیچھڑا کر اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ اس نے شکست تسلیم کر لی ہے۔

○.....○

حجاب آزاد ہو چکی تھی۔ طلاق کا پراسس مکمل ہو گیا تھا۔ کاغذات اسے مل چکے تھے۔ اس آزادی نے اس کی صحت پر مثبت اثرات ڈالے۔ وہ پہلے سے بہتر لگتی تھی لیکن جو رنگ دل کو لگ گیا تھا وہ اتنی آسانی سے جانے والا تو نہیں تھا۔ قید و بند کے شب و روز اس کے دل کی اور بھی نظام کو بے طرح متاثر کر چکے تھے کئی موقوفوں پر تو ڈاکٹر بھی انھیں کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس کی بیماری بڑی پیچیدہ تھی اور مہلک بھی۔ عام طور پر جوان عمری میں ہارٹ ایک اور دل کی دیگر شدید بیماریاں نہیں ہوتیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے کیسوں کی شرح بڑھ رہی ہے۔

کبھی کبھی وہ چار دن کے لیے وہ بالکل ٹھیک بھی ہو جاتی تھی مگر پھر بیماری کا حملہ ہوتا تھا دل کے فنکشنز متاثر ہوتے تھے اور سانس کی آمد و رفت بڑی طرح بگڑ جاتی تھی ایک دن ڈاکٹر عطا انکس کی زبانی ہی ہادی کو معلوم ہوا کہ

کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر یہ چل نہیں سکے گا۔ میں اور فیاض کل اینڈ وکیٹ سے بھی بات کر رہے ہیں۔“

ہادی کے ذہن میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ وہ ایک تحقیق کار تھا۔ اس نے کبھی جیونٹی بھی نہیں ماری تھی۔ لیکن آج..... آج پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ جلال کو جان سے مار سکتا ہے۔

اس نے رات کا پشتر حصہ ہوٹل کی راہداریوں میں بے قراری سے گھومتے ہوئے گزارا جلال کی صورت رو رو کرنگا ہوں میں گھومتی تھی ابھی نے رات دو بجے گزاری کو بون کیا۔ وہ یقیناً کسی ٹائٹ کلب میں ہی تھا اور اپنے ٹائٹ قد کے ساتھ کسی دراز قد لڑکی کی تلاش میں تھا۔ ہادی کو پتا تھا کہ دراز قد لڑکیاں اس کا کریز ہیں۔

ہادی نے کہا۔ ”گزاری ایک کام آتی پڑا ہے تم سے۔“

”جنتاب! آپ تمہید نہ باندھا کریں۔ لڑکیاں حکم دیا کریں۔ آپ کا خادم ہر وقت حاضر خدمت کئے کے لیے تیار ہوتا ہے۔“

”ایک چیز مہیا کرنی ہے۔“

”فرمائیں جنتاب!“

”فون پر نہیں۔ اسی ریسٹوران میں پہنچو۔ ابھی اسی وقت۔“ ہادی نے کہا۔

○.....○

اس واقعے کے ٹھیک دس گھنٹے بعد ہادی، جلال شاپنگ سنٹر کے سامنے موجود تھا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ کڑا کے کی سردی تھی، ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہادی نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔ چہرے کا کچھ حصہ منظر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ شاپنگ سنٹر میں داخل ہوا اور سیدھا اس پورشن کی طرف بڑھا جہاں جلال الدین کا شاندار آفس واقع تھا۔ آفس کے بالکل قریب پہنچا تو یکے بعد دیگرے دو گارڈز نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ ان کو دھکیلتا ہوا اور دھکیلتا ہوا جلال کے آفس میں داخل ہو گیا۔ جلال ایک وسیع و عریض میز کے عقب میں موجود تھا۔ اس کا فریہ اندام بھائی ظہیر الدین بھی ساتھ بیٹھا تھا۔ شاید کسی معاملے پر بحث ہو رہی تھی۔ وہ دونوں اس طرح ہادی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ خاص طور سے جلال کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

جلال اور ہادی چند سیکنڈ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ گارڈز ہادی کی دونوں جانب موجود تھے اور اگلے حکم کے لیے جلال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جلال سے ایک اشارے پر وہ اس پر جھپٹ سکتے تھے اور ایک بنگاہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ جلال نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور گارڈز کو باہر جانے کا حکم دیا۔

”میں تم سے بالکل اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ ہادی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ایک توقف کے بعد جلال نے ظہیر الدین اور ایک سیکرٹری ٹائپ لڑکی کو بھی باہر جانے کی ہدایت کی۔ وہ دونوں آفس میں تیار ہو گئے۔

ہادی، جلال کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔ جلال اب سنبھل گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے سرخی جھلکے لگی تھی۔ ہادی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔ ”تمہیں ایک کام کرنا ہو گا جلال! حجاب کو طلاق کے کاغذوں پر چھوڑنا۔“

بادی نے ایک اور ادائیگر سوئی ہوئی حجاب پر ڈالی۔ تصویر ہی تصور میں اس کے ہاتھ کو چھوا اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پلٹ گیا۔ اس کے دل میں نیک تمناؤں اور دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔



بادی اب پاکستان میں تھا۔ لاہور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ جو سیر و تفریح کے لیے پاکستان سے نکلا تھا کتنا بڑا کھانڈے لکڑا ہوا ہے۔

اب پھر وہی شب و روز تھے۔ وہی معمولات، وہی روزمرہ کے مسائل، وہی شیوہ بھائی کی Do More کی باتیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور پریشانیاں۔ فرق صرف ایک تھا۔ اب بادی کا قلم روانی سے چل رہا تھا۔ وہ لکھ رہا تھا مسلسل لکھ رہا تھا۔ وہ بہت کچھ روم میں چھوڑ آیا تھا لیکن وہاں سے قلم لے آیا تھا اور قلم کی روانی لے آیا تھا اور یہ دانی موتی بکیر رہی تھی۔ تخلیق کے خشک ہو جانے والے سوتے اب تازہ پانیوں کو پھمال دے رہے تھے۔ ایک روز ایک کرب تھا۔ ایک نرس تھی، جو شب و روز چلتی تھی اور اس کو لکھنے پر ابھارتی تھی اور وہ لکھتے تھائی کی حسین سہا سہ کے قصیدے، روشن پیشانی کے نغمے، نچلا ہونٹ ہولے سے دانٹوں دبانے کی آواز۔ اور اس ادا کی سحر کاریاں اور وہ ہزاروں میل دور چینی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے کبھی کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کبھی منیر نیازی کے ڈیسر سے الفاظ کو لکھ کر برہنہ کر اس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ چلی بات ہی آخری تھی۔ اس سے آگے پڑی نہیں۔ ذری ذری ایک نسل تھی جیسے دیوار پہ پوری چڑھی نہیں۔

گاہے گاہے عطا انکل سے منیٹ پر یا فون پر اس کا رابطہ ہو جاتا تھا۔ حجاب کی حالت جوں کی توں تھی۔ کبھی چہرہ زخموں کے لیے سنبھل جاتی لیکن پھر کامیابی کا ایک دورانیہ آ جاتا جو چند گھنٹے یا دو تین دن جاری رہتا۔ انکل فیاض فیاض اب اسے سرحد پار آسٹریا لے جانے کا سوچ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں اس کا بہتر علاج ہو پائے گا۔ ان کی نفسیاتی ٹرینسٹ بھی بدستور جاری تھی۔ حجاب کی اگلی صحت کے حوالے سے اچھی اطلاعات تھیں۔

بادی کی خوشی سے گجرات میں انکل فیاض کے چاہنے کا ایک اچھا گام کھل گیا تھا۔ پات کا مختار نامہ تھیں۔ بات میں انکل فیاض کے ایک بھائی کے پاس تھا، ابھارا جسری وغیرہ میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ بادی نے اس کو رابطہ براہ راست عطا انکل سے کر دیا اور خود ہی اس سے نکل گیا۔

حجاب کی صحت کی صورت حال کے علاوہ بھی روم سے چیدہ چیدہ خبریں عطا انکل کی زبانی بادی تک پہنچتی رہتی تھیں۔ ظہیر الدین کا اپنے بڑے بھائی جلال الدین سے تازہ ہوا تھا اور وہ طبعاً گھر خیر رہا تھا۔ اب اگلا قدم شاید ذرا بار کی طبعی کا تھا۔

چند روز بعد بادی کو جلال کے حوالے سے ایک اور اہم خبر ملی۔ پتا چلا کہ جلال اور اس کی نوبیا بتا ارم میں انتہائی فطرت پیدا ہو گئے ہیں جو دن بہ دن شدت پکڑ رہے ہیں۔ جلال کو جلال نے ارم سے مار پیٹ بھی کی ہے۔ اس کا سبب کوئی ایسا انکشاف ہوا تھا جو حال ہی میں جلال پر ہوا تھا۔ بادی کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ انہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہاں گزاری نے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کی ہو۔

اس کے بارے کے ایئر ٹک سسٹم کو کپڑ کرنے کے لیے اس کے سینے کی جلد میں جو پیں سینکڑ لگایا گیا تھا وہ اُتار دیا گیا ہے اور وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہی ہے۔ مگر یہ بہتری کب تک رہے گی ڈاکٹر یقین سے کچھ نہیں کہہ پاتے۔

بادی کے قیام میں اٹالین ایکسی نے جو بنگالی توسیع کی تھی وہ بھی اب ختم ہونے والی تھی۔ اس کے متبادل کاغذات تیار ہو چکے تھے اب اسے ہر صورت میں اٹلی کو چھوڑنا تھا اور روم سے جانا تھا۔ وہ جانے سے پہلے صرف ایک بار حجاب کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے عطا انکل سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ عطا انکل سے اب وہ بے تکلف گفتگو کر لیتا تھا۔ عطا انکل بھی بادی کے دل کے معاملات کو کافی حد تک جان چکے تھے۔ اس عجیبیت کی خوشبو انہوں نے بڑی وضاحت سے محسوس کر لی تھی جو بادی کے دل میں حجاب کے لیے موجود تھی۔ وہی محبت جو ہر مصلحت ہر صورت حال سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ اب ان کے کبھی بھی بالکل دوستانہ لہجے میں بات کر لیتا تھا۔ اس نے جب عطا صاحب کو بتایا کہ وہ جانے سے پہلے ایک بار حجاب کو دیکھنا چاہتا ہے تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ عطا صاحب کو وہ انکار نہیں کر رہے تھے۔ کچھ سوچنا چاہتے تھے۔

وہ جنوری کی ایک سردرات تھی۔ روم کا درجہ حرارت دو تین ڈگری سے زیادہ نہیں تھا۔ غنڈی ہوا چل رہی تھی۔ عطا صاحب کا فون آیا۔ آج رات بارہ بجے بعد حجاب کے پاس ہسپتال میں صرف میں ہوں گا۔ تم بارہ بجے کے بعد جب آنا چاہو، آ سکتے ہو لیکن بہتر یہ ہے کہ حجاب کے سامنے نہ آؤ۔

"نہیں انکل! آپ بے فکر ہیں۔ میں بس دور ہی سے دیکھ لوں گا۔"

وہ ہسپتال پہنچا تھا۔ اور اس نے حجاب کو دور سے دیکھا تھا، ایک کمر کی میز سے۔ وہ سفید بستر پر لیٹی تھی۔ کسی اچھے اچھے راج جس کی طرح۔ پیشانی کی چمک ماند تھی مگر بالکل اوجھل نہیں تھی۔ رخسار پر اب خراشیں نشان سارہ گیا تھا۔ بلکہ رنگوں سے بنائی گئی وہ ایک تازہ تصویر نظر آتی تھی اور بادی اب واپس جا رہا تھا۔ اپنے دل کی بات دل میں لیے۔ اسے بتائے بغیر کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ ایسی محبت کہ جس کو لفظوں میں بیان کرنا اس جیسے قلم کار کے لیے بھی ممکن نہیں۔ وہ اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے لفظوں کے انبار بھی لگا دیتا تو اس محبت کی نیم کا حق بھی ادا نہ کر پاتا۔ وہ محبت کی اس حسین صورتی کے سامنے کسی بیماری کی طرح لب بستہ کھڑا رہا۔ دیکھتا رہا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ کیا یہ اس کا آخری خراج عقیدت ہے۔ کیا اب وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ اس نے سوچا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد عطا انکل بھی خاموشی سے اُٹھ کر باہر آ گئے۔ بادی نے سرگوشی میں کہا۔ "انکل! آپ نے کمر کیا اور دروازے کھلے کیوں رکھ چھوڑے ہیں۔ میں تو کمر کی کھشے میں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔"

"اس کی وجہ تم نہیں ہو۔" عطا انکل نے کہا۔ "یہ ویسے ہی کمر کیا دروازے بند نہیں کرنے دیتی۔ اسے وحشت ہونے لگتی ہے۔ یہ اسی خفی کا نتیجہ ہے جو جلال نے اس پر روا رکھی ہے۔"

بادی ایک آنکھ کھینچ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا۔ عطا انکل کے تاثرات سے بھی کچھ ظاہر تھا۔ کسی وقت کوئی یہاں آ سکتا تھا۔

پیشانی کا چاند چمک جائے۔ ہونٹوں کے پھول کھل جائیں اور پھر دھن کی کسی اور جھمکاتی رات میں، وہ ویسے ہی کسی خوش رنگ روشنی کی طرح جھلکائے۔ ہواؤں میں تیرے، پانیوں کو کھکشاں بنائے۔

اور وہ ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ انگل فیاض اور فیصل اسے لے کر وینس چلے گئے تھے۔ وہاں عطا اٹکل نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے اسے ایک نیم پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرایا تھا کہا جا رہا تھا کہ اس امریکن ہسپتال میں حجاب کو بہترین طبی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں اور اگر خدا نخواستہ ضرورت پڑی تو اسے اسی ہسپتال سے آسٹریا یا جرمنی بھی شفٹ کیا جاسکے گا۔

ایک روز ایک ایسا فون آیا جس نے اسے حیران کر دیا۔ یہ نئی سے حجاب کے بھائی فیصل کا فون تھا۔ دیکھتے ہی ادا نگینی کے فوراً بعد اس نے کہا۔ ”میں آپ سے معافی مانگتا چاہتا ہوں ہادی صاحب!“

”کس بات کی؟“

”میں نے ریستوران میں آپ سے بدتمیزی سے بات کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل میں باتوں کے بتلاؤ دے گئے تھے۔ ایک عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ میں بہت زیادہ ڈپرہیں تھا۔ مجھے کم از کم باقی کے ساتھ تفصیل سے بات کر لینی چاہیے تھی۔“

”ہاں فیصل! مجھے بھی یہی افسوس تھا۔ تم اگر غصہ سے دماغ کے ساتھ حجاب سے بات کر لیتے تو بہت کچھ واضح ہو جاتا۔ وہ بہت پاک صاف سوچ کی مالک ہیں فیصل! بہت آئسٹ اور سچی۔ مجھ سے وہ تصویروں والی غلطی ضرور ہوئی۔ میں اس کے علاوہ ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح ملنے رہے ہیں۔ بہر حال فیصل! مجھے اپنے اوپر بھی بے حد افسوس ہے میں نے بھی ریستوران میں تم سے غلط رویہ اختیار کیا۔“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“

”بات تھی فیصل! میں نے تمہیں اور انگل فیاض کو بے رحمی کے طعنے دیے۔ مجھے شکوہ تھا کہ آپ کی طرف سے دشمنی نہیں ہو رہی جو ہونی چاہئے تھیں۔ راستے میں عطا اٹکل نے مجھے بتایا کہ آپ لوگوں نے حجاب کی خاطر اپنے سر کی چھت کھٹکھٹ کر دی ہے۔ آئی ایم ریلی ویری سوری فیصل۔“

”میشن ٹاٹ ہادی صاحب! آپ کی طرف سے بہت اچھا بھی تو ہوا ہے۔ جو کام میرے کرنے والا تھا وہ آپ نے کیا۔ پاکستان آنے سے پہلے آپ جلال سے ملے۔ اس کو راور امت پر لائے۔ اسے سپر پراسن کے لیے لے آئے۔ مجھے تین چار روز بعد ہی اس کا پتا چل گیا تھا۔ میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔“

”وہ مجھے ایک اچھا دوست سمجھتی ہیں اور میں نے اسی دوستی کا تمہارا معمولی سا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔“

”وہ موضوع بدل کر بولا۔“ اب ان کی طبیعت ٹھیک ہے؟

”دو تین دن سے کافی بہتر ہیں۔ لیکن اب پتا نہیں ہے بھڑکی کتنے دن چلے گی۔ بس ہر وقت ایک ہلکا سا کھارہ ہوتا ہے۔ تین چار روز تک ایک سینئر سرجن ڈاکٹر بھی طواری سے یہاں آ رہا ہے۔ وہ بھی باقی کا سوائے کمرے کا۔ فیصل کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ہادی نے اسے منہ لگی قیمت دی تھی اور ساتھ ساتھ اسے پابند بھی کیا تھا کہ اب وہ ارم کے اپارٹمنٹ والے معاملے کو ارم کے خلاف ہرگز ہرگز استعمال نہیں کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو پھر ناجائز مداخلت والا وہ کیس فوراً کھل جائے گا جو ہاشم ایرک کے پاس اتوا میں پڑا ہے۔ (وہ پہل بھی ابھی تک ہاشم کے پاس تھا اور فون پر بتائی گئی وہ ویڈیو بھی جس میں گزاری نے پہل کی ملکیت کا اعتراف کیا تھا۔)

ہادی نے اگلے روز صبح میں گزاری سے رابطہ کیا اور اس سے باز پرس کی۔ اس نے قسمیں کھا کر کہا کہ اس نے اس سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھی ہوئی ہے اور ہمیشہ رکھے گا۔ اس نے ہادی کو بتایا۔ ”جناب! میری معلومات کے مطابق ارم اور جلال کے اختلافات کبھی اور وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس شخص کے کیڑا کوئی فون کال بھی ہے جو ارم کو کس کی رات اپنے کمرے میں لے جانے والے کو کر رہی تھی۔ اس کی آواز جلال کے کانوں تک پہنچی تھی اور معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ یہ باتیں ایک ملازمہ کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں۔“

ہادی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے وہ آخری فون کال یاد آتی جو ارم نے اسے کی تھی۔ وہ اس وقت آوروں کے زیر اثر تھی۔ ایک دم انہی آواز میں بولنے لگی تھی۔ خود ہادی بھی حیران ہوا تھا۔ یقیناً یہی وہ فون کال تھی جس کا ذکر اب گزاری کر رہا تھا۔ ہادی سوچنے لگا تو کیا اسی کو مکافات مل گئے تھے؟ ہادی ارم کو اسی کے بتلوں میں جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے روم میں ارم کو یقین دلایا تھا کہ حجاب، جلال کے کمرے سے نکل آئی تو وہ اپارٹمنٹ والے معاملے کو بنیاد بنا کر ارم کو کسی کام پر مجبور نہیں کرے گا اور نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دے گا اور وہ وعدے کا پاس کرنے والا بندہ تھا۔ ارم اب کسی اور کی نہیں اپنی غلطی کی وجہ سے مصیبتوں کا شکار ہو رہی تھی۔ اسی حوالے سے چار پانچ روز بعد ایک اور خبر ہادی کو ملی۔ یہ خبر عطا اٹکل نے ہی پہنچائی تھی۔ اور یہ نئی تھی۔ عطا اٹکل نے فون پر بتایا۔ ”جلال! جیل میں ہے۔“

”وہ کیسے؟“ ہادی حیران رہ گیا۔

”اس نے ارم سے مار پیٹ کی ہے۔ ارم کا جبر انٹو گیا ہے۔ ہسپتال میں Pins وغیرہ لگا کر اس کی ہڈی جوڑی گئی ہے۔ اس نے جلال پر کیس کرا دیا ہے۔ اب وہ جوڈیشل ریہائز پر جیل میں ہے۔ گتا ہے کہ ایک ڈیڑھ سال کی سزا تو اسے ضرور ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ ہو جائے۔ اس کا سابقہ ریکارڈ بھی اسے مشکل میں ڈالے گا۔ حجاب کے ساتھ اس کا سلوک اور اسے مسلسل بند رکھنے کا واقعہ بھی پولیس کے ریکارڈ پر ہے۔“

جلال کو اس کے کمروں کی سزا مل رہی ہے۔ اس نے مذہب کو مسم کی ناک بتا رکھا تھا، اور اسے اپنے مطلب کی سزا مل رہی تھی۔ اس کی فطرت اپنے بڑے بھائی فیروز سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اٹھانے دو تھے، اندر مضمون ایک ہی تھا۔

ہینش کو مار کر فیروز تو سخت سزا سے بچ گیا تھا مگر اب لگ رہا تھا کہ جلال آسانی سے نہیں چھوٹ سکے گا۔ یہ کافی اہم خبریں تھیں لیکن ہادی کے لیے اتنی اہم نہیں تھیں۔ اس کے دل و دماغ میں تو بس ایک ہی لہر چل رہی تھی۔ ایک ہی خیال۔ ایک ہی فکر۔ ایک ہی دعا۔ ایک ہی آس۔ وہ ٹھیک ہو جائے۔ وہ جی اٹھے۔

ہوئے تھے۔ ہر روشنی جیسے سسکیاں بھر رہی تھی اور ان ہزار ہا روشنیوں کے آنسو آبی گزرگاہوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ حجاب کی حالت ایسی تھی کہ عطا انگل اسے لینے کے لیے ایئر پورٹ بھی نہیں آسکے تھے۔ وہیں پہنچنے کے بعد فون پر عطا انگل سے رابطہ ہوا۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں ہسپتال کا ایڈریس اور کمرے کا نمبر وغیرہ بتایا۔

ہادی ہسپتال پہنچا۔ اس کا دل جیسے پسیلاں توڑ کر باہر آ جاتا چاہتا تھا۔ اس نے چاہتیں حجاب کو کس حالت میں دیکھیں تو کمرے میں اس کی نگاہ عطا انگل پر پڑی۔ ان کی آنکھیں سرخ اور سوتی ہوئی تھیں۔ ایک طرف فیصلہ یوار کے سہارے خاموش کھڑا نظر آیا۔ اس کا چہرہ بھی ڈکھ کی آماجگاہ تھا۔ انگل فیاض ایک کونے میں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔

عطا انگل نے ہادی کو گلے سے لگایا۔ ”انگل کیسی ہے حجاب؟“

”خود کچھ لو۔“ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ہسپتال کا براؤن حفاظتی لباس پہن کر اور ماسک لگا کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے کی کھڑکیاں بھی حجاب کی وجہ سے کھلی رکھی گئی تھیں۔ ہادی کے تصور میں تھا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنو گی۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور ایک لمحہ ہی جیسا۔ لیکن اس کی ظاہری شکل و صورت میں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ ہاں چہرے کا رنگ گواہی دیتا تھا کہ اس کی حالت بہت اچھی نہیں۔ وہ بلکے بستر پر نیم دراز تھی۔ بازو میں دو ڈرہس لگی تھیں۔ سر ہانے کی طرف ہارٹ ریٹ مانیٹر اور دیگر میڈیکل ڈوائسز لگے تھے۔ آنکھیں ماسک جو شاید کچھ دیر پہلے اس کے منہ پر تھا اب ایک طرف پڑا تھا۔

عطا صاحب نے اسے ہادی کے آنے کی اطلاع پہلے ہی دے دی تھی۔ اس لیے وہ کچھ زیادہ حیران نہیں ہوئی۔

”خوب ہوئی آنکھوں سے ایک ٹک سے دیکھتی رہی تو ہادی اس کے قریب کرسی پر جا بیٹھا۔ ”ہیلو حجاب!“

”خوب ہادی! کیسے ہیں آپ؟“ اس نے جھکی مسکرائی کے ساتھ پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں اور اللہ نے چاہا تو آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”اگر ٹھیک ہوں تو میں ضرور ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ وہ ایک بار پھر ہولے سے مسکرائی۔

ہادی کو معلوم تھا کہ اس کی باری میں ایسے وقفے آتے ہیں جب وہ ایک دم بھلی چلتی آگے نکلتی ہے، بلکہ خوراک بھی لینا شروع کر دیتی ہے۔ یہ بھی یقیناً ایسا ہی وقت تھا۔ ہادی نے نرمی سے اس کے ہاتھ کو چھوا اور تسلی بخشی کے بولے۔ ”وہ اس کے بولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہوئی۔“ اس نے آپ سے ایک دو باتیں کرنا ہیں لیکن ابھی نہیں۔“

”ٹھیک ہے حجاب! میں ادھر ہی ہوں۔ ادھر ہی رہوں گا۔ جب تک آپ ٹھیک نہ ہو جائیں۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر شکستہ مسکراہٹ ابھری۔

چند منٹ بیٹھ کر ہادی باہر آ گیا۔ انگل فیاض قسم کی تصویر بنے سامنے کھڑے تھے۔ ہادی نے ان سے ہاتھ ملایا

ہادی نے اس سے تسلی بخشی کی باتیں کیں۔

فیصل کے فون کے بعد ہادی کو اپنے دل کے بے پناہ بوجھ میں کچھ بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ حجاب سے اس کی ایک طویل نشست ہوئی ہے۔ اور اس نے اس کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ سب کچھ باتیں تھیں۔ انٹرنیٹ پر ہادی اور حجاب کے پڑانے رابطے، ہادی کا حجاب سے ملنے کے لیے آئی۔ وہیں کے بولیں بھی حجاب کے ساتھ رہتا اور پتا نہیں کیا کچھ۔ جلال سے ہادی کی فیصلہ کن ملاقات والے واقعے نے بھی فیصل کو متاثر کیا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بس اتنا ہی معلوم ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عطا اور ہادی نے مل کر حجاب کے لیے کچھ ٹھیک و دو کی تھی وہ اسے معلوم نہیں تھی۔ اور ہادی کے خیال میں یہ اچھا ہی تھا۔

وہ فروری کی ایک غنڈی شام تھی۔ مقامی ہوٹل میں ایک شاندار تقریب ہو رہی تھی۔ ہادی کے گیتوں اور ان کی کتاب ”بے نوا“ کی زونما کی تقریب تھی۔ اس تقریب کی ساری فائینل سٹو بھائی نے کی تھی۔ معززین شریع تھے۔ کیمروں کی فلش لائٹس چمک رہی تھیں۔ ہر طرف گہما گہما تھی۔ پچھلے چند دنوں میں جلدور میت نگار ہادی کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اسے خوشی سے پھولا نہیں سنا چاہیے تھا مگر وہ اس رنگارنگ تقریب میں بھی بالکل اُداس اور کھویا ہوا تھا۔ جیسے اسے زبردستی کچڑ کر یہاں بٹھایا گیا ہو۔ اس کی سوچوں کے ہر دھارے کا رخ حجاب کی طرف تھا۔ پچھلے دن سے حجاب کی طبیعت اچھی نہیں چل رہی تھی۔

تقریب اختتامی مراحل میں تھی جب ہادی کے فون پر ڈاکٹر عطا کی کال آئی۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

انہوں نے کہا۔ ”ہادی! اس کی حالت اچھی نہیں۔ دو تم سے ملنا چاہتی ہے۔“

یہ خبر نہیں ایک بار وہی دھماکہ تھا جس نے ہادی کے دل و دماغ کو آڑا کر رکھ دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں جا رہا ہوں۔ حجاب کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ اس نے سرگوشی کی اور تقریب چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔

سات آٹھ دن پہلے ہی اس کے پاسپورٹ پر نیا ”شہین حسین“ ویزا لگا تھا۔ اسے صرف ٹکٹ کی ضرورت تھی۔ شیخو بھائی نے بزمگ وڈ کر کے سارا انتظام کر دیا۔ اس نے اپنی والدہ اور بھائی کو صورت حال سے آگاہ کر کے جانے کی اجازت لی اور اگلے روز رات کو ان کی لیے پرواز کر گیا۔

دوران پرواز اس کا دل مسلسل کسی بے رحم شے میں جکڑا رہا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں اور سینے میں ایسا غبار تھا جو اس کا گھبراہٹ رہا تھا۔ بالکل جیسے حجاب کا دم گھٹتا تھا اور وہ بالکل زرد ہو جاتی تھی۔ اس نے اسے کیوں بلایا تھا۔ یہ سوال بھی بار بار ہادی کے ذہن میں ابھرتا اور ڈوبتا تھا۔

جس وقت ہادی مادکو پولو ایئر پورٹ پر اترنے کے بعد ایک اندین سردار کی ٹیکسی میں وینس پہنچا رات کے نو بجے تھے۔ وہی ہی جگہ کافی رات جب ہادی اور حجاب پہلی بار ایک سڑک پر ملے تھے۔ لیکن آج سارے شہر بھرے

بہرنگا گیا تھا لیکن اسے اتارنا پڑا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ SaNode کے سنٹل بڑی تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب وہ کسی بھی وقت ختم ہو جائیں گے۔ کیوں ختم ہو جائیں گے اس کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ جس چیز کی ابتدا کے بارے میں ہم آج تک نہیں جان سکتے اس کی ابتدا کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں۔

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ بہت سرد اور بوجھل۔ انکل فیاض مسلسل تین دن سے ہسپتال میں تھے۔ عطا انکل نے بہن کو انہیں گھر بھیج دیا تھا (یہاں وہ لوگ عطا صاحب کے ہی ایک پرانے دوست کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تین دن پہلے تک حجاب کی والدہ صوفیہ بیگم بھی یہاں تھیں۔ اب انہیں سمجھا بھجا کر واپس روم بھیج دیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ حجاب سنبھل رہی ہے۔)

فیصل "آرام گاہ" میں کچھ دیر سونے کے لیے چلا گیا تھا۔ عطا انکل باہر ابلی میں بیٹھے تھے۔ ہادی کمرے میں باب کے پاس تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ ٹھہری آواز میں بولی۔ "ہادی! میں آپ سے مخفی مانتا چاہتی ہوں۔"

"کس بات کی؟"

"آپ کو بتا ہے۔"

"مجھے نہیں پتا۔ اور شہ کوئی ایسا بات ہے۔"

"ہے ہادی! ہے۔" وہ کمرہ کر بولی۔ "میں نے آپ کے منہ پر طمانچہ مارا ہادی! میں اس وقت مریکیوں نہ گئی۔ ان غرق نہ ہو گئی۔ کاش ایسا ہو جاتا۔" وہ سسک پڑی اور اس نے اپنا ہاتھ ہادی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"بس اتنی سی بات کے لیے مجھے اتنی دوسرے بھگایا ہے۔" ہادی زبردستی مسکرایا۔

"میں اتنی سی بات نہیں ہے ہادی! آپ مجھے متکلف کریں۔ یا مجھے مزا دیں۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ زندگی بھر کی ہر بات میں اس کا ہاتھ تھا تو کس پر..... کیوں میرا ہاتھ ہی وقت ٹوٹ نہ گیا۔"

"وہ ایسا وقت تھا حجاب! جب آپ اپنے حواس میں نہیں تھیں اور شاید میں بھی نہیں تھا۔ میں آپ کو زبردستی لے جاتا جا رہا تھا۔ کمرے خیال میں آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ اس کا رد عمل یہی ہوتا۔"

"نہیں ہادی! آپ مجھے دل کے معاف کریں اور اگر نہیں تو مجھے اس قصور کی مزا دیں۔"

ہادی نے گہری سانس لی اور اس کا ہاتھ چپٹا کر مسکرایا۔ "اچھا سوچتے ہیں اس بارے میں بھی۔"

"نہیں ہادی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں....."

ہادی نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی بات نہ کہنا حجاب! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے لیے میں اس کی ٹپ تھی کہ حجاب بھی چوتھہ کر رہی تھی۔

اس نے اس کے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ کتنی تیز اور تیز تھی کہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بھی دیکھتا رہا۔ اس کی ٹھہری خاموشی میں وال کا اک کی نہایت حسین تک سنائی دیتی تھی۔ کمرے میں اور کوریدور میں بہت

گہری دو دھار روشنی تھی۔ وہ بیسی آنکھوں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "ایک بات پوچھوں۔"

اور تسلی کے بول بولے۔ فیصل ایک طرف بیٹھا بچکیوں سے رو رہا تھا۔ عطا انکل اسے دلا سہارے رہے تھے۔ ہادی بھی ان کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے فیصل کو اپنے ساتھ لگایا اور اسے حوصلہ مندی کی تلقین کی لیکن حوصلہ اس کے اپنے اندر بھی نہیں تھا۔ فیصل کی آنکھیں تر ہر تھیں۔ بین کے لیے اس نے کیا کچھ کیا۔ ان چابی شادی تک کی لیکن وہ پھر بھی موت کے منہ میں تھی۔ ہاں ہنسیوں کی خوشی کے لیے باپ اور بھائی اسی طرح نیلام ہوتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہادی اور عطا انکل باہر ہسپتال کی لابی میں بیٹھے تھے۔ عطا انکل نے وکیر آواز میں کہا۔ "ہادی! وہ ختم ہو رہی ہے۔ ڈاکٹروں کے خیال میں اب اس کے پاس چند دن سے زیادہ نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب انکل؟" ہادی کی جھنجھکی مچی گئی۔

"اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ بیماری بہت عکین صورت اختیار کر چکی ہے۔ اگر عکین ہر جن نے بھی تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ غائباب اسے کہیں باہر لے جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا ہے۔"

انکل کا گھبراہٹ بھرنا دیکھا اور وہ جملہ مکمل نہ کر سکے۔

"لیکن اسے ہے کیا انکل؟"

"یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ آسان لفظوں میں یہ سمجھو کہ ہمارے دل کا لپٹا ایک الیکٹرک نظام ہوتا ہے۔ دل کے ایک حصے میں قدرت نے کچھ خطے ایسے پیدا کر رکھے ہیں جو دل کو دھڑکنے کے لیے برقی توانائی دیتے ہیں۔"

ہاںکل بجلی کے کرنٹ جیسی طاقت۔ ہماری زبان میں اسے SaNode کہتے ہیں۔ یہ Node ہی وہ اصل وہ زندگی ہے جس پر ہماری سانس آکر اپنے ہاتھ کھڑے کر دیتی ہے۔ یہ "زندگی" قدرت کا ملہ سے ماں کے پیٹ میں حمل کے تیسرے چوتھے ماہ اچانک وجود میں آتی ہے اور پھر انسان کی طبعی عمر تک جاری و ساری رہتی ہے۔ یہ کہہ کر

ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں تاکہ انسان سانس کو جتنا زیادہ جانتا ہے اتنا ہی خدا کے وجود کو زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

"تو کیا حجاب کے ہارٹ کے اس نظام میں خرابی ہے۔"

"خرابی ہی نہیں بہت بڑا بڑیک ہے ہادی۔" عطا انکل نے بے حد افسردہ لہجے میں کہا۔

"مجھے کچھ بتائیں انکل! میں سب جانتا چاہتا ہوں۔"

"یہ تمہاری سمجھ سے بالا ہو گا ہادی! اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ بس یوں سمجھو کہ SaNode زندگی کا رچرچہ ہے۔ اس کو قدرت کا چپس میکر بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے پیدا ہونے والی لہریں ایک جھونے سے واسطے

کے ساتھ باریک رگوں کے ایک اور نظام تک پہنچتی ہیں۔ جسے ہم HisPurkinji کہتے ہیں۔ یہ نظام ہمارے دل کو دھڑکا تا ہے لیکن یہ نظام بھی تب ہی کام کرتا ہے جب SaNode درست کام کر رہا ہو۔ لیکن دوسری طرح

ڈسٹرب ہو چکا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ جسم میں آخری ایک سے پہلے بھی کئی جھونے جھونے ایک حجاب کو ہوتے رہے ہوں گے۔"

"تو کیا چپس میکر وغیرہ بھی ہیپل نہیں دے رہے؟"

"نہیں ہادی! اس خاص کیس میں چپس میکر بھی بہت پیچیدہ کیا پیدا کر رہا ہے۔ چند دن پہلے دوبارہ ایک

جواب دیجیے گا۔

”ہاں پوچھیں۔“

”آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں نا؟“ اس نے اچانک کہا۔

”کتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی تھی اس نے۔ ہادی دم بخود رہ گیا۔ بے ساختہ ہونٹ تھرائے اور ساتھ ہی پورا جسم تھرا گیا لیکن وہ کچھ بول نہ سکا۔“ کیسے ہادی ایسے بات دوستی سے آگے کی ہے نا۔ آپ پیار کرتے ہیں نا مجھ سے؟“

”آپ سے کس نے کہا؟“ وہ جھٹک بولا۔

”آپ نے کہا۔“

”کب کہا؟“

”کئی بار..... جگہ جگہ۔“ وہ عجیب سوئے ہوئے سے انداز میں بولی۔

”میں سمجھا نہیں حب!“

”آپ نے اس وقت کہا ہادی! جب آپ نے جلال کا قرضہ اٹارنے کے لیے ڈاکٹر انکل کے ساتھ مل کر دن رات بھاگ دوڑ کی۔ اپنی چیزیں تک فروخت کیں۔ اور آپ نے اس وقت کہا ہادی! جب آپ پولیس کو لے کر دوس والی ٹوٹی میں گئے۔ خود کو خطرے میں ڈالا اور مجھے وہاں سے نکالا۔ اور اس وقت کہا جب آپ کو پتا چلا کہ جلال قرضہ وصول ہونے کے بعد بھی ابو اور فیصل کو تنگ کر رہا ہے۔ آپ اس کے دفتر میں چلے گئے۔ اسے مجبور کیا کاتھڑوں پر دھکا کرنے کے لیے۔ مجھے عطا انکل نے سب کچھ بتا دیا ہے ہادی! آپ کیا کیا چھپائیں گے۔ آپ نے مجھے اپنے اہل گھر سے گھری یا نہیں؟ جلال کے کارندوں سے چوٹیں کھائی یا نہیں اور پھر جب میں بے ہوش ہو کر روم کے ہسپتال میں آئی تھی آپ مجھے خاموشی سے دیکھنے آئے یا نہیں؟ آپ آنسو لے کر خاموشی سے پاکستان واپس چلے گئے لیکن پاکستان واپس جا کر بھی آپ کی ساری سوچوں کا رخ یہاں ہماری طرف ہی رہا۔ آپ نے سینکڑوں فون کالیں کیں ڈاکٹر انکل کو۔ وہاں بھی آپ ہمارے مسئلوں کے بارے میں ہی سوچتے رہے۔ اب یہاں جو میرا علاج ہو رہا ہے اس کے لیے رقم بھی آپ کی کوششوں سے ہی اکٹھی ہوئی ہے۔ آپ نے ابو کی گجرات والی جگہ فروخت کرائی۔ آپ نے.....“

”پلیز..... پلیز حب! مجھے شرمندہ نہ کریں۔“ ہادی نے اس کی بات کاٹی۔

”میں اور بہت سی باتیں گنوا سکتی ہوں ہادی! چھوٹی چھوٹی، بڑی بڑی بہت سی باتیں۔“ حجاب کی آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھیلنے لگے۔

وہ حجاب سے نظر چرا کر ان آنسوؤں کی حرکت کو دیکھتا رہا۔ چلتے زکے اور پھر چلتے آنسو۔ حجاب کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی۔ ”بولیں ہادی! بتائیں، پیار کرتے ہیں نا مجھ سے۔ پیار کرنے لگے ہیں نا؟“

اس نے ایک طویل سانس لی۔ ہونٹوں پر زبردستی ایک دم مگر اہٹ نکھیری اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولے سے بولا۔ ”ہاں حجاب..... تھوڑا..... تھوڑا.....“

”نہیں..... نہیں۔“ اس نے پورے یقین سے نفی میں سر ہلایا۔ ”تھوڑا نہیں بہت زیادہ کرتے ہیں۔“

زیادہ۔“ وہ سسک پڑی۔ ”بتائیں ایسا ہی ہے نا؟“

ہادی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ دو آنسوؤں نے بستر کی سبز چادر پر گر کر جیسے اثبات میں جواب دیا اور خاموشی سے چادر میں جذب ہو گئے۔

”اور میں نے آپ کو مارا..... آپ کی توہین کی..... بار بار بے عزت کیا۔“

اس نے حجاب کا سر دھاتھ تھا اور بولا۔ ”حجاب! پلیز..... اگر آپ نے ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو میں اٹھ کر چلا جاتا ہوں۔“

اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہادی نے ادھ کھائی کھڑکی میں سے دیکھا۔ عطا انکل آرہے تھے۔ اس نے رومال نکال کر جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ دونوں خاموش ہو گئے۔



اگلے روز دوپہر کے وقت حجاب کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔ وہ اسی طرح کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی جیسے کسی جس کو دھکے خور اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ رنگ زرد ہو گیا۔ طبیعت کی خرابی کے دوران میں ڈاکٹروں کی نيم نے اس کے کچھ ٹیسٹ کیے جن کی رپورٹ بھی ڈیزہ دو دیکھنے بعد آگئی۔ سب کچھ ویسے ہی ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹروں نے کہا تھا۔ اگلے دو چار دن میں ہونے والا بیماری کا دوسرا تیسرا حملہ SCD (اچانک قلبی موت) کا باعث بن سکتا تھا۔

آنسوؤں سے چراگتھوں کے ساتھ ہادی نے بھی ایک دو رپورٹس دیکھیں۔ حجاب کی بیماری کو Arrhythmia کا نام دیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ شدید قسم کے ڈس آرڈر Bradycardias کا شکار ہے۔ جس میں دھڑکن بلاوجہ سست ہو جاتی چلی جاتی ہے۔

اس واقعے کے ایک مہینے بعد ہسپتال میں ہی ایک کمرے میں فیاض صاحب اور ڈاکٹر عطا منتقلو میں معروف ہو کر ملائی کمرے ہسپتال کی بلڈنگ کی آٹھویں منزل پر کمرے کے لوہے کے لیے بنے ہوئے تھے۔ دوسرے شہر سے آئے ہوئے ملے یہاں قیام کر سکتے تھے۔ حجاب کی بڑھتی ہوئی تکلیف کی بات ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر عطا کے فون پر کال آئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ان کا کوئی اسسٹنٹ تھا۔ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! سہ پہر کا اخبار دیکھا ہے آپ نے؟“

”نہیں تو۔“

”یہاں روم میں جلال الدین صاحب سخت مصیبت میں ہیں۔ وہ میلا نو میں ایک پلازہ بنوا رہے تھے۔ اس کا ایک بہت بڑا شیفہ مگر ہے۔ جس کے نیچے آٹھویں منزل پر کمرے ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں۔ ان پر بحرمانہ غفلت کا الزام لگا ہے کیونکہ ایسا ہی چھوٹا سا قمار خانہ وہاں ایک ماہ پہلے بھی ہوا تھا اور اگلے دن اس جگہ خالی انتظام کے لیے سخت وارننگ دی تھی۔“

”او کاڈ۔“ عطا صاحب نے بے ساختہ کہا۔

”جلال الدین صاحب کے خلاف میلا نو میں باقاعدہ ایک جیسٹنگ لگا ہے اور انہیں سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سنا ہے کہ وہ پہلے ہی کسی کیس میں گرفتار ہیں۔“

وہ ایک اور انہونیوں والی رات تھی۔ ہسپتال کی دیواروں سے باہر سرد ہوائیں سرخ رہی تھیں۔ اندر ماحول نیم گرم تھا۔ رات کے دو بجے تھے۔ کمرے میں ہادی و حجاب کے سامنے بیٹھا تھا۔ سر پہر کے بعد اس کی طبیعت پھر سنبھل گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ہلکا پھلکا کھانا کھایا تھا اور اشا بیری جوس پیا تھا۔ حجاب کا ہاتھ ہادی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ حیران ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ ہادی کو دیکھ کر بولی۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہادی! لوگ..... لوگ کیا کہیں گے؟"

"ہم لوگوں کو نہیں بتائیں گے حجاب! ابھی کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ صرف عطا اکل، فیصل اور اکل فیاض کو علم ہوگا۔ یہاں ونس میں اور ہے بھی کون جسے پتا چل سکے۔"

"نہیں ہادی! ابو کیسے مانیں گے۔"

"میں نے کہا ہے نا حجاب! یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ان کو ماننا میرا کام ہے۔ میں ان کے قدموں پر سر رکھ دوں گا۔ مجھ سے جو کچھ ہو گا۔ کروں گا۔"

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "ہادی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ م..... مجھ پر رحم کریں..... مجھے بہت کچھ اندازہ ہے کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کیا آپ ایک..... ایک قبر سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں تو بس یہ....."

اس نے حجاب کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آپ کچھ نہ کہیں حجاب! مجھے پتا ہے میں دیوانوں جیسی باتیں کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے میری دیوانگی کے ساتھ رہنے دیں۔ مجھے آپ کے سر کی قسم ہے۔ حجاب میں آپ سے زندگی میں پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہا ہوں۔ پھر کبھی نہیں۔"

اس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ ہادی نے ایک بار پھر بڑی نرمی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں حب! اب کچھ نہ کہنا..... اگر کچھ کہنا ہے تو پھر ہمیں اسی جگہ اپنے ہاتھوں سے میری جان لے لیں۔"

حجاب نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کے پیر وانی گھٹنوں سے دو موٹی ٹٹلے اور اس کے زرد شفاف زخموں پر چمکتے چمکتے۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان سوئیوں کو زکنا نہیں تھا بہت جلد ان کے وہ چہرے ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے تھے جن کا تعین ڈاکٹروں نے کر دیا تھا اور درست کیا تھا۔

وہ شاعر تھا۔ ایک ایسی کٹی تھلیق کا رہتا تھا اور اکثر تھلیق کاروں کی دنیا اور ہوتی ہے۔ ان کے شب و روز جدا ہوتے ہیں۔ وہ خیالوں اور تصورات میں زندہ رہتے ہیں۔ اور جب ایسے لوگ بچے عشق کے تجربے سے گزرتے ہیں تو اکثر کیا سے کیا کیا ہو جاتے ہیں۔ ہادی کے اندر بھی ایک بے پناہ توانائی پیدا ہو چکی تھی۔ وہی توانائی جس نے جلال جیسے جنگ شخص کو پستول کی صرف ایک جھٹک سے گھٹنوں پر گرا دیا تھا۔ آج بھی توانائی کسی اور صورت میں پھر ہادی کے اندر موجزن تھی۔ آج یہ توانائی اکل فیاض کو ایک ایسے کام کے لیے تیار کر رہی تھی جو وہ ہرگز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن یہ توانائی اپنے اندر منہ زور پانوں کا بہاؤ رکھتی تھی۔ ایک ایسے طوفانی ریلے کی طرح تھی جو بظاہر خاموش ہونے کے باوجود چٹانوں کو اکھاڑتا ہے اور اپنے اندر بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ ہادی کی توانائی نہیں تھی۔ یہ تو عشق کی خدا داد تھی۔

"ہاں گرفتار تو ہے۔"

"بہر حال..... رائیخ خاندان کے تین چار اور بڑوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں جلال الدین کے کوئی پیر صاحب بھی شامل ہیں۔ وہ بھی شراکت دار تھے۔"

اسٹنٹ کی کال سننے کے بعد عطا صاحب نے تھکی تھکی سی سانس لی۔

"کیا ہوا؟" فیاض صاحب نے پوچھا۔

"جج کہتے ہیں فیاض! مصیبت آئی ہے تو جتنا نہیں آتی۔ جلال اپنے اعمال کے نتیجے میں آگیا ہے۔ بہت کچھ ختم ہو رہا ہے اس کا۔" اس کے بعد انہوں نے فیاض کو اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

"میری بیٹی کو بڑا دکھ دیا ہے اس نے۔" فیاض صاحب نے غم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ "ایک سوخا پتہ ہے کہ شاید میں اب کبھی اس کی صورت ہی نہ دیکھ سکوں گا۔"

"میرے خیال میں ہم اس میں ہادی کے کردار کو بھی نہیں بھول سکتے۔ مگر وہ رسک لے کر وہاں درس والی کوشش میں نہ جاتا تو شاید وہیں پر سب کچھ ختم ہو گیا ہوتا۔ اس نے قدم قدم پر ساتھ دیا ہے نا۔"

فیاض صاحب خاموش رہے۔

عطا صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "شروع میں ہمیں یہ غلط فہمی رہی کہ شاید اس کی وجہ سے جلال اور حجاب کے تعلقات مزید بگڑے ہیں۔ لیکن اب گہرائی سے دیکھا جائے تو ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔ تعلقات پہلے ہی بہت زیادہ بگڑ چکے تھے۔ اسی شدید ٹھن سے ٹٹنے کے لیے تو حجاب ونس مٹی تھی پہلی کی شادی پر۔ اب یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ہادی اور حجاب کی پہلی ملاقات وہیں ونس میں ہوئی۔ اور اس کے بعد ڈیڑھ دو ماہ تک وہ صرف اور صرف دوستوں کی طرح ملے۔ ان کے تعلقات میں کسی کجی کا دور دورہ نہ تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے عطا وہ ابھی تک حجاب کو ایک دوست کی حیثیت سے دیکھتا ہے؟"

"نہیں..... یہاں اس معاملے میں پیچیدگی موجود ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ حجاب کو پسند کرنے لگا تھا اور بے حد شدت سے۔ مگر یہ اس کا ظرف ہے کہ اس نے اس بارے میں کبھی ایک لفظ حجاب سے نہیں کہا۔ اس کو شہر تک نہیں ہونے دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی ہرگز یہاں نہ آتا، اگر حجاب اس سے خود آنے کی درخواست نہ کرتی۔ اپنی محبت کے حوالے سے وہ بہت گہرا، بہت زیادہ محتاط ہے۔ اس سارے معاملے میں اس سے بس ایک چھوٹی سی غلطی ہوئی جسے بدخواہوں نے بڑھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہی تصویر والی۔"

"ہاں..... لیکن جلال کے تصور تو اس سے پہلے ہی بہت بگڑ چکے تھے۔ وہ ارم سے شادی کا پکا فیصلہ کر چکا تھا۔"

فیاض صاحب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

اسی دور ان میں فیصل اور ہادی نظر آئے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے انہی کی طرف آرہے تھے۔ فیاض اور عطا صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔

جس منزل تے عشق پہنچایا
مقل نوں خبر نہ کائی

بند کمرے میں انکل فیاض کرسی پر تھے۔ ہادی ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ انکل فیاض کے پاؤں پر تھے۔ ان کے درمیان کافی لمبی بات ہوئی تھی لیکن اب پچھلے تین چار منٹ سے ہادی کی زبان پر بس یہی الفاظ تھے۔ "انکل پلیز..." میرے حال پر رحم کیجیے۔ حجاب کے یہ دو دن ہیں یا تین چار دن ہیں۔ خدا کے لیے مجھے یہ دے دیجیے۔ میں انہیں اپنی پوری زندگی سمجھوں گا۔ اگر یہ دن بڑھ گئے تو یہ قدرت کی طرف سے مجھے انعام ہو گا اور اگر نہ بڑھے تو یہی میری پوری زندگی کی طرح ہوں گے۔"

پریشانی، کشمکش اور تناؤ کے بعد انکل فیاض کے پیچھے سے پر اب نرمی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ وہ انکس پھیلا پھیلا کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر انہوں نے ہادی کے کندھے پر اپنا لرزاں ہاتھ رکھا اور کہا۔ "اس طرح نہ کرو۔ صوفے پر بیٹھو۔ میں حجاب سے بات کر کے ہی کچھ بتا سکتا ہوں۔"

ہادی نے غلوں دل سے ان کا ہاتھ چوما اور اٹھنے کے لیے بولے۔ "انکل! میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میرے دل میں جو کچھ بھی تھا لیکن حجاب نے ہمیشہ مجھے ایک اچھے دوست کی طرح سمجھا۔ اب میں ہی ہوں جو اس دوست کو ایک اور رشتہ دینا چاہ رہا ہوں۔ اگر وہ مان جائیں گی تو اس دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت انسان اور کوئی نہیں ہو گا۔"

○.....○.....○

یہ انہونیوں کے شب و روز تھے۔ سب کچھ انوکھا ہو رہا تھا۔ لمحوں نے اپنی ملائیں سمجھ لی تھیں۔ وقت گزرتا تھا اور وقت کے ساتھ واقعات بھی سمٹ گئے تھے۔ جلدی جلدی وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ آج وغیرہ میں ہادی کی تیسری شہ تھی اور آج وہ وقت اقصیٰ کی دولت کا مالک بن رہا تھا۔ مندرجہ ذیل نے سب کو ایک طلسماتی بہاؤ میں بہا دیا تھا۔ کوئی منتقلی، کوئی دلیل یا وجہ راہ میں حائل نہ ہو پائی تھی۔ عطا انکل نے انڈین سائیکازسٹ ڈاکٹر سرفراز سے بھی آف دی ریکارڈ بات کی تھی۔ انہوں نے اس ہنگامی شادی کے بارے میں کوئی واضح رائے نہیں دی تھی۔ نہ فائدہ مند قرار دیا تھا نہ نقصان دہ۔ ہاں اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر اس قسم کی کوئی تبدیلی بہت پہلے ہوتی تو شاید نفسیاتی طور پر حجاب کو بحال کرنے میں بہت مدد دیتی۔ عطا صاحب نے ڈاکٹر سرفراز سے درخواست کی تھی کہ وہ یہ بات صرف اپنے تک ہی رکھیں گے۔ پی ایچ ڈی ڈاکٹر سرفراز کی باتوں سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ اس قسم کی کوئی جذباتی اسپورٹ (جو حجاب کو طلاق یافتہ کے زمرے سے نکال دے) اس کے لیے بہتری پیدا کر سکتی ہے۔ کم از کم اس کے آخری دن بہتر ہو سکتے ہیں۔

اس رات حجاب کی طبیعت بہتر تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شدید بیمار ہے ہی نہیں۔ ہادی نے یہاں وغیرہ میں انکل فیاض کو راضی کر لیا تھا تو وہاں اپنی والدہ کو راضی کرنا اس کے لیے کون سا مشکل کام تھا۔ وہ اس بارے میں کافی کچھ تو انہیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ بیٹے نے جو غلطی کی ہے، وہ کر کے رہے گا۔ ہادی نے کوئی ایک مہینہ

پہلے فون پر ان کی بات بھی حجاب سے کر دوائی تھی۔

ہسپتال کے اس پرائیویٹ کمرے میں بڑی خاموشی کے ساتھ حجاب سے ہادی کا نکاح ہو گیا۔ عطا انکل، فیصل اور انکل فیاض اس موقع پر موجود تھے۔ ایک طرح وہ سب ایک عبت جبرے ٹرانس میں تھے۔ آنکھیں پٹی تھیں اور دل رقت سے بھرے ہوئے۔ شرعی طور پر اس نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ Divorce کے بعد حجاب کی تین ماہ چار دن کی عدت پوری ہو چکی تھی۔ ایک تیار خاتون سے نکاح کرنا بھی کہیں منع نہیں تھا۔

حجاب کے جسم پر وہی ہسپتال والے سفیدی مائل کپڑے تھے۔ بس اس نے ایک لمبی کاہار شال اوڑھ لی تھی۔ اور ہادی کی محبت بھری، ناقابل مزاحمت ضد کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ وہ جس طرح خود مختل تھا، اس کی ضد بھی مختلف تھی۔ حجاب کا رنگ زردی مائل تھا۔ جیسے وہ شادی کے تین مایوں کے بستر پر بیٹھی ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں ابھی تک ڈریس کے لیے برانولڈ لگی ہوئی تھی اور اسی ہاتھ میں ہادی نے تھوڑی سی مہندی بھی لگا دی تھی۔

گہری خاموشی تھی۔ ہسپتال کے کوریڈور اور کیمریوں میں سناٹا تھا اور اس سناٹے میں جیسے ایک غیر مرئی آواز گونج رہی تھی۔ چھوڑ بائل کا گھر، آج پی کے مگر مجھے جانا پڑا یہ پی کا مگر کون سا تھا۔ شاید وہی مگر جو اس کمرے میں موجود ان گنت میڈیکل رپورٹس پر لکھا ہوا تھا۔ "SCD، اچانک قلبی موت" گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ اس پرائیویٹ وارڈ میں شرف ایک ذیوبی ڈاکٹر "ڈور تھی" تھی جسے ڈاکٹر عطا نے اعتماد میں لے کر اس ساری صورت حال سے آگاہ کر رکھا تھا۔ وہ اس قانون کی شادی پر حیران تھی۔ خوش بھی اور غمزہ بھی۔

رات کا باقی حصہ ہادی کے حجاب کے بستر کے پاس کرسی پر بیٹھے بیٹھے گزار دیا۔ حجاب کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے بہت سی باتیں کہیں۔ حجاب نے کہا۔ "ہادی میری بات کا نہ مانے گا۔ ہمیں حقیقت سے نظر نہیں چھائی چاہیے۔ میں یہاں اس کمرے میں مر رہی ہوں چاہتی۔ کیا کچھ ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں کہیں کھلی فضا میں سانس لے سکوں۔"

"پھر وہی مرنے والی باتیں۔"

"پلیز ہادی! مجھے بتائیں۔" وہ سنی ان کی کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے اس بارے میں عطا انکل سے بات کی تھی۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ آپ کا اس وقت ہسپتال سے نکلنا کسی طرح بھی مناسب نہیں اور نہ اس کی اجازت دی جائے گی۔ ہاں ایک کام ہو سکتا ہے۔ آٹھویں فلور پر کچھ رہائشی کمرے بنے ہوئے ہیں۔ آپ ماحول کی تبدیلی کے لیے عارضی طور پر وہاں جا سکتی ہیں۔ اس کے لیے بھی عطا انکل کو خصوصی پرمیشن حاصل کرنا پڑے گی۔"

"پلیز ہادی! کچھ کریں۔ نہیں تو میں ڈاکٹروں کے ہونے وقت سے پہلے ہی آپ کو خدا حافظ کہہ جاؤں گی۔"

"اور اگر آپ نے ایسی باتیں بند نہ کیں تو میں ابھی پاکستان روانہ ہونے کے لیے ایئر پورٹ پہنچ جاؤں گا۔"

ہادی نے اس کا کان ہولے سے سمجھتے ہوئے کہا۔

اگلا دن گزر گیا۔ ہادی جبریل اس کے پاس رہا۔ پھر انہونی شبوں کے اس دورانیے میں وہ ایک اور انہونی

ری ہیں۔ آپ نے جواب دیا تھا۔ آپ اس کو آخری دن کیوں کہتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج کا پورا دن ہمارے پاس ہے۔ گاہاں کو آدھا خالی کیوں دیکھتے ہیں۔ آدھا بھرا ہوا کیوں نہیں دیکھتے۔

وہ چپ ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لیے دغس کی ہزار ہاروشنیوں کو دیکھنے لگی۔ جیسے خود کو ان جنگلاتی سڑکوں پر رواں دیکھ رہی ہو۔ ہادی نے اسے نرمی سے ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ اس نے اپنا سر ہادی کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ اس کے بالوں کو چوم کر بولا۔ ”کیا سوچنے لگی ہیں؟“

اس نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ”ہادی! آپ کو پتا ہے جب جلال تہہ خانے میں میرے ساتھ سختی کرتا تھا مجھے مارتا تھا، تو کیا کہتا تھا؟“

”کیا؟“

”وہ کہتا تھا تم اپنے اندر کی چنگاری کی بات کیا کرتی تھیں۔ اب بتاؤ کہاں ہے وہ چنگاری؟ میں خود حیران ہوتی تھی کہ جلال کا ظلم سینے سے انکار کرنے والی وہ چنگاری کہاں گئی لیکن اب مجھے پتا چلا ہے کہ وہ چنگاری کہاں تھی؟“

”کہاں تھی؟“

”ہادی نے جواب دیا کہ ساتھ گئے تھے اس کے دل کے مقام پر انگلی رکھی۔ ”ہاں ہادی! وہ چنگاری اڑ کر یہاں آ گئی تھی آپ کے دل میں وہ ختم نہیں ہوئی تھی۔ بس اس نے جگہ بدل لی تھی۔ اور یہی چنگاری تھی جو شعلہ بنی اور جلال کے دھڑ میں تھیں اور اس پر لرزہ طاری کر دیا۔“

ہادی اس کی بات کی حیرانی میں کھو کر رہ گیا۔ نرمی سے اس کے بالوں کو چوم کر بولا۔ ”شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ ایسی چنگاریاں جو ظلم کے نتیجے میں چمکتی ہیں۔ ختم نہیں ہوتیں۔ بس جگہ بدل لیتی ہیں اور کبھی شکل بدل لیتی ہیں۔“

”جگہ کی دوا کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ہادی کی نظر بار بار وال کھاک کی طرف بھی اٹھ رہی تھی۔ وقت ہونے سے صرف ایک لمحہ پہلے روم سرویس سسٹم پر ڈاکٹر ڈور تھی کی کال آ گئی۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ فرانسسی ڈاکٹر ڈور تھی بولی۔ ”آپ کی سڑک ٹھیک ہے مسٹر ہادی؟“

”نہیں ڈاکٹر!“

”ان کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔“

”یاد رہانی کا شکر یہ ڈاکٹر۔“

”اوکے..... گندو شیز.....“ ڈاکٹر نے کہا۔

دوا اور پانی کا گلاس پاس ہی پڑے تھے۔ ہادی نے اس کی طرف جواب کو ہاتھوں میں لیے لیے اسے دوا کھلائی۔

اصرار کر کے تھوڑا سا جوس پلایا۔ اس نے اپنا سر پھر ہادی کے سینے سے ٹکادیا۔ نیم وا آنکھوں سے دغس کی جادوئی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے بولی۔ ”ہادی! مجھے پتا چلتا ہے گا۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے؟“

شب تھی۔ ہادی اور حجاب بلڈنگ کی آٹھویں منزل پر ایک فرنیچر، کشادہ کمرے میں موجود تھے۔ کپسول لپٹ کے ذریعے دوپانچ سیکنڈ میں گراؤنڈ فلور سے اوپر پہنچے تھے، اور اگر خدا نخواستہ کوئی ضرورت پیش آتی تو پانچ سیکنڈ میں ہی نیچے بھی اتر سکتے تھے۔ شادی کے بعد یہ ایک طرح سے ان کی پہلی رات تھی۔ ڈاکٹر ڈور تھی نے سرخ اور سفید گھائیوں کے دو بڑے گلدستے کمرے میں رکھ دیئے تھے اور ان کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکیاں جھلکا کر ہوئے دغس شہر کی طرف تھیں۔ روشنیوں کا ایک تھمکا اور ان روشنیوں کی چمک آبی گزر گاہوں اور نہروں میں متکس ہو رہی تھی۔ ہاں ایسی ہی ایک شب تھی وہ پہلی بار ملے تھے۔

کمرے میں پہنچتے ہی حجاب نے ممکن نظر آنے لگی۔ اس کی سانس بوجھل ہو گئی۔ اس کے سینے سے پہلے ہی ہادی نے کھڑکیاں کھول دیں۔ کمرے میں ٹیپ ٹیپ ٹیپ سا گرجا اے زیادہ کرنے کے لیے ہادی نے جھکنا شروع کیا۔ کمرے کے والے ڈوائس کو ایڈجسٹ کیا۔ وہ دونوں کھل اڑے اور ایک لگا کر بستر پر بیٹھ گئے۔ ہادی نے دغس کا ظلم دیکھا تھا روشنیوں کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ یہ دغس یا کب کب تھیں تھی۔ یہ ”مارکو“ کے دروازے پر تھے اور یہ ریاست کا مشہور ٹی کی روشنیاں، اسی بل کے نزدیک ایک دن حجاب نے ہادی کے کان سے پاس غبارہ پھوڑا تھا اور پھر جس جس جس کر ڈھری ہو گئی تھی۔

ہادی نے حجاب کو اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ جس کے ساتھ ساتھ وہ کھڑکیوں سے باہر بھی جھانک رہا تھا۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ حجاب نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

”ہادی ایسا تو نہیں ہوا کرتا آپ نے یہ سب کیسے کر لیا۔ کس طرح کر لیا یہ سب کچھ۔ سب مان گئے سب بھی مان گئی۔“

”بس ایک جادو ہے میرے پاس۔“

”کیسا جادو؟“

”آپ کی محبت کا جادو۔“

”کیا یہ سب کچھ راز رہ سکے گا؟“

”کیوں نہیں رہے گا۔ ہم چار لوگوں کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں اور جب تک ہم نہیں چاہیں گے۔ ہو گا بھی نہیں۔“

”جب تک کا کیا مطلب؟ دو تین دن کی تو بات ہے ساری۔“

”خبردار.....“ ہادی نے پھر اس کے ہونٹوں کو ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔ ”بطور شوہر میرا آپ کو حکم ہے کہ اس بارے میں بات نہیں کریں گی۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے روم میں جاتے ہوئے کیا کہا تھا؟“

”کیا کہا تھا؟“ وہ اس کے ہاتھ کے نیچے سے ہی بولی۔

”آپ نے کہا تھا، آج ہم آخری دن مل رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا آپ آخری دن کہہ کر میرا خراب کرنا۔“

"اگر کچھ پوچھ رہی ہیں تو نہیں۔ میں اپنا دوسرا آپشن استعمال کرنا چاہتا ہوں۔"
 "کیا مطلب؟" وہ سینے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
 "میں آپ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔"
 "جی؟" وہ کچھ کچھ نہیں۔

ہادی نے اس کی غصہ بھری آنکھوں اور بڑی عبت سے اس کے رخسار کو چوم پھر اس کی غصہ بھری آنکھوں کو پھرناک کو پھر اس تانبہ پیشانی کو (جو ایک چاند کی طرح اس سے ہزار ہا میل کے فاصلے پر رہی تھی) پھر اس کے نازک ہونٹوں کو شاید یہ واقعی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ حجاب کو چھوئے بغیر بھی ان کا عشق مکمل تھا، لیکن اب یہ عشق کاملیت کی معراج کو چھو رہا تھا۔

وہ ایک جادوئی شب تھی۔ ہادی خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا تھا۔ وہ حجاب کو بس اسی طرح اپنی بانہوں میں سیٹھ بیٹھا رہا۔ اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ تب وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر گئی۔ ہادی نے مدھم مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہاں ایک سکون بھری مسکان تھی۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ ہادی نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔ پھر وہ بھی سو گیا۔

صبح دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ اسی طرح اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ ایک دم وہ بڑی طرح چونک گیا۔ اس نے اسے بلایا۔ "حب....."

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہو لے سے بولی۔ "نہیں..... ابھی کچھ نہیں ہوا۔"

ہادی کے سارے بدن پر چیونٹیاں سی رہ گئیں گئی تھیں۔

وہ کچھ دیر بعد سرگوشی میں بولی۔ "آپ کو پتا ہے، آج کیا ہے؟"

"کیا ہے؟"

"ابو کی برتھ ڈے ہے۔ ان کو بتائیے گا نہیں۔ شام کو ایک چھوٹا سا ٹیکہ لے آئیے گا اور کوئی تحفہ بھی۔ میں ابھی سوچ کر بتاؤں گی۔"

"ایز یو لائیک۔" ہادی نے اپنی آنکھوں سے اس کے بالوں میں گتھی کی۔

سارا دن انہوں نے نیچے ہسپتال کے گراؤنڈ فلور پر ہی گزارا۔ حجاب کے دو تین میٹ بھی ہوئے جن میں انکو گرائی بھی شامل تھی۔

شام کے بعد وہ ایک بار پھر آنکھوں فلور کے رہائشی پارٹمنٹ میں موجود تھے۔ بعد میں فیصل، ڈاکٹر عطا اور فیاض صاحب بھی وہیں آ گئے۔ فیاض صاحب نے حجاب کے ساتھ مل کر ٹیکہ لگا دیا۔ حجاب اور فیصل نے انہیں تحفے دیئے۔ حجاب کا تحفہ ایک خوبصورت سی رستہ و اج تھی، چڑے کے بہت نرم اسٹریپ والی۔ فیاض صاحب نے رستہ و اج کو چوم پھر حجاب کو اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر اپنی غصہ بھری رکھ دی۔ وہ آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ بڑی خوشگوار رات تھی۔ حجاب کی طبیعت بھی بہت اچھی تھی۔ وہ سب کمرے میں ہی موجود رہے اور رات آخری پہر تک باتیں کرتے رہے۔ حجاب چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں جیسے کھوی گئی۔ اس نے سیل فون پر روم میں اپنی امی سے بھی طویل بات کی۔ انہیں اپنی خیریت اور تندرستی کے بارے میں بتایا۔ وہ خود چراغ کی طرح ٹنٹا رہی تھی مگر اس حالت میں بھی اسے اپنی امی کی صحت کی غیر معمولی فکر تھی۔ وہ انہیں کھانے پینے کے ٹپس دے رہی تھی اور پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی بھابی یعنی فیصل کی بیوی سے بھی بات کی اور اسے اپنے حوالے سے تسلی دی۔ امی سے بات ختم کرتے ہوئے اس نے فون پر انہیں الوداعی بوسہ دیا اور اس کی آنکھوں میں ایک مسرت آمیز طمانیت کر دیکھیں لینے لگی۔

اور یہ اگلی شب تھی۔ شام کو غصہ بھری شب تھی۔ بہر حال دوا انجکشنز لگنے کے بعد پھر بہتر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں آنکھوں فلور کے اسی کمرے میں موجود تھے جہاں جھگڑا دھڑک رہی ساری رعنائیوں اور یادوں کے ساتھ لڑنے کے قریب تر آ جاتا تھا اور وہ اس میں کھو جاتے تھے۔ وہی پرسوں والا منظر تھا۔ حجاب کے کہنے سے پہلے ہی ہادی نے باہر کی طرف کی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ وہ دونوں کھلے بستر پر نیم دراز تھے۔ ہادی نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلایا تھا۔ اس کے بالوں میں گتھی کی تھی۔ اس کے ناخن تراشے تھے اور اس کی مہندی والی پٹلی کو بھی لگایا تھا۔

جب وہ اس کی پٹلی کو اپنی آنکھوں سے سہارا رہا تھا۔ حجاب نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ "میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔"

"شکریہ۔"

"لیکن بہت دیر کر دی میں نے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ جلدی سے بات بدل کر بولی۔ "یہ بات مجھے کل رات ہی کہہ دینی چاہیے تھی۔ کتنی پیاری چاندنی تھی۔ آج تو ہلکے بادل ہیں۔"

ہادی نے اسے دیر انداز کر دیکھا۔ وہ تازہ ٹیکہ سے کے سفید گھاؤں پر ابھی بھیرنے لگی۔ کمرے میں گاہیوں کی خوشبو جیسے بس گئی تھی۔ ہر شے بہت سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت باتیں۔ جنہیں سن کر آنکھوں میں ٹپکیاں کھلتی تھیں اور جنہیں کہہ کر اپنے ہونٹوں پر ہی پیار آنے لگتا تھا۔

رات آگے کو سرگوشی رہی۔ ہادی نے اسے یاد دلائی کہ اس کی روشن پیشانی پر طویل بوسہ دیا۔ اس نے اپنا ہچکا ہونٹ آہستہ سے دانتوں میں دبایا اور باہر کی طرف دیکھنے ہوئے بولی۔ "کیا کریں گے میرے بعد؟"

ہادی کے دل پر گھونسا سا لگا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "میں شاید کبھی شادی نہیں کروں گا۔ بس دیکھیں اور روم کی ان گلیوں میں گھومنا کروں گا۔ ایسے شہر گلیوں کا جو دل والوں کو تڑپا دیں گے۔ لیکن اگر یہ ہوا بھی تو پتا ہے کب ہوگا؟"

"کب ہوگا؟"

”جب آپ پینٹھ سال سے اوپر کی ہو جائیں گی اور میں ستر بہتر کا ہوں گا۔ ہمارے بہت سے بچے ہوں گے۔۔۔۔۔ اور ان کے بچے بھی۔“

”واقعی؟“ اس نے ہادی کے سینے میں جذب ہوتے ہوئے کہا۔

”واقعی۔“ ہادی نے جواب دیا۔

لیکن۔۔۔۔۔ وہ اسی رات مر گئی۔۔۔۔۔ دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے عین مطابق۔ بس اس میں گھنٹوں کا فرق ہی پڑا ہو گا۔ رات کے دو بجے تھے جب ہادی کی بانہوں میں چپے چپے اور اس کے سینے سے لگے گئے اس کی سانس بوجھل ہونے لگی۔

”گھڑکیاں کھول دیں ہادی۔“ وہ نسمانی

”گھڑکیاں کھلی ہیں حب!“

”نہیں۔۔۔۔۔ ساری کھول دیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”ساری کھلی ہیں حب!“

اس نے تصدیق کے لیے ہادی کے سینے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ مگر پینٹھ سال سے گھڑکیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ نہ وہیں نظر آ رہا تھا۔ نہ اس کی نہریں اور سڑکیں جن پر ماضی کی ایک سہانی شب کی یادیں گھڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو جیسے ایک تاریک چھوٹ کوئی دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر دور تھی کی ہدایت کے عین مطابق ہادی نے کان بچل کا سرخ بن بٹا دیا۔ ایک منٹ کے اندر اندر ہسپتال کا چاق و چوبند عملہ پورٹ اسبل بیڈ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہادی کے سینے سے لگے لگے ہوئی۔ ”ہادی مجھے کہیں نہ بھیجیں۔ مجھے یہیں رکھیں۔ بس ابو کو یہاں بلا لیں۔“

”وہ بھی آجاتے ہیں حب! ابھی ہمیں نیچے جانا ہے۔“

اس نے خود کو بمشکل حجاب سے علیحدہ کیا۔ عملہ اس کے بیڈ کو تیز رفتار رفت کی طرف دوڑاتا چلا گیا۔

چند منٹ بعد جب اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی اور اسے انتہائی نگہداشت یونٹ میں لے جایا جا رہا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ہادی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس کے ابو کا ہاتھ تھا۔ وہ جیسے ان دونوں ہاتھوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ انہیں آخر تک چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ شاید دنیا کی ہر حجاب کے لیے یہ دونوں ہاتھ اہم ترین ہوتے ہیں۔

جب وہیں کی سہانی شب ختم ہو رہی تھی۔ وہیں کی لڑکی بھی ختم ہو گئی۔ اس نے اپنا تازک چہرہ ہسپتال کی ہنگی سبز چادر میں ڈھانپ لیا۔ ہادی نے دھڑکنے لگا کر روتے ہوئے انکل فیاض کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور انہیں سہارا دیتا ہوا ہسپتال کے سی سی یو سے دور لے آیا۔ ”نہیں انکل۔۔۔۔۔ نہیں انکل۔“ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

○.....○

حجاب کی موت پر ہادی نے بس چند آنسو ہی بہائے تھے۔ لیکن ہادی آنسو کہاں سے؟ وہ بیکراں پانی۔ وہ سمندر؟ وہ دل میں تھا، غمبھرا ہوا تھا لیکن تہہ میں طوفانی لہاں تھی۔ ہادی نے روم میں حجاب کی آخری رسومات میں جڑی

خاموشی سے شرکت کی۔ اس کی میت کو کندھا بھی دیا، اس کی قبر پر مٹی بھی ڈالی، اس کے لیے دعا کے واسطے ہاتھ بھی اٹھائے۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اس مرنے والی سے اس کا کتنا قریبی رشتہ ہے۔ یہ بات ایک راز تھی اور ہمیشہ رازی رہنا تھا۔

وہ واپسی سے پہلے خالہ صوفیہ سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن وہ کسی دوسرے عزیز کے گھر میں تھیں۔ انہیں ان سارے دلچسپ معاملات سے فی الحال بالکل بے خبر رکھا گیا تھا۔

روم چھوڑنے سے دو دن پہلے ہادی رات کے وقت اکیلا ہوٹل سے نکلا اور اس مسلم قبرستان میں پہنچا جہاں وہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ اسے لگا کہ یہ اس کی ایسی شریک حیات کی قبر ہے جو برسوں اس کے ساتھ رہی ہے۔ وہ اس کی قبر کے پاس دوڑا نو بیٹھ گیا۔

یہ عشق نہیں آساں۔۔۔۔۔ اس کے دل کے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ نیم تار کی تھی اور خاموشی تھی۔ دل میں غم ابھرا پانی حرکت کرنے لگا۔ اچھال میں آ گیا۔ وہ اس کی قبر پر رو یا اور ایسا رو یا کہ دل میں کوئی حسرت نہ رہی۔ نہ جانے یہ کتنا دورانیہ تھا۔ ایک گھنٹہ دو گھنٹے یا اس سے زیادہ۔

”نہیں مجھے جھکنا کریں گے؟“ حجاب کی آواز کانوں میں گونجی۔

”شاید کبھی شادی نہیں کروں گا۔ بس وہیں اور روم کی ان گلیوں میں ہی گھوما کروں گا اور ایسے شعر لکھوں گا جو دل والوں کو تڑپا دیں۔“

”نام ختم ہوا جناب! قبرستان کے مسلمان اطالوی چوکیدار کی پات دار آواز آئی۔“

وہ اس کی قبر پر الوداعی نظر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتا گیا۔۔۔۔۔ چلتا چلا گیا۔ وہ سب کچھ جیسے ایک خیال کی طرح تھا۔ ارد گرد درد کے زرد غبار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ ہوٹل پہنچا۔ اس نے ہوٹل چھوڑا۔ اسٹیشن پر آیا۔ یہاں تک کہ ایک دھندلاہٹ میں چھپا ہوا تھا۔

اگلے روز اس نے خود کو گرین میں پایا۔ وہ وہیں جا رہا تھا۔ آرام دہ نشست پر دروازہ کھڑکی سے لگے لگے، وہ دھمکنے لگا۔ نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں اس کا تصور ایک بار پھر حجاب کو اس کے سامنے لے آیا۔ اس نے ہنگیلا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ ”آپ ڈکھی نہ ہوں۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے اور آخر میں میری موت کو بھی ایک سنہری سوز دیا ہے۔ آپ مجھے گھمبھرا ہوا میں اسی صحنہ میں سر جاتی۔ بغیر روشنی دیکھے، بغیر کھلی ہوا میں مانس لیے، بغیر اپنے پیاروں سے ملے۔ تو مجھے چاہیے میری روح کب تک بھٹکتی رہتی۔ اب یہ سب نہیں ہوا اور وہ ہوا ہے جس کی میں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ میں نے ان تین باتوں میں تین زندگیاں جی لی ہیں ہادی! میں خوش ہوں۔ آپ بھی آنسو پونچھ لیں۔“ پھر اس نے گلابی آنچل آگے بڑھا دیا، اسے ہاتھ سے ہادی کے آنسو پونچھ دیئے۔ اس کے آنچل میں سرخ و سفید گلابوں کی مہک تھی۔ پھر وہ اوچھل ہوئی۔

وہ جیسے چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ گاڑی اپنی رفتار سے جاری تھی۔ اسے اپنے ارد گرد واقعی سرخ و سفید گلابوں کی مہک محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے سینے میں غم کے شعلوں کو قدرے دھیمسا محسوس کیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہاں۔ اگر واقعی وہ اس جسم میں گھٹ گھٹ کر مر جاتی تو یہ سانچہ مزید کتنا اندوہناک ہو جاتا۔

اس رات وہ دوش میں اتر اور جانے پہچانے راستوں پر چلنے لگا۔ دوش کی نہروں میں آبی بسیں رواں تھیں۔ آبی نیکیوں میں خوش و خرم جوڑے قہقہے بکھیر رہے تھے۔ وہ چلتا چلتا اسی سڑک پر پہنچ گیا جہاں تاج سے ہلکی بارش آ رہی تھی۔ یہ وہی سڑک تھی، وہی موڑ تھا۔ سامنے ہی وہ ریستوران نظر آ رہا تھا اور وہ چھتری بھی جو تاج نے اٹھائی گیرے کے راستے میں گرائی تھی اور اس موڑ کے پاس ہی آبی گزرگاہ کا پانی چمک رہا تھا یہ سمندر کا حصہ تھا اور اس لحاظ سے سمندر ہی تھا۔ کناروں پر روشنیوں کے جڑواں جگنو اطالوی موسیقی کی لہروں پر رقعات تھے چند اچھی چیزیں لکھنے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی۔ اس سے لایا وہ گدازدل میں کہاں پیدا ہو سکتا تھا۔ اس نے پارک کا قلم اور نوٹ بک نکال لی۔ ورد روشانی کی طرح تھا۔ لیکن جب روشانی ضرورت سے زیادہ ہو تو لفظ پہلے نکلتے ہیں اس نے ذرا انتظار کرنا مناسب سمجھا اور نئی چیز لکھنے سے پہلے ایک پوائنٹ پر پڑھنے لگا۔ تاج اور اس کے سارے حالات اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

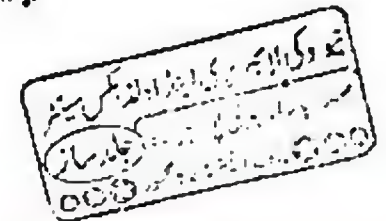
”اور تم جانتے ہو کہ سا بیان کا کون تھا۔ کا سا بیان کا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ وہ بحری جہاز کے فیسر کا لخت جگر تھا اور جب کھلے دیران پانیوں میں انگریزوں نے حملہ کیا، جب جہاز کو گم ہوئی اور ہر طرف تہلکہ مچا، لشکریوں کی آہ و بکا سے عرشے ریز نے گئے تو باپ نے کا سا بیان کا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا: ”کا سا بیان کھڑے رہنا، جب تک میں نہ کہوں۔“

اور وہ کہہ کر چلا گیا اور وہ بارود کی بارش میں موت کا شکار ہوا اور بیٹا، باپ کے حکم پر اسی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے گرد موت نے اپنے گھر سے تنگ کیے لیکن وہ ہلا نہیں۔ وہ کیسے ہلتا؟ ابھی اس کے باپ کا حکم نہیں تھا۔ اور وہ اسی جگہ کھڑا کھڑا مر گیا اور وہ اطاعت کی لازوال مثال تھا۔

میں نے کا سا بیان کا کو نہیں دیکھا لیکن میں نے روم کی روشنیوں میں چمکتی دھتی ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ بھی اپنے باپ کے حکم پر ایک جلتی ہوئی چار دیواری میں کھڑی رہی۔ اس کے نازک پاؤں جل گئے۔ اس کا کول بدن جھلس گیا۔ وہ درد سے کراہتی رہی۔ اور کراہتی رہی۔

”ہاں۔۔۔ میں نے کا سا بیان کا کو نہیں دیکھا لیکن روم کی اس لڑکی کو دیکھا ہے۔“

❖ ختم شد ❖



محترمہ فریدہ اشفاق کے قلم سے ایک حسین شاہکار

کست شب

قیمت 750

خواتین کا مقبول ترین ناول

☆ نازک جذبول اور احساسات کی کہانی۔

☆ اس لڑکی کا قصہ۔۔۔ جو ٹھکرائے جانے کا عذاب لئے زندہ تھی۔

☆ تقدیر اور تدبیر کے سنگم پر جنم لینے والی ایک حسین اور دل گداز داستان۔

☆ حسین خوابوں کی کرچیاں اس کے وجود کو چھلنی کرنے لگیں۔

☆ بساط وقت پر کھیلی جانے والی اس بازی میں کس کی جیت ہوئی۔

بہترین کاغذ، خوبصورت پرنٹنگ

اپنے ہا کر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

علی بکسٹال

بکسٹال

علی میراں

بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

۳۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7247414